گیارہ سفر

سیاحتِ ماجدی

از
حضرت مولانا عبد الماجد دریابادی

ترتیب
حکیم عبد القوی دریابادی

فہرست

عرضِ مُرتب

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ مرحوم نے اپنی دو کتابوں سفرِ حجاز اور ڈھائی ہفتہ پاکستان میں کے ذریعہ اردو کے سیاحتی ادب میں بیش بہا اضافہ فرمایا تھا۔ یہ دونوں ان کی زندگی میں شائع ہوکر بہت مقبول ہوئی تھیں۔ اول الذکر کے تو تین اڈیشن یکے بادیگرے نکلے تھے۔ اول الذکر سفرنامہ پہلے قسط وار ہفتہ وار سچ لکھنؤ۔ اور دوسرا اسی طرح صدق جدید لکھنؤ میں چھپا تھا۔ دونوں دیباچہ اور متن و ضمیموں کے اضافہ کے ساتھ کتابی شکل میں شائع ہوئے تھے۔

مولانا اپنی انتہائی مشغول علمی زندگی اور طبعی عزلت گزینی کے باعث سفر بہت کم کرتے تھے۔ کانفرنسوں اور پبلک تقریبات میں شرکت مدتوں قبل تقریباً ترک کر چکے تھے۔ بایں ہمہ انھوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں اور دیکبار پاکستان میں شامل لاہور کا سفر کیا اور ان کی تفصیلی روداد ان کے قلم سے صدق جدید میں نکلتی رہی تھی زیرِنظر مجموعہ میں ان کے اس قسم کے گیارہ سفر درج ہیں۔ ترتیب میں سنہ کے بجائے شہروں کے حروف تہجی کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان میں طویل ترین روداد سفر لاہور کے سفر کی ہے۔ جس کے ساتھ علیحدہ عنوان کے تحت مذاکرہ اسلامیہ لاہور (جس میں شرکت کے لیے مولانا نے سفر کیا تھا) کی روداد بھی ملحق ہے۔ سفر حیدرآباد بھی خاصا

طویل ہے۔ اور اسے کتابی شکل میں تاثرات دکن کے نام سے کراچی کی بہادر یار جنگ اکاڈمی
دیباچے، حواشی اور بعض تصاویر کے اضافہ کے ساتھ کچھ عرصہ قبل شائع کر چکی تھی، اس کے بعض
حواشی جو احمد خاں صاحب حیدر آبادی کے تحریر کردہ ہیں اس کتاب میں بھی شامل کر لیے گئے
ہیں، بہار اور مدراس کے دو دو سفر ہیں بقیہ مقامات کے سفر ایک ایک بار ہوئے تھے حیدر آباد
و مدراس دونوں سفروں کے ضمن میں بھوپال بھی تھوڑی مدت کے لیے قیام رہا تھا اور سفر کلکتہ
کے ضمن میں چند گھنٹے جھاجھا (بہار) بھی اترنا ہوا تھا۔ مدراس کے پہلے سفر سے واپسی
میں کرنول اور حیدر آباد میں بھی مختصر قیام کی نوبت آئی تھی۔

مولانا کی اکثر کتابوں کی طرح اس مجموعہ کے بھی دو نام "گیارہ سفر۔ سیاحتِ ماجدی"
رکھے گئے ہیں۔

یہ سیاحتی نقوش قلم، پر معلومات پر موعظت ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی خوبیوں و لطافتوں
سے بھی بھر پور ہیں اور ان کے بعض ٹکڑے تو انشائے ماجدی کے شاہ کار کی حیثیت رکھتے
ہیں، ان کے علاوہ سچ، صدق، اور صدق جدید کے شذرات میں بھی مولانا کے مختلف سفروں کی مختصر
روداد ملتی رہی ہے۔ ان سب کو اگر اس مجموعہ میں شامل کیا جاتا تو غالباً انکی میزان سو سے بھی تجاوز کر جاتی

ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ کے صاحب حوصلہ ناظم جناب حاجی منظور علی
لکھنوی اس سے قبل مولانا مرحوم کی دو کتابیں خطباتِ ماجد یا ہدیہ زوجین اور معاصرین
کتابت و طباعت کے اعلیٰ اہتمام کے ساتھ شائع کر کے اہل نظر سے خراج تحسین
حاصل کر چکے ہیں، یہ تیسری کتاب بھی اسی شان و اہتمام کے ساتھ شائع کر رہے ہیں

اور اس کے بعد بھی مولانا دریابادیؒ کے متعدد افادات قلم کی اشاعت ان کے اشاعتی پروگرام میں شامل ہے۔

ان سطور کی تحریر کے وقت بے ساختہ اپنے مرحوم دوست و ہم وطن اور مولانا دریابادیؒ مرحوم کے انتہائی معتقد اور ان کی تحریروں کے عاشق زار و پرستار محمد صدیق دریابادی مرحوم کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ انھیں کی تحریک پر یہ ادارہ انشائے ماجدی عالم وجود میں آیا تھا اور پہلی کتاب خطبات ماجد انھوں نے مرتب کر کے شائع کرائی تھی۔ قبل اس کے کہ کسی دوسری کتاب کی ترتیب عمل میں آتی ایک مختصر علالت کے بعد وہ راہیٔ سفر آخرت ہو گئے۔ ناظرین کرام ان کی مغفرت کی دعا فرمائیں۔

مرتب

حکیم عبد القوی دریابادی
(اڈیٹر صدق جدید لکھنؤ)
۲۲ جنوری ۱۹۸۰ء

بمبئی

۸

چار دن بمبئی میں"

سفر اور پھر لمبے سفر کی عادت اب ایسی چھوٹ سی گئی ہے کہ جب کبھی ایسا اتفاق پیش آہی جاتا ہے تو سب سے بڑھ حیرت تو اپنے ہی کو ہوتی ہے۔

غیر کیا خود مجھے حیرت مرے اسفار پہ ہے

اخیر ہفتہ اپریل میں اسی طرح کا اتفاق پیش آ کر رہا۔

ادارۂ دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے نام نامی سے اب مسلمان پڑھے لکھوں میں کون ناواقف ہوگا؟ مولانا شبلی نعمانی کے دماغ کی پیداوار مولانا سید سلیمان ندوی کی ساری عمر کی علمی کاوشوں کی یادگار مسلم ثقافت کے چمن کی بہار، ظاہری و معنوی دونوں حیثیتوں سے مسلّم و شاندار۔ ۱۹۱۵ء (بلکہ شاید ۱۹۱۴ء) میں بنیادی ممبروں کی جو کمیٹی بنی تھی اس میں زندہ و باقی اب صرف یہی بدنام کنندہ نکونامے چند رہ گیا ہے اور پھر اس کے ارکان عاملہ کی جو ننھی منی مجلس ہے اس کی صدارت کی تہمت بھی اس بے علم کے سر سالہاسال سے چلی آرہی ہے۔ اس ادارہ کی مالی حالت برسوں سے جو زبوں و سقیم چلی آرہی ہے اس کی داستان خود مستقل دردناک ہے۔ ہندوستان میں ہر اردو ادارہ پر جو وقت پڑا ہے اور جو کچھ بیت رہی ہے اس کا حال سب پر ظاہر ہے۔ پھر پاکستان سے خریداری کا دروازہ سرے سے بند جہاں دیدہ دخوش تدبیر

مولوی مسعود علی ندوی منیجر کی پہلے تو معذوری اور پھر وفات، اور سرکاری سطح پر جو لیس پوت کرنے والے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سید محمود ان دونوں کا بھی رخصت ہوجانا وغیرہ وغیرہ۔ غرض اسباب متعدد ومختلف کی بنا پر حالت اب یہ ہوگئی ہے کہ ماہانہ مشاہرے اور مطالبے بل کے ادا ہونے دشوار ہوگئے اور ریزرو فنڈ تک جواب دے گیا۔

رائے بالآخر یہ ٹھہری کہ جلسۂ انتظامیہ ابکی بمبئی میں کیجئے اور اس عروس البلاد کے جواہل خیر ہیں ان کی قدر دانی اور فیض وکرم کا تماشا دیکھئے مجلس انتظامیہ کے آخر دو ممبر بمبئی والے ہی ہیں۔ ایک علامہ سلیمانؒ کے ہم وطن وعزیز شہاب الدین دیسنوی (میری زبان میں شہاب ثاقب) پرنسپل صابو صدیق پالی ٹکنک بمبئی اور دوسرے علامہ شبلی کے وطن اور برادری کے عبدالعزیز انصاری اعظم گڑھی اور بمبئی کے ایک بڑے تاجر۔ شہاب صاحب کو سن گن ملی تو انھوں نے بمبئی کے مشہور انجمن اسلام کا تار بھی اس سے جوڑ دیا کہ "بیک کرشمہ دو کار" کی مثل صادق آجائے اور انصاری صاحب نے میزبانی کا دسترخوان بچھا دیا۔ پبلک اجتماع ۲۸،۲۹ اپریل کے سہ پہر کے لیے طے پاگیا اور ۳۰ کو قبل دوپہر یہ شہاب صاحب آدمی بڑے کارگزار ہیں اور ہر طبقہ میں صاحب رسوخ اُدھر آرٹ نوازوں میں شامل اِدھر ہم دقیانوسیوں سے واصل۔

با ما شراب خوردہ و بزاہد نماز کرد

کو اپنا دستور العمل بنائے ہوئے میرے لیے مقالہ کا عنوان لکھ بھیجا۔
"تفسیر قرآن کے جدید تقاضے" اور رفیق محترم علی میاں کے لئے سرخی ٹھہرادی
"ہندوستانی سماج پر مسلمانوں کا اثر" پر کوئی تقریر، ناظم دار المصنفین
(شاہ معین الدین ندوی) اور نائب ناظم (سید صباح الدین عبدالرحمان
دیسنوی) کے بھی مقالوں کے کچھ تاریخی عنوان طے پا گئے۔

لکھنؤ سے بمبئی کا سفر ۲۸، ۲۹ گھنٹہ کا وقت لیتا ہے اور دہلی سے
جو پنجاب بمبئی میل چلتا ہے اس میں لکھنؤ سے چلنے والے جھانسی میل کی دو تین
بوگیاں کاٹ کر لگا دی جاتی ہیں۔ دریا آباد سے روانگی ۲۵ر اپریل کو نا گزیر
تھی۔ ۲۶ر کی صبح کو لکھنؤ سے چلی، ۲۷ر کی دوپہر کو بمبئی پہونچنا ہوگیا، بمبئی پہونچ
گیا کہتے یا لکھنے میں چند سکنڈ بھی نہیں صرف ہوئے لیکن دل سے پوچھیے کہ اس
پر کیا کیا گزر کر رہی اور کتنی منزلیں اسے طے کرنا پڑ گئیں! بمبئی کے مناقب
و فضائل آج سے کوئی ۶۵ سال قبل، مولانا شبلی کی زبان سنا کرتا تھا۔
اور ان کے ہر سال سفر بمبئی (سکنڈ کلاس کی ایک برتھ مخصوص کرا کر) کو رشک
و شوق سے دیکھتا اور للچاتا رہ جاتا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں آج سے پورے ساٹھ سال
قبل پہلی بار اپنا بمبئی آنا ہوا تھا۔ والد صاحب مرحوم حج کو ایک پورے قافلہ
کے ساتھ جا رہے تھے انھیں پہونچانے بمبئی گیا تھا، حاجی صابو صدیق کا مشہور

مسافرخانہ حجاج اسی سال تعمیر ہو رہا تھا۔ اس عالیشان اور آرام دہ عمارت کا کیا کہنا، اپنی عمر کا بیسواں سال تھا اور اسی سال بی اے کیا تھا، ایم اے کے لیے علی گڑھ جانے کی فکر میں تھا، حج و زیارت سے اس وقت کیا واسطہ تھا عقیدہ بھی اسلام سے کہیں بڑھ کر الحاد اور ریشنلزم (عقلیت) کا تھا، محض بمبئی دیکھنے کا شوق تھا جو والد مرحوم کے ہمراہ چلا آیا تھا جہاز چھوٹنے میں ابھی کئی دن کی دیر تھی) انگریزی کتابوں کی دوکانیں گھوم پھر کر اپنا ارمان نکالتا رہا۔ ایک بار پھر کبھی مولانا محمد علی سے ملنے آیا تھا۔ پھر آخری سفر خود اپنے سفر حج کی آمد و رفت کے سلسلہ میں دو بار ہوا تھا۔ خلافت ہاؤس میں ٹھہرنا ہوا تھا۔ مارچ اور مئی ۱۹۲۹ء میں۔ یہ نیا پھر اگویا ۴۲، ۴۳ سال کے بعد ہوا ان دو پشتوں کے اس وقفہ میں دنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی، آنکھ کان کی مادی دنیا بھی اور دل و دماغ کی معنوی دنیا بھی!

اور بمبئی پہونچنے میں تو ابھی دیر تھی۔ درمیان کے بڑے اور چھوٹے اسٹیشنوں پر کیا کیا گذری اور دل کن کن خیالات میں ڈوبا رہا منماڑ جب پہلی بار حیدرآباد جانا ہوا تھا، ۱۹۱۰ء میں تو اسی راستہ سے گیا تھا (اس وقت تک یہی ایک راستہ تھا) اور ۱۹۱۸ء میں واپسی بھی اسی راستہ سے ہوئی تھی۔ نظام حیدرآباد کی عملداری اس سے کچھ ہی دور شروع ہو جاتی تھی اور انگریزی اور مغلئی حکومتوں کا امتزاج ایک عجیب بہار دکھاتا تھا، نظام کی حکومت

یقیناً اسلامی" نہ تھی پھر بھی ثقافت اسلامی اور تہذیب اسلامی کی بہت کچھ بوباس اپنے اندر رکھتی تھی اور چند ہی اسٹیشن کے بعد اورنگ آباد دکن، بابائے اردو عبدالحق کے دم سے ایک عجیب کشش ہر اُردو والے کے لئے رکھتا تھا۔ اور بھوپال اسٹیشن کی جاذبیت تو کچھ پوچھئے ہی نہیں ملّی و ذاتی دونوں قسم کی یادوں نے کیسا کیسا ہجوم کیا، بیگمات بھوپال اور آخری نواب اور صدیق حسن خاں قنوجی اور امین زبیری اور مسعود جنگ اور سر لیاقت علی اور شعیب قریشی اور سلیمان ندوی اور "مائی لارڈ" حیات (علیگ) کے اسلامی تقاضوں نے اس زمین کو کس کس طرح رشک آسمان بنا کر رکھا —— اور شاہ یعقوب مجددیؒ کے دم سے زندہ دلوں کا مرکز ابھی کل تک یہی شہر بنا ہوا تھا — اور تاج المساجد آج بھی اس کا نام دنیائے اسلام میں اونچا کیے ہوئے ہے کا ہوز اور جھانسی دو جنکشن ذاتی حیثیت سے ایسے کہ ان خوشگوار یادوں کو یاد رکھنا مشکل ہے۔ شہر باندہ ان دونوں راستوں سے پہنچا جا سکتا ہے جہاں ایک گوشہ میں ایک قبر ۱۵۔۲۰۵ سال کی رفاقت کے بعد ایک مرجع شوق و مرکز آرزو بنی ہوئی ہے۔ ایک سراپا عفت، قلب غفلت میں اب بھی بیداری کی کچھ جھلک پیدا کر دیتی ہے۔

۲۷ر کی دوپہر کو بمبئی پہونچنا ہوا اور الحمدللہ کہ اسٹیشن پر میرے مخلصین کا مختصر سا مجمع تھا اور جلوس وغیرہ کے جھمیلے سے نجات مل گئی

بات صرف پھولوں کے چند ہار تک محدود رہی اتنے بڑے سفر کے بعد غسل تو واجبات میں ہوتا ہے۔ اصل مقالہ پر نظر ثانی کا وقت نہیں نکل سکا تھا ۲۵،۲۶ صفحہ کا صاف شدہ مسودہ تھا اور اپنی آنکھ کی روز افزوں کمزوری کے باعث اس کا خود سے سنانا بھی ممکن نہیں تھا، رفیق محترم علی میاں نے ایک ندوی عزیز کو پڑھنے کے لیے تیار کر دیا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کا وقت صرف کرکے اسے درست کیا اور پھر ان صاحب کو پڑھوا دیا۔ لوگوں سے ملنا جلنا بہرحال ہونا ہی تھا۔ لیکن الحمد اللہ میربان اور دوسرے مخلصوں نے اس "مردم بیزار" کے شیوۂ مردم بیزاری کا پورا لحاظ رکھا اور زیادہ مجمع کسی صورت میں نہ ہونے دیا۔ حیدرآباد سے مخلص قدیم حاجی بہاء الدین بے بہا چل کر اور رخصت لے کر آگئے تھے ہر وقت کی خدمت اور دیکھ بھال انھیں کے ہاتھ میں رہی۔

حسن اتفاق سے پرانے حامی سعید انصاری اعظم گڑھی سے اسٹیشن ہی پر ملاقات ہوئی اور چار دن تک برابر ساتھ رہا۔ ہماری مجلس انتظامیہ کے یہ بھی ممبر ہیں انھیں دیکھ کر بڑی خوشگوار یادیں تازہ ہو گئیں اور پھر اس وقت کے ایک دوسرے حامی معین الدین حارث بھی مل گئے۔ سالہا سال تک مشہور نیشنلسٹ اخبار "اجمل" نکالتے رہے اور مہاراشٹر کونسل (ایوان اعلیٰ) کے ممبر بھی رہ چکے تھے۔ (ان دونوں صاحبوں

کو اور ان کی اسلامیت اور تواضع و انکسار کو دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ قرن اولیٰ کے جامعی دور مجیبی کے حامیوں سے کس قدر مختلف ہوتے تھے اور صنم تراشی سے کتنے متنفر و بیزار اور کتنے پختہ مسلمان ———

—— مجلس کے رکن مولانا علی میاں ندوی، حافظ محمد عمران خاں ندوی بھوپالی اور مولانا محمد اویس ندوی نگرامی شیخ التفسیر دارالعلوم ندوہ تھے، اور کئی کئی گھنٹے ان سے یکجائی رہا کی۔ ان کے خلوص اور ہم صحبتی نے پردیس کو وطن بنا دیا۔ اور ایک رکن ہماری مجلس کے کرنل بشیر حسین زیدی (سابق ممبر پارلیمنٹ و سابق وائس چانسلر علی گڑھ) بھی شریک بزم رہے ہمارے ادارے کے یہ بھی ایک سرگرم و زبردست ساعی و ہمدرد ہیں۔ اور اپنے ذاتی تواضع و انکساری میں کسی سے کم نہیں۔ قاضی محمد اطہر مبارک پور اسلامیات کے ایک معلوم و معروف فاضل ہیں اور مدت سے بمبئی میں مقیم ہیں۔ جتنا وقت ان کے ساتھ کٹا اچھا ہی کٹا۔ شاعر جلیل سکندر علی وجد اورنگ آبادی سے کوئی ۳۲، ۳۵ سال کے بعد ملنا ہوا۔ ان کی نوعمری کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا، سیشن جج کے عہدہ تک پہونچ کر ریٹائر ہوئے ہیں لکھنوی شیعہ لیڈر سید ابو محمد ایڈیٹر کاروانِ حیات سے ملاقاتیں اچھی رہیں ایک بڑے پرانے شناسا مولانا عبدالحمید نعمانی مالی گاؤں سے تکلیف اٹھا کر ملنے کے لیے آئے اور اپنے اخلاق کا نقش دل پر چھوڑ گئے۔ شہر میں جماعت اسلامی

خاصا کام کر رہی ہے۔ اس کے روح رواں شمس پیرزادہ ایک معروف و مالوف و مانوس ہستی ہیں، اپنے دفتر میں مدعو کر گئے۔ بڑی بات یہ کہ جب ہم لوگ پہونچے تو اپنے وعدہ کے پابند رہے، گفتگو محض نجی حیثیت تک محدود رکھی۔ ملاقات کو تقریب نہیں بنایا اور سادگی کے ساتھ واپس کر دیا، یہ بات معمولی نہیں بڑی ہے، اور اسی لئے اسے خاص طور پر لکھنے کی ضرورت پیش آئی، ہر ملاقات ہمارے یہاں ایک تقریب بلکہ ایک تماشہ بن کر رہتی ہے اور یہ تماشہ بندی بھی قوم میں ایک مرض کی طرح پھیل گئی ہے۔ تمیزداری تہذیب و شائستگی اور صحیح قسم کی خاطر و مدارات میں دوسرے کو یہاں کی جماعت اسلامی سے سبق لینا چاہیئے۔ مہاراشٹر کے وزیر صحت رفیق زکریا صاحب کے انگریزی مضمون بمبئی کے پرچوں میں سالہاسال سے نظر پڑ رہے تھے ۲۸ر کی شام کو جلسہ میں پہلی بار مضمون نگار کی بھی زیارت ہوئی۔ ملاقات کی مدت کل دو ہی ایک منٹ کی رہی، لیکن دل کی کشش اتنی ہی دیر میں ان کی جانب محسوس ہوئی عجب نہیں کہ سوٹ میں ملبوس کوئی روح سعید ہی ہو۔

بمبئی کو باب الکعبہ کہا گیا ہے، حاجیوں کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ سال کے چھ مہینوں میں تو ضرور جاری رہتا ہے۔ تاجر عموماً اہل خیر و مہمان نواز ہیں نمازی بھی کثرت سے ہیں جیسا کہ مسجدوں کی سرسری سیاحت سے بھی اندازہ ہوجاتا

ہے۔ محرم اور ربیع الاول میں اپنی خوش عقیدگی کا مظاہرہ بھی خوب کرلیتے ہیں۔ باہر سے واعظوں اور خطیبوں کو بلاکر انھیں خوب نذرانے دے دے کر اور مذہبی رنگ کے جلوس نکال نکال کر اور ان میں نعرے لگا لگا کر ــــــ لیکن صحیح دینداری، خدا ترسی اور احساس عبدیت کا قحط جیسا سب کہیں ہے یہاں بھی ہے۔ بلکہ یہ دیکھ کر بڑی ہی عبرت ہوئی جہاں ہزار ہا ہزار مکان عالیشان کئی کئی منزلے موجود ہیں۔ انھیں کے عین پائیں میں ہزار ہا بندگان خدا ایسے بھی ہیں جنھیں سونے کے لئے ایک گوشہ اور ایک چارپائی تک نصیب نہیں۔ عمر کی ساری راتیں سڑکوں ہی پر گزارتے رہتے ہیں اور بیچاروں کو مکان کے نام سے کوئی تنگ و تاریک کوٹھری تک نصیب نہیں ــــــ خیر یہ تو بمبئی غریب کا قصور نہیں، امارت کے پہلو بہ پہلو شدید افلاس تو شاید ترقی و تمدن کا خاصہ ہے۔

آج کا دن بھی حسب معمول مخلصوں سے ملنے ملانے میں گزرا، حاجی عبدالستار کا خلوص شاید سب سے زیادہ رنگ لایا، کیوں نہ ہو آخر غریب صاحب مرحوم کے عزیز قریب ہی ہیں۔ شہر بمبئی میرے مخلصوں کی سرزمین ہے لیکن غریب صاحب مرحوم اس بزم کے سید الطائفہ تھے۔ بمبئی پہنچ کر کسی کے نہ ملنے کی حسرت سب سے زیادہ دل میں رہی تو انھیں مغفور کی تھی۔ تقسیم ملک سے پہلے یعنی آج سے کوئی تیس سال قبل اس بندہ خدا نے میرے پاس کئی ہزار کی رقم چھپکے سے

بھیج دی صرف یہ لکھ کر کہ آپ جسے چاہیں اس رقم میں سے دیں اور اسے جس صرف میں چاہیں لائیں۔ اور پلٹ کر پھر کسی حساب کتاب کا نام تک نہ لیا، اس درجہ کے مخلص قسمت سے ہاتھ آتے ہیں ان کی دوکان ۲۳؎ کٹلری بازار کی طرف سے جب گزرنا ہوا تو معلوم ہوا کہ کسی نے سینہ میں برچھی چبھو دی۔ حاجی عبدالستار آخر انھیں کے تو عزیز قریب ہیں اور انھیں سے ملتے جلتے ایک دوسرے صاحب نکلے حاجی اسماعیل ہاشم اور ان کا شمار بھی مرحوم غریب کے رفیقوں میں تھا، ان کی خو بو کیسے نہ رکھتے۔ ان کی اخلاص مندی کے تقاضوں کو دیکھتا تھا تو دل شرمندہ ہو ہو کر رہتا تھا کہ خدائے ستار کیا پردہ ڈالے ہوئے ہے اور صحرا اور بیابان کو خلقت کی نظر میں کیسا گل و گلزار دکھائے ہوئے ہے ؎

می نماید نور و نار و نار نور

ور نہ دنیا کے بُدے دارالغرور (رومی)

دعوتیں دن کو بھی رہیں اور رات میں بھی اور کیسے کیسے پرتکلف ریئسانہ کھانے۔ کھانے میں آئے۔ لیکن الحمدللہ کہ ایک معاملہ میں میزبانوں نے اس بدذوق مہمان کی بڑی رعایت ملحوظ رکھی یعنی دسترخوان کو بہت سے کھانوں سے باردار نہیں کر دیا کھانے لذیذ جتنے بھی ہوں ان میں مضائقہ نہیں لیکن یہ کیا کہ ایک ہی وقت میں ان کی پوری دکان لگا دی! دو ایک

بالکل کافی ہو سکتے ہیں، زیادہ ڈھیر لگا دینے سے حرص وہوس کو بھی تسکین نہیں ہوپاتی خواہ مخواہ طبیعت کو انتشار پیدا ہو جاتا ہے جو کھاتے بھی تھے سیر ہو کر کھائے گئے اور دل سے شکر گزاری کے جذبات بھی اسی مناسبت سے پیدا ہوتے رہے

ایک اور صاحب صوفی عبدالرحمن سے ملاقات ہوئی معلوم ہوا کہ سیٹھ عمر بھائی چاند بھائی کے صاحبزادہ ہیں اور سیٹھ صاحب کی وفات ابھی چند ہی ہفتے قبل ہوئی ہے سیٹھ صاحب خلافت کمیٹی کے پرانے خزانچی تھے ان کا نام آتے ہی کتنی خوشگوار یادیں مارچ ۱۹۲۹ء کے حج بیت اللہ کی جہازی خلافت ہاؤس کی سب نظر کے سامنے پھر گئیں۔ رہے نام اللہ کا ایک صاحب محمد حسین توفیق نامے کا ذکر تو رہا ہی جاتا ہے، خوب یاد پڑ گئے مسافرخانہ حاجی صابو صدیق سیٹھ اور انجمن خدام النبی کے خاص کارکن۔ "مسافرخانہ"، میرے لیے مقامات مقدسہ سے کم محترم نہیں، دیکھ کر دل پوری طرح بھر آیا جس جس حصہ سے میرے والدین گزرے تھے، جی میں آتا رہا کہ ان کو آنکھوں سے لگایئے اور ہو سکے تو پلکوں سے جھاڑو دے دے کر خوب دل کھول کر رو دیجئے۔ اس ناشکری نے اس وقت نہ ان کی کوئی خدمت کی نہ قدر۔ اب کفارہ وتلافی کی صورت ہی کیا ہو۔

ایک صاحب اشفاق حسین نامے (مالک اکسپریس بلاک) کے
اشفاق نامے پہلے مل چکے تھے۔ اب جو خود ملے تو مجسم "اشفاق" نکلے۔ ان کے
بھائی صاحب اپنی جسمانی معذوری کے لحاظ سے ایک تصویر عبرت ہیں
چلنا کیا معنی کھڑے ہونے سے معذور، مستقل کرسی نشین.......... کسے خبر
کہ ان تکوینی تکلیفوں کا معاوضہ کل کیا کیا مل کر رہے گا، لکھنؤ کے ڈاکٹر
آصف قدوائی بیچارے جسمانی معذوری میں ان سے کہیں بڑھے
ہوئے یاد پڑ گئے۔ خطیب صاحب جامع مسجد بڑے باخبر UPTO DATE نکلے
مجھے انگریزی زبان میں شائع ہونے والی ایک خاص خبر کا تراشہ انھیں
حضرت نے دیا جس سے میں بے خبر ہی رہ جاتا اور ان کے نائب مولوی
شوکت علی صاحب بھی توجہ و التفات سے بڑھ کر ملے۔ مولوی امام الدین
تو اپنے ہی جوار اودھ کے ہیں لیکن اب ان کا شمار بمبئی والوں میں کرنا
پڑ رہا ہے ملے اور کام کے آدمی ثابت ہوئے۔ مولوی مختار احمد ندوی
حکیم نسیم (میوائمہ والے) اور مالیگاؤں کے ضیا ہانی اور کئی صاحب ایسے
ملے جو کہنا چاہیے کہ چھپے رستم سے کم نہ تھے۔ سورت کے ایک سیٹھ احمد دادا
بھائی زاو جی میرے قدیم محسنوں مخلصوں میں تھے۔ اب سالہا سال
ہوئے ہندوستان کی سکونت ترک کر کے ملیشیا جا بسے تھے اور ان کے بھائی
اور بھتیجے بھی ملے۔ اور قدیم رشتہ محبت کو تازہ کیا۔ خلافت ہاؤس کے بڑے پرانے

کارکن مرزا عبدالستار بیگ ملے جو اب خود قابل زیارت ہیں انھیں کے مخلصانہ اصرار پر سہ پہر کے وقت خلافت ہاؤس جانا ہوا۔ وہاں اب کیا ہے سوا بیگم محمد علیؒ کی قبر کے۔ قدامت کے لحاظ سے تو صدق "کے سب سے بڑے قدرداں ملا عبدالغفور بجواسی ملے۔ اب اپنے لڑکے کے پاس کناڈا ہجرت کرکے جانے کو تھے پوری طرح سوٹ پوش لیکن باتیں سب دینداروں ہی کی طرح کرتے رہے ؎

ایک دلی پوشیدہ اور کافر کھلا

آج دن میرے مقالہ کا تھا۔ عنوان یہیں سے لکھ کر گیا تھا" تغیر قرآن کے جدید تقاضے" مدت لکھنے کے لیے کم ملی تھی (لوگ یہ لحاظ نہیں کرتے کہ مسودہ کی صفائی بھی کئی دن لیتی ہے اور مسودہ صاف کرنا ہر ایک کا کام بھی نہیں) پورا ہونے پر صاف شدہ مسودہ ½ ۲۶ صفحہ کا ہوگیا تھا ایک بڑا مسئلہ اب یہ پیدا ہوگیا تھا کہ اسے پڑھ کر کون سناتا۔ صرف چند سال پہلے میں خود ہی سناتا تھا۔ اور خاص کر ادبی یا شعری موضوع پر تو میرے سوا اور کوئی سنا سکتا بھی نہ تھا۔ اب یہ صورت ممکن نہ تھی۔ مقالہ کتنا ہی صاف اور خوشخط لکھا ہوا ہو ممکن نہیں کہ جب تک اس کو آنکھ سے بالکل ہی قریب نہ لے آؤں اسے پڑھ سکوں۔ اس لیے کسی دوسرے

سے پڑھوانا ناگزیر ہوگیا۔ مولانا علی میاں سلمہٗ نے ایک ندوی غلام جیلانی صاحب کو اس پر آمادہ کرلیا اور انھوں نے ایک بار میرے سامنے اسے پڑھ کر پھر حاضرین کو سنایا ـــــــ وقت سے ذرا قبل ہم لوگ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے احاطہ میں پہونچ گئے اور فیضی صاحب سے مل لیے میری ان کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ بڑی تہذیب وشائستگی سے ملے اور اردو خوب شستہ بولتے رہے (خیال تھا کہ جس طرح لکھنے میں انھیں اردو کی مشق نہیں شاید بولنے میں بھی نہ ہو) ذرا دیر بعد ہم لوگ بالاخانہ پر انسٹی ٹیوٹ کے لق ودق ہال میں پہونچے۔ آج صدارت کرنل بشیر حسین زیدی (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کر رہے تھے) اور انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں خاصا وقت لیا۔

مقالہ انشاءاللہ ان صفحات میں نقل ہوگا، خلاصہ یہ تھا کہ جدید مفسر کو تاریخ سے جغرافیہ سے اثریات (آرکیالوجی) سے مذاہب غیر سے اور دنیا کے دیگر علوم وفنون سے واقف ہونا لازمی ہے اور آخر میں سائنس کی موٹی موٹی تعلیمات سے۔ اس لیے کہ قرآن مجید صرف عقائد واحکام کی ہدایت روحانی واخلاق کی کتاب نہیں۔ گو اصلاً وہ یہی ہے اس میں غیر مذہبوں کے عقیدوں (خصوصاً اہل کتاب کے) کا کہیں صراحتہً ذکر ہے اور کہیں ان کی طرف اشارہ اور تلمیحیں بھی ہیں۔ اور سائنسی واقعات کا

بھی ناگزیر حد تک ذکر ہے مفسر جب تک ان سب پہلوؤں پر نظر نہ رکھے گا دوسروں کو کیا سمجھائے گا اور خود قرآن سمجھنے کا حق درجہ اوسط میں بھی ادا نہ کر پائے گا ـــــ نماز مغرب کا وقت شروع ہونے کو تھا جب جا کر مقالہ ختم ہوا۔ صدر کی زبان سے بڑے ہی ہمت افزا الفاظ نکلے، اور اس سے پہلے خود فیضی صاحب اٹھ کر آئے اور میرے کان میں کہا کہ آپ نے کمال کر دیا میں تو ہائی بلیڈ پریشر کا بیمار تھا، ڈاکٹروں نے کہہ رکھا تھا کہ کوٹھے پر نہ چڑھنا میں بد پرہیزی کر کے کوٹھے پر آیا اور آپ کا مقالہ سنتے سنتے اچھا ہو گیا، میرا بڑھا ہوا بلیڈ پریشر سب جاتا رہا۔ دل نے کہا کہ الحمد اللہ ثم الحمد اللہ فیضی صاحب ذوق سجادہ کی بنا پر دینداروں میں کچھ اچھی نظر سے دیکھے نہیں جاتے۔ جب ان کے دل کو اللہ نے کھول دیا تو ان شاء اللہ بہتوں کے دل کھول کر رہے گا اور یہ سارٹیفکیٹ آج کام آئے نہ آئے کل ان شاء اللہ ضرور کام آ کر رہے گا ـــــ اللہ میں قدرت ہے کہ جس جاہل سے چاہے کام عالم کا لے لے، اور اپنے کلام کی تائید اور نصرت کے لیے جس زبان کو بھی چاہے گویا اور متکلم بنا دے۔

ایک میرے دشمن بہ صورت دوست غازی حامد الانصاری ملے خلافت ہاؤس اور دوسری جگہوں میں بھی اپنے سے خدمت ہی کون سی بن پڑتی

ہے لیکن خیر تھوڑی بہت جو کچھ کبھی اتفاق سے ملتی بھی ہے تو اجر کے سب سے بڑے لیٹرے یہی حضرت نکلتے ہیں، وہ داد وہ مداحی نہ قصیدہ کوئی قصیدہ خوانی کہ گویا میں کوئی امیر با توقیر ہوں یا کوئی درباری شاعر تو جو کچھ اجر ملا بھی وہ سب یہی حضرت چھین جھپٹ کر لے گئے اور مجھے سربزم کھکھ اور شرمندہ چھوڑ گئے! ایسے کو رہزن اور "بٹ مار" اگر نہ کہیے تو اور کیا کہیے!

بمبئی میں میری اصل دلچسپی کی چیزیں یہاں کے کتب خانے تھے پبلک لائبریریاں بھی مثلاً ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری اور یا پھر انگریزی اور عربی کے بڑے بڑے کتب فروش، اس لحاظ سے یہ سفر تمامتر ناکام ہی رہا۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے لیے نہ کوئی رہبر ملا اور نہ وقت ہی نکل سکا، طبیعت کے عام یاس وانقباض کو بھی اس میں دخل ہے۔ اور کتب فروشوں تک بھی رسائی نہ ہو پائی بڑا اشتیاق ایک زمانے میں شرف الدین الکتبی مرحوم کی دوکان کا تھا۔ دوکان جو شاید موجود بھی نہیں کتبی مرحوم بھی اب زندہ نہیں اور عبدالصمد نے بمبئی سے باہر بھیمڑی میں کوئی پریس بڑے پیمانہ پر کھولا ہے۔ لیڈن (ہالینڈ) تک کے مطبوعات کا انتظام یہی کرتے ہیں اور بیسرے لڑکے حاجی خلیل ندوی حاجی سننے میں آیا کہ ہندوستان سے باہر حجاز میں ہیں۔ اور انگریزی کے جو بڑے نامی گرامی کتب فروش ایک زمانہ میں تھے تھیکر وغیرہ کے آج بس نام ہی

نام رہ گئے۔ غرض کتابوں کی طرف سے تو یہ سفر سراسر گھاٹے ہی میں رہا ــــــــ
انگریزی کی ایک ریفرینس کی کتاب EVEREY MAN ENCYCLOPEDIA
جو چھوٹی سائز کی ۱۲ جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا نیا ایڈیشن بہت
بڑے سائز پر WORLD KNOWLEDGE کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا ہے
اس کی کچھ جلدیں البتہ لے لیں۔

اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں جلسہ کا آج تیسرا دن تھا اور انجمن
اسلام کی طرف سے اس میں مولانا علی میاں ندوی کی تقریر کا انتظام تھا۔ اور
اس کی صدارت اس "گو نگے" صدر کے حصہ میں آئی۔ مجمع یوں ہی اچھا خاصا
ہو جاتا تھا۔ آج تو مقرر کا نام اور زیادہ ہی لوگوں کو کھینچ لایا تھا۔ وقت بجائے
سہ پہر کے آج دس بجے دن تھا۔ عنوان کچھ اس قسم کا تھا کہ مسلمانوں کا اثر
ہندوستان کے سماج پر۔ تقریر کوئی سوا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ رہی۔ تقریر پر مغز
اسلامیت سے لبریز تو ہوتی ہی۔ فن تقریر و خطابت کے لحاظ سے بھی اب اچھی
خاصی ہونے لگی اور سامعین کی توجہ دکشش آخر تک قائم رہی ــــــــ
کل کے ذکر میں شاید یہ رہ گیا کہ بمبئی کی اسلام پسند خاتونوں نے اپنا ایک جلسۂ عظیم
کر کے یہ ثابت کر دیا کہ بمبئی میں آبادی تنہا ترقی پسندوں اور تجدد نوازوں کی
نہیں بلکہ اسلام پسند خاتونوں کی بھی اچھی خاصی ہے۔ ہم لوگوں میں سے مولانا

عمران خاں ندوی بھوپالی وہاں جانے کا وقت نکال سکے اور وہاں انھوں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا۔ اور موجودہ خاتونوں کے چہرے کی بے حجابی پر انہیں ٹوکا اور جلسہ نے اسلامی نسوانی آبادی کی نمائندگی کر کے وقت کے چلتے ہوئے فتنۂ مسلم پرسنل لا کی ترمیم و تبدیلی کی مدلل و مکمل مخالفت کا اظہار کر دیا۔۔۔۔۔۔ خلافت ہاؤس جا کر دل پر بڑا ہی حسرت و یاس کا اثر رہا تحریک خلافت کا ایک ویران گورستان اقبال کے ایک مشہور شعر کے دونوں ادھے صحیح و حسب حال تو پریدہ رنگ ورمیدہ بو بھی اور تو "حدیث ماتم دلبری" بھی. قبر دیکھنے میں صرف ایک بیگم محمد علیؒ کی ہے لیکن دل کی آنکھوں سے دیکھنے والوں نے تو سارے ہی شیران خلافت کے عام اس کے کہ وہ نامور ہیں یا گم نام۔ مرقعے اس احاطہ میں دیکھ لیے محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام، ظفر علی خاں، شعیب قریشی، ڈاکٹر سید محمود، شفیع داؤدی اور مولانا عرفان اور بھولے بسرے مدیران روزنامۂ "خلافت" بدرالحسن جلالی، قمر احمد۔ رئیس احمد جعفری ندوی۔ میں اگر کچھ کہنا بھی چاہتا تو کیا کہہ سکتا تھا۔ غازی حامد انصاری کے اصرار پر مولانا علی میاں نے میری طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا۔ اور ایک جامع و مختصر تقریر کر دی " سامان تو تقریر کا بھوکا رہتا ہے۔ نوحۂ غم ہو یا نغمۂ مسرت بہرحال دہن و حلقوم ضرور حرکت میں آ جائیں۔

وجدؔ صاحب کا نام اب تک خدا معلوم آیا یا نہیں ذہین قسم کے شاعر ہمیشہ سے تھے اور اب تو کہنہ مشق ہو گئے ہیں۔ حیدر آباد سول سروس میں داخل ہو کر کام سیکھنے کے لئے اودھ کے ضلع سیتا پور میں تعینات ہوئے تھے۔ رات کی دعوت میں ایک قدر داں کی فرمایش پر کلام سناتے رہے اس جلسہ میں لکھنؤ نژاد نواب سید محمد زیدی سے لطف مکالمت رہا۔ کاروانِ حیات (بمبئی) کے سرپرست ہیں اور جتنا اپنے فرقہ (شیعہ) کو سناتے ہیں اس سے زیادہ سنتے بھی رہتے ہیں ـــــــ اسی رات کی دعوت میں شہاب ثاقب صاحب نے اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ دارالمصنفین دوامی ممبروں کی تعداد ۵۳ کی ہو گئی۔ ان میں فلاں مشہور مسلمان فلم اسٹار بھی ہیں دارالمصنفین یا شبلی اکیڈمی (اعظم گڑھ) محض علمی و ادبی ادارہ نہیں بلکہ نیم دینی بھی ہے اس لیے یہ خبر شاید دین پسند حلقوں کو گراں گزرے لیکن ایک فقہی عذر کارکنان ادارہ کے پاس بھی موجود ہے کہ دوامی ممبری کوئی اعزازی لقب یا منصب نہیں بلکہ ایک ہزار دینے پر ہر لائف ممبر کو مطبوعات ادارہ کچھ مفت اور کچھ نصف قیمت پر ملنے لگتی ہیں اور یہی کچھ اسی طرح کے کاروباری حق ادارے پر قائم ہو جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ خریداروں کے عقائد و اعمال سے دوکاندار کو کوئی بحث نہیں ہوتی۔ کاش دین کے حقایق و معارف، اس ادارہ کی راہ سے "آرٹ"

والوں تک پہونچیں! ـــــ خود مولانا شبلی کی زندگی بھی تو کچھ اسی روش کی رہی۔ عمر کے اخیر حصوں میں سیرۃ نبوی کی برکت سے تو اچھے خاصے دیندار ہو ہی گئے تھے لیکن برسوں پہلے جب شاعرانہ و ادیبانہ طبیعت شرعی قیدوں اور پابندیوں کی چنداں عادی نہ تھی جب بھی ان کا الجزیہ اور الفاروق اور حقوق الذمیین توان کے قلم کے کتنے متوالوں کا ایمان سنبھالے ہوئے اور انھیں اسلام سے چپکائے ہوئے تھا۔

ایک ہنیں تین تین ندویوں کا ساتھ سفر میں وطن کا لطف پیدا کر رہا تھا، مولانا علی میاں، مولوی محمد عمران خاں بھوپالی اور مولانا محمد ادریس نگرامی۔ ادر مولانا علی میاں کے میزبان بھی خوب شخص تھے۔ محمد بھائی مالک آندھرا ٹرانسپورٹ اور ان کا مکان واقعی محل ہی تھا نام تھا SOHAG PALACE نام کے اردو ترجمہ کی اگر اجازت ہو تو حاضر ہے "عروس محل"

اپنے زمانہ جاہلیت کی یاد آجانا بالکل قدرتی تھی۔ مئی ۱۹۱۵ء میں جب آزاد خیالوں کی ٹولی کے ساتھ بمبئی میں ایک ہفتہ ہوٹلوں میں رہنا ہوا تھا تو شیکسپیر اور دوسرے مغربی ڈرامہ نویسوں کے عشق میں کیسی تلاش تھیٹروں اور پلے ہاؤسوں کی رہتی تھی اور وقت عزیز کا کتنا بڑا حصہ انھیں خرافات میں گزرتا تھا اور عین اسی کو اقتضاء علم و دانش سمجھا

جاتا تھا نہ مسجدوں سے کوئی واسطہ نہ نمازو اذان سے کوئی دلچسپی، اللہ نے کیسی کیسی گمراہیوں اور کیسی کیسی کج رویوں سے نجات بخشی ــــ ایک دن ایکی ایسا ہوا کہ بمبئی کے ایک انتہائی فیشن ایبل حلقہ مالابار ہل سے گزرتے ہوئے جگمگاتی ہوئی کوٹھیوں کے درمیان ایک ویرانہ پر گزر ہوا۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا زمین کا ایسا نظر پڑا جس پر کبھی کوئی عمارت رہی ہوگی رہبر نے بتایا کہ یہ جنجیرہ ہاؤس تھا یعنی وہ محل جس میں بیگم صاحبہ جنجیرہ مع اپنی دونوں بہنوں زہرا فیضی اور عطیہ فیضی کے ساتھ رہتی تھیں اب کیا تھا کہ شبلی کے اس پرستار کے سامنے نفاست مجسم عطیہ فیضی اور ان کی ساری لطافتوں، نفاستوں اور نزاکتوں کا کیسا نقشہ پھر گیا۔ مکان کیسا پُر رونق، دلکش اور سجا سجایا ہوگا اور اپنے اس انجام سے بالکل بے خبر۔ ابھی تصور کو اس تذکر و تفکر سے فراغت نہیں ہوئی تھی کہ ایک دوسرا پلاٹ بہت بڑا نظر کے سامنے آگیا، سرتاسر کھنڈر، ملبہ پر ملبہ اور رہبر نے جو بتایا اسے سننے کے لئے دل کسی طرح تیار نہ تھا ہاتفِ غیب کے بجائے رہبر کی زبان سے نکلا "نظام حیدرآباد کا محل تھا" یقین آئے یا نہ آئے بہرحال یقین کرنا ہی تھا۔ نظام عالی مقام جو رئیسوں کے رئیس اور امیر الامراء تھے محض ہز ہائی نس (اعلیٰ حضرت) نہیں ہز اگزالٹڈ ہائی نس (اعلیٰ ترین حضرت) تھے جن کا شمار ہندوستان اور ایشیا ہی کے نہیں بلکہ دنیا کے متمول ترین انسانوں میں تھا! پھر سو برس بھی تو نہیں ہوئے۔

سقوط مملکت ۱۹۴۸ء میں ہوا۔ پورے ۴۲ برس کی مدت ہوئی۔ انقلاب حال اور اس درجہ تیزی کے ساتھ۔ عبرت کے ذخیرہ میں اپنی مثال آپ ہے۔

بولی عبرت کہ ہوش میں آؤ اے حریصان مال وشوکت وجاہ
مٹ گیا نقش حامد ومحمود رہ گیا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔

——— ٹکٹ پہلے سے لے رکھنا اور جگہ پہلے سے مخصوص کرا رکھنا اب لمبے سفر کے لیے ناگزیر ہو گیا ہے۔ اتنی جلد انتظام کہاں ممکن تھا، لیکن اللہ کا فضل ہوا کہ روانگی کے دن لکھنؤ کے لیے ایک اسپشل بمبئی سے چھوڑا گیا جس میں جگہ ملی اور قبل دوپہر روانہ ہو کر لکھنؤ بحمد اللہ ۲ رکی سہ پہر کو پہنچ گیا ایک بار پھر سارے اہل محبت کا شکریہ خاص کر میزبان اور ان کے خاندان والوں کا۔

(صدق جدید ۱۹ر مئی ۱۹۶۲ء)

بہار

"بہار کی بہار"

فاضل گرامی مولانا مناظر احسن گیلانی کے وطن کو دیکھنے اور وہیں جاکران سے ملنے کی تمنا سالہاسال سے تھی۔ نوبت خدا خدا کرکے اب کی ۲۴ جولائی کو آئی اور ساڑھے تین دن کا وقت، کسی طرح اس آمد و رفت کے لیے نکل سکا۔ گیلانی ایک چھوٹا سا موضع ضلع پٹنہ میں ہے۔ شہر سے کوئی ۵۰ میل دور ضلع مونگیر کی سرحد پر ریلوے لائن سے بہت دور۔ رفیق سفر مولانا عبدالباری ندوی (صاحب جامع المجددین تھے) گویا۔

مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

نیز عزیزی محمد ہاشم قدوائی ایم اے (لکچرر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) سلمۂ ـــــ اذ ارسلنا الیہم اثنین ..... فعززنا بثالث۔

مختصر سے قافلہ کی پہلی منزل خاص پٹنہ تھی۔ مولوی سید ریاست علی ندوی (پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ) سے عزیزانہ تعلقات آج سے نہیں ان کے لڑکپن سے قائم ہیں۔ انھوں نے مہمان نوازی میں وہ تکلف برتا جو صریح، اسراف کی حد میں آجاتا ہے۔ ان کی معیت میں تین گھنٹہ کے اندر اردو لائبریری خدابخش، اورنٹیل لائبریری، پٹنہ یونیورسٹی لائبریری مدرسہ شمس الہدیٰ لائبریری۔ ان سب کتب خانوں کی سرسری سیر خوب رہی، اردو لائبریری میں افسوس ہے کہ "ترقی پسندی" کے عناصر نمایاں نظر آئے۔ خدابخش

لائبریری کے نوادر کا کیا کہنا۔ آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اس کے لائبریرین صاحب تو خود ایک زندہ لائبریری نکلے ـــــ میزبان ثانی حکیم عبدالاحد صاحب پرنسپل طبیہ کالج تھے۔ انھوں نے بھی جس اخلاص و التفات کامل سے میزبانی کی، اس نے اول، دوم، کی تفریق باقی ہی نہ رہنے دی۔

گھنٹہ پون گھنٹہ کا وقت بعض مریضوں کی عیادت کے سلسلہ میں اسپتال میں گزرا، ایک ڈاکٹر صاحب سے تعارف ہوا جن کی اسلامیت و دینداری کی مدح بہت زائد سننے میں آئی۔ اتفاق سے ایک عزیز شاہ محمد عزیز منعمی بھی اسپتال میں بہ طور مریض داخل تھے۔ سرسری ملاقات میں وہ پیکرِ اخلاق اور اچھے خاصے مرد مسلمان نکلے۔ لق و دق اسپتال کی خوش منظری کا کیا کہنا۔ نیچے دریائے گنگا برسات کے موسم میں خوب چڑھا ہوا، اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ موجزن، حدِ نظر تک وہی نظارہ، اسپتال کی چھت پر سے دیکھئے تو دریا پر سمندر کا گمان گزرنے لگے، اور پٹنہ بمبئی نظر آنے لگے! ـــــ کسی "طبیب" کی خوش جانی سے متاثر ہو کر سُنا ہے کبھی کسی شاعر نے کہا تھا۔

خوش طبیب ست بیا تا ہمہ بیمار شوند

اس اسپتال کی خوش سوادی سے متاثر ہو کر عجب نہیں جو بہت سے تندرستوں کے دل یہ تمنا پیدا کرنے لگیں کاش بیمار ہی ہو کر ہیں اس چھت

سے یہ نظارہ کرنے کو ملے ۔

گیلانی خاص کا کیا کہنا، سکون خاطر کی جنت، باغ، مکان، مسجد سب ہی مثالی جگہیں۔ اور مکین کی جاذبیت نورٌعلیٰ نور، اس کی قوت اسی سے ظاہر ہے کہ وہی تو اتنے طویل سفر کی محرک ہوئی تھی۔ کھلانے پلانے مہمانی کے ہر جزو میں سلیقہ و اعتدال ملحوظ ـــــ لیکن گیلانی تک رسائی آسان نہیں وہ بھی اس برسات کے موسم میں۔ لاریاں عموماً کھچا کھچ بھری ہوئی اور میلوں تک چند فٹ چوڑی سڑک کے اِدھر اُدھر دونوں طرف برساتی پانی، گویا مسلسل جھیل، لاری والے سے ذرا بھی لغزش ہو تو پوری لاری کھڈ کے اندر تشریف لے جائے۔ واپسی کا سفر انھیں لاریوں کی بدولت کچھ خوشگوار نہ گزرا ـــــ بہار میں خزاں کے کچھ جھونکے! اور راستہ میں گیلانی سے قریب دور سے مولانا سید سلیمان ندوی کے وطن موضع دیسنہ کا نظارہ بھی کچھ کم دلخراشی و درد انگیز نہ تھا۔

واپسی میں اہل پٹنہ نے پھر اپنی روایتی مہمان نوازی کا پورا ثبوت دیا اور ایک صاحب تو عجیب و غریب ہی نکلے، جواں عمر سے آدمی انوار احمد نام ـ پٹنہ ہائی کورٹ کے نامور و ممتاز ایڈوکیٹ حضرت تھانویؒ کے متوسل، پہلے سے نہ کوئی تعارف نہ تعلق، قدم قدم پر فرشتہ رحمت نکلے۔ ہر وقت اپنا نفیس موٹر لیے موجود، گھنٹوں اپنا وقت عزیز نذر کیے ہوئے، سادگی کا یہ عالم کہ صرف کرتہ

پائجامے میں ملبوس اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بے تکلف اسی حالت میں میزبان کا سامان خود اپنے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے! ـــــــ کھانے کو دسترخوان اپنی کوٹھی میں بچھایا تو وہ سادگی و تکلف کے امتزاج کا ایک قابل تقلید نمونہ!

شہر سے متصل قدیم قصبہ "پھلواری شریف" ہے مشہور زیارت گاہ بھی بہ نفس ارادہ وہاں بھی حاضری کا تھا، مرحومین کے مزار پر فاتحہ پڑھنے اور موجودہ عنایت فرماؤں سے لطف نیاز حاصل کرلینا جریدہ نقیب کے ایڈیٹر اور امارت شرعیہ کے کارکن شاہ عثمان غنی صاحب کو اطلاع بھی کردی تھی۔ لاری کے گڑبڑ نے نظام اوقات مختل کردیا، اور طبعی کاہلی کو ایک بہانہ وعدہ خلافی کا دے دیا۔ تار سے معذرت کردی اس پر بھی ادھر سے ٹیلیفون پر حکم حاضری کا ہوتا رہا۔ تعمیل کی کوئی صورت ممکن نہ ہوئی، دل بہت ہی محجوب رہا۔ خصوصاً قدیم کرم فرماؤں قاضی احمد حسین صاحب شاہ احمد حبیب ندوی وغیرہما سے اور شاہ غلام حسنین صاحب (فرزند مولانا شاہ سلیمان علیہ الرحمۃ) سے تو ذاتی ہی نہیں خاندانی تعلقات برابر چلے آرہے ہیں ـــــــ دل میں اس وقت کٹ کر رہ گیا جب میری کوتاہیوں کا خیال کئے بغیر خاصی رات گئے دانا پور جنکشن پر سجادہ صاحب خانقاہ مجیبیہ کی طرف سے نیابتہً اور اپنی طرف سے اصالتاً قاضی عون احمد صاحب مع اپنے

چھوٹے بھائی کے ایک خوان نعمت لیے ہوئے آموجود ہوئے! اللہ اللہ قدیم شرافت اور وضعداری کے ایسے نمونے اب خال ہی خال کہیں نظر آتے ہیں پٹنہ ہی میں ایک صدق نواز عبدالرحمٰن انصاری نامے جھاجھا سے طویل سفر اختیار کرکے محض صدق نویس سے ملنے کو آئے اور اپنے اخلاص کا نقش دل پر چھوڑ گئے۔

سفر کا آخری جزو بڑا تجربہ آموز ثابت ہوا، اسی درجہ میں اتفاق سے بریلی کے مشہور امام اہل سنت "اعلیٰحضرت، مولانا احمد رضا خاں مرحوم کے جانشین اور پوتے جناب ابراہیم رضا خاں صاحب اور ایک اور عالم صاحب انھیں کے ہم مسلک لیکن نرم مزاج و شیریں زبان موجود تھے بریلوی حضرات کا شوق دیدار و مکالمت ایک مدت دراز سے تھا بحمداللہ پورا ہوگیا ——— کیا کیا تجربہ ہوئے آنکھوں نے کیا کیا دیکھا، کانوں نے کیا کیا سنا۔ یہ خود ایک مستقل موضوع ہے۔ جس کی گنجائش اس مختصر روداد سفر میں کہاں نکالی جائے۔ خیر مختصر یہ کہ رات بھر بینظیر شاہ وارثی کا شعر دماغ میں گونجتا رہا ؎

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے
یہ مری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی، دھری رہی!

سفر بحمداللہ بہ خیریت ختم ہوا۔ اس کو سمجھنے کے لیے صرف اتنا سن

لیجئے کہ صبح کو فیض آباد جنکشن پر جب چائے کا ہدیہ اس "بددین" یا بے دین، کی طرف سے پیش ہوا، تو اسے نہ صرف شرف قبول حاصل ہوا بلکہ ادھر سے مزید مرحمت توشے یا حلوے کی شکل میں بھی ہوئی۔

———— (صدق جدید ۱۸ر جولائی سنہ ۱۹۵۲ء)

ڈھائی دن بہار میں

جون ۱۹۵۶ء میں جس دن سے کہ اپنے محبوب ترین فاضل دوست د
بزرگ علامہ مناظر احسن گیلانی کی وفات ہوئی گیلانی کا شمار اپنے لئے گویا مقامات
مقدسہ میں ہوگیا اور اس کی زیارت کی تمنا دل میں ایک تڑپ بن کر رہی، ادھر
اپنے ایک دوسرے محترم ترین فاضل دوست د بزرگ علامہ سید سلیمان ندوی
کے وطن دیسنہ میں حاضری کی آرزو بھی کچھ کم نہ تھی، گیلانی اور دیسنہ میں
فاصلہ کل چار ہی پانچ میل کا ہے اور عزیزان دیسنہ کی طرف سے طلب اور
اس پر اصرار کا سلسلہ بھی ایک مدت سے جاری تھا، پھر اس جوار میں قدیم
بدھسٹ شہر نالندہ کی سیاحت کی خواہش بھی دل میں عرصہ سے چٹکیاں
لے رہی تھیں۔ یہ سارے اسباب محرکات د داعی جمع تھے ہی کہ اپنے قدیم
کرم فرما ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے تقرر کی خبر صوبہ کی گورنری پر سنائی دی۔
ان سے مراسلت شروع ہوئی تو ان بیچارے نے غایت کرم دعنایت
سے اپنے پاس ٹھہرنے کی دعوت دے دی اور دعوت نامہ کی نثر میں شاعری
کا چٹخارہ پیدا کرتے ہوئے الفاظ کچھ اس طرح کے لکھ بھیجے کہ راج بھون کی
عزت اس میں ہے کہ اس میں درویشوں کا قیام ہو۔ دل اپنا بھی یہی چاہ رہا
تھا کہ اس درویش صفت انسان کو چل کر قصر شاہی میں رہتے سہتے دیکھئے ورنہ
اپنا حوصلہ بھلا گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کا کہاں سے ہو سکتا تھا، بھوڑے

سے تامل و تذبذب کے بعد دعوت کو قبول کر لیا اور منظوری مسرت و شکرگزاری کے ساتھ لکھ بھیجی مگر اس قسم کے قیود و شرائط کے ساتھ۔

(۱) اپنی سرکاری و منصبی مصروفیتوں میں فرق ذرہ بھر نہ لایا جائے۔

(۲) مہمان نوازی کے کسی جزو میں غلو راہ نہ پائے جس سے کوئی بھی بات آپ سے سرزد ہو جو آپ کے موجودہ جاہ و مرتبہ سے فروتر ہو۔

—— شریعت نے جس طرح مہمان کے حقوق میزبان پر قائم کئے ہیں اسی طرح میزبان کے بھی حق مہمان پر رکھے ہیں اور جو یہ مہمان نوازی کا یکطرفہ تخیل چل پڑا ہے یہ سرتاسر حقیقت کے خلاف ہے اور اس پر عام و خاص سب کو متنبہ ہونے کی ضرورت ہے۔

سفر کے لئے وقت نکالنے کے باب میں اپنی طبیعت کی تنگی شاید جزرسی کی حد تک پہنچ چکی ہے اور شمع زندگی کی آخری ٹمٹاہٹ کے احساس نے اس جزرسی کو کچھ ناگزیر سا بنا رکھا ہے اس کے باوجود اس سفر کے لئے وقت خوشی سے نکالا اور پروگرام پٹنہ اور ملحقات و مضافات کے لئے تین دن کے قیام کا تھا۔ اور ایک ایک شب آمد و رفت کی اس کے علاوہ گویا کل مدت سفر تین دن اور پانچ راتوں کی —— اپنے اسٹیشن دریاباد سے پٹنہ کے لیے اب نئے ٹائم ٹیبل میں کوئی سیدھی گاڑی ہی نہیں، البتہ دہلی سیالدہ ایکسپریس میں جو ادھر ہی سے ہوتا ہوا جاتا ہے لکھنؤ سے ایک بوگی کلکتہ و

پٹنہ کے لئے ہوتی ہے جو مغلسرائے سے کاٹ کر پٹنہ جانے والی طوفان ایکسپریس میں لگادی جاتی ہے۔ سفر ۳ راگست (شنبہ) کی شام کو اسی بوگی میں شروع کیا کہ یہ بے غل وغش صبح ½ ۲ بجے پٹنہ جنکشن میں جا اُتارے گی۔ چنانچہ اسی کی اطلاع بھی ایک ہفتہ قبل اپنے معزز میزبان اور دوسرے احباب پٹنہ کو کردی گئی تھی۔

"تدبیر" یہ تھی اب کارفرمائی تقدیر" کی ملاحظہ ہو۔ اپنی گاڑی جب پچھلے پہر مغل سرائے اسٹیشن پہنچی تو بہت لیٹ ہوکر اور طوفان ایکسپریس جس میں بوگی جوتی جاتی اسے چھوڑ کر عرصہ ہوا نکل چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بوگی کاٹ کر پلیٹ فارم سے بہت دور ایک سائڈنگ میں کھڑی کردی گئی اور فرض ناشناسی کی وبا عام ہے اس کے مقتضا سے اسٹیشن والوں نے ہم مسافروں کو اس کی کوئی اطلاع دینی بھی ضروری نہ سمجھی! ½ ۳ بجے محض اتفاق سے ہم بے خبروں کو خبر ہوئی اور ساتھ ہی یہ علم ہوا کہ اب یہ بوگی یہاں سے دوپہر کو جنبش میں آئے گی اور قریب شام کو پٹنہ پہنچائے گی، گویا مجوزہ پروگرام سے پورے ۱۲ گھنٹہ لیٹ! لاحول ولا قوۃ تو پہلے ہی زبان پر آچکا تھا۔ انا للہ پڑھنے کا موقع اب آیا! —— سہ روزہ قیام کا ایک ایک منٹ مشغولیت سے بھرا ہوا تھا۔ یہ اتنے گھنٹوں کی کسر کیونکر پوری ہوسکے گی۔ اور پھر میزبان کو کس درجہ زحمت انتظار بلاوجہ برداشت کرنا ہوگی گورنمنٹ ہاؤس

کے سارے پروگرام اپنے جزئیات کے ساتھ کئی کئی دن قبل سے طے مندرج ہو چکے ہیں! ___ اب شرمندگی، تکلیف، جھنجھلاہٹ سب کا احساس ایک ساتھ ہوا اور ان سب سے بڑھ کر بندہ کی بے بسی اور تقدیر کے مقابلہ میں تدبیر کی شکست کا! بندگی نام ہی ہے بیچارگی کا!

جوں توں پٹریاں پھاندتے کہنا چاہیئے کہ گرتے پڑتے پلیٹ فارم نمبر ۳ پر پہنچا ___ اور وہاں سامان ویٹنگ روم میں رکھا اتنے میں معلوم ہوا کہ پٹنہ کے لئے دوسری گاڑی وہ سامنے پلیٹ فارم ۱۰ سے جا رہی ہے! حسرت کی آنکھوں سے جاتے دیکھا اور کوئی صورت ہی اس کی نظر نہ آئی۔ کہ اتنے فاصلہ سے دوڑ کر اس پر سوار ہو جاتا! زخم پر زخم کھانا اسی کو کہتے ہیں، خیر اب پلیٹ فارم نمبر ایک پر آ اور تارگھر کی تلاش کے بعد اس میں پہنچ تار میزبان کو روانہ کیا کہ آپ کا مہمان یوں معلق سرائے میں معلق رہ گیا ہے اب وقت کوئی ۴½ بجے تڑکے کا تھا، نماز فجر پڑھی اور خیال آیا کہ اتوار کا دن ہے تار خدا معلوم کب پہونچے کیوں نہ ابھی ٹرنک کال کر کے ٹیلفون سے ہی یہ اطلاع دم بھر میں پہنچا دیجئے!

بابو صاحب جو ایسے موقع پر خزانہ کے سانپ کی حیثیت رکھتے ہیں بولے کہ سیدھی ٹرنک کال یہاں سے ہو نہیں سکتی ہیں پہلے بنارس سے

اجازت لینا ہوگی اور اس اجازت کے ملنے میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لگ جاتا ہے۔ آپ اتنی دیر تک یہیں سامنے بیٹھ کر انتظار کریں۔ ظاہر ہے کہ اس جواب کے بعد اب ٹرنک کال کرنے کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہ جاتا تھا! فسخ عزائم سے معرفت رب کا سبق ایک بار اور حاصل ہوا! اوّل سخت شرمندہ کہ علاوہ میزبان کے ہاں کے انتظامات کے درہم برہم ہونے کے دوسرے حضرات جو اسٹیشن آئے ہوں گے۔ انھیں بھی کیسی تکلیف اٹھانا پڑی ہوگی!

ریل کے بڑے جنکشن ایک چھوٹے سے پیمانہ پر کارنامہ قدرت کا نمونہ ہوتے ہیں وہ ان کی ہمہ وقتی چہل پہل قلیوں کی دوڑ دھوپ مسافروں کی بھیڑ بھاڑ، سودے والوں کی چیخ پکار، بابو صاحبان کی ڈانٹ ڈپٹ ادھر یہ گاڑی گھڑگھڑاتی ہوئی آئی اُدھر اس انجن نے سیٹی دی ادھر اس کرانچی میں مال لد رہا ہے ادھر وہ ڈبہ دم کے دم میں مسافروں سے خالی ہوگیا! ابھی یہ پلیٹ فارم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، کان پڑے آواز نہیں سنائی دیتی تھی اور ابھی ایک دم سے سناٹا چھا گیا کتنے بچھڑے ہوئے آناً فاناً مل گئے اور کتنے ساتھ آن کی آن میں چھوٹ گئے! ایک شان جامع المتفرقین کی ایک شان فاروق المجتمعین کی!— انسان اگر دل

رکھتا ہو (اِنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ) تو کتنی بصیرتیں ہر بڑے جنکشن سے حاصل کرسکتا ہے، کتنی تجلیات سے اپنے دیدہ و دل کو منور کرسکتا ہے! اور مغلسرائے سے بڑا جنکشن ملک میں کون ہوگا۔ زندگی کی نیرنگیوں کائنات کی بوقلمونیوں عمر کے آتار چڑھاؤ جوانی کی بے وفائیوں کا سارا نقشہ بہ یک وقت اس آئینہ میں موجود!

۱/۲ ، کا وقت تھا، گاڑی روانہ ہوئی پسنجر ہر اسٹیشن پر رکتی ٹھہرتی ہوئی کچھ ہی دیر بعد صوبہ بہار کا علاقہ شروع ہوگیا اور صوبہ کے دور اسلامی کی تاریخ نظر کے سامنے پھر گئی وہ شیر شاہ کا اقبال، وہ منیر، راجگیر بہار شریف پھلواری شریف کے صوفیہ کے مجاہدے اور ریاضتیں وہ پٹنہ، آرہ، مونگیر داناپور اور چھوٹے چھوٹے قصبوں کے اہل علم وفضل کی بزم وہ یہاں کے شاعروں، ادیبوں سے فلسفیوں تک کی خدمات علم وادب وہ علی محمد شاد اور امداد علی، علی امام اور حسن امام، خدا بخش خاں اور میاں ریاض الحسن خاں، شرف الدین و مظہر الحق، ابوالمحاسن سجاد اور عبد الرؤف داناپوری مسعود عالم ندوی اور سید عبد العزیز مولانا محمد علی مونگیری اور شوق نیموی آفتاب شریعت شیخ بدر الدین اور مہر طریقت قاری شاہ سلیمان پھلواری عبد الغنی وارثی اور شمس العلما محب الحق مولوی شفیع داؤدی اور سید

تقی الدین خدا معلوم ماضی بعید و ماضی قریب کے چھوٹے بڑے کتنے مشاہیر کی یاد تازہ ہوگئی۔ اور ذہن ان کی شخصیتوں کا استحضار کرتا رہا! ______

لیجیے اب پٹنہ جنکشن قریب آگیا اور گاڑی پھلواری شریف کی آبادی کے سامنے سے گزر رہی ہے اس خطہ سے خدا معلوم بوئے انس کیوں آرہی ہے اور محسوس کچھ ایسا ہو رہا ہے کہ جیسے یہ زمین پردیس کی نہیں وطن کی ہے۔ اینٹوں کے بھٹے جا بجا لگے ہوئے ہیں اور زبان تمثیل میں یہ اشارے اس قصبہ کے بزرگوں کی تعمیری خدمات کی جانب کر رہے ہیں!

بارہ بجے ساڑھے ۱۲ بجے ہوئے اور گاڑی پٹنہ جنکشن کے حدود میں داخل ہو کر آہستہ ہوتی ہوئی ایک دور افتادہ پلیٹ فارم پر جاکر ٹھہر گئی۔

قیام پٹنہ کے لئے کل ۲۰ گھنٹے تجویز ہوئے تھے، لیکن اسے کیا کیجیے کہ اس میں ترمیم کارکنان قضا و قدر نے کردی، گاڑی بجائے ۷ بجے صبح کے اب ایک بجے دوپہر کو پہنچ رہی تھی۔ اور اس سے مدت قیام قدرۃً اب سات گھنٹے گھٹ کر بجائے ۲۰، کے کل ۱۵ گھنٹہ رہ گئی تھی، گاڑی ابھی پوری طرح رکنے بھی نہ پائی تھی کہ نظر طبیہ کالج پٹنہ کے پرنسپل حکیم عبدالاحد صاحب پر پڑ گئی۔ صدق نواز اور مدیر صدق کے قدیم مخلص و کرم فرما ہیں۔ انھیں دیکھ کر جان میں جان آگئی۔ یہ ظاہر تھا کہ صبح سے دو بار گورنمنٹ ہاؤس

سے گاڑی آنے کے بعد اب اس تیسری ٹرین کے لئے ہرگز کوئی انتظام نہ ہوگا۔ خصوصاً جبکہ میرے اطلاعی تار میں اس ٹرین یا کسی متعین ٹرین کی طرف کوئی اشارہ نہ تھا، اور گاڑی سے ابھی اتر ہی رہا تھا کہ مولوی شاہ عزالدین ندوی پھلواری بھی نظر آ گئے۔ ایک تو ندوی دوسرے پھلواردی اور قاری شاہ سلیمان کے نواسے۔ پھر اپنی ذات سے بھی محبت کے پتلے غرض کئی کئی رشتے خصوصیت کے ان کی ذات میں جمع ـــ دونوں مخلصوں کا مل جانا ایک نعمت معلوم ہوا اس کے بعد پلیٹ فارم نمبر ایر آنا۔ ویٹنگ روم میں سامان رکھنا، گورنمنٹ ہاؤس فون کرنا، وہاں سے گاڑی کا آنا یہ سب چند منٹ کے اندر ہو گیا۔

نماز ظہر سے ریل ہی پر فراغت کر لی گئی تھی، اے ڈی، سی صاحب مع کار کے جو آئے تو معذرت کرتے ہوئے۔ حالانکہ معذرت سرتاسر غیر ضروری تھی جب تار میں کوئی اطلاع اس ٹرین کے لئے تھی ہی نہیں تو اس پر کار آتی کیسے! ـــ کار روانہ ہوئی اور منٹوں کے اندر گورنمنٹ ہاؤس کی برساتی کے اندر تھی لیکن یہ کار باوجود اعلا درجہ کے ہونے کے نکلی کچھ عجیب سی بیٹھتے ہی نظر اس پر پڑی کہ ہر طرف سے کچھ بندسی ہے۔ یعنی اس کے شیشوں پر سامنے اور پیچھے اور بازؤں پر ریشمی پردے کچھ اس طرح پڑے ہوئے ہیں کہ ہٹانے سے بھی پوری طرح نہیں ہٹتے! یہ کیا ماجرا ہے؟ اے ڈی سی صاحب

نے معمہ یوں حل کر دیا کہ گاڑی خود لاٹ صاحب کی نہیں بلکہ ان کی بیگم صاحبہ کی سواری کی ہے! ـــــ یہ کیا؟ اس بیسویں صدی میں اور اتنا سخت پردہ! اور اتنے سخت پردہ کا اہتمام رکھنے والی کون؟ ایک گورنر کی بیگم! جبکہ دنیا جہان کے گورنروں ہی کی بیگمات تو بے پردگی اور بے حجابی کا ریکارڈ قائم کر رہی ہیں، کہاں پشتینی پردہ نشینوں کی بے پردگی اور کہاں یہ گاڑی جو دوسروں کو پردہ نشیں بنا دے! دل اس عالی ہمت خاتون کی اسلامیت پر عش عش کر گیا۔

۴ر اگست پروگرام میں آج کا دن سیاحت نالندہ کے لئے تھا۔ نالندہ ایک مقام ہے جو پٹنہ سے کوئی ۵۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں یہاں بدھ مذہب والوں کی مرکزی خانقاہیں، درسگاہیں اور ریاضت گاہیں تھیں۔ ۱۹۱۵ء میں صدہا سال کی گمنامی و بے نشانی کے بعد یہ شہر بڑی کھدائی کے بعد از سر نو نقشہ پر نمودار ہوا اور سرکار ہند کے محکمہ اثریات نے توجہ کرکے اسے از سر نو زندہ کر دیا۔

۱۹۳۱ء میں محکمہ اثریات کے حلقہ پٹنہ کے سپرنٹنڈنٹ کوئی صاحب ایم ایچ قریشی تھے۔ ان کا مرتبہ ایک انگریزی گائڈ بھی اس کے متعلق شائع ہو چکا ہے۔ ایک لق و دق میدان کوئی ۲ ہزار فٹ لمبا اور ۷۰۰ فٹ چوڑا

موجود ہے اور اس وسیع رقبہ میں وہ قدیم عمارتیں گویا ازسرنو کھڑی کردی گئی ہیں۔ دور دور سے سیاح انھیں دیکھنے آتے ہیں اور اس سے دوچار فرلانگ ہٹ کر میوزیم (عجائب خانہ) بھی اس سے متعلق ہے۔ کوئی دو کا عمل ہوگا کہ اپنے کو مہمان خانہ کے ایک کمرہ کے اندر پایا۔ گورنمنٹ ہاؤس کا پرانا عوامی نام اردو میں لاٹ صاحب کی کوٹھی ہے اور اس کوٹھی میں داخل ہوکر لاٹ صاحب کے مہمانوں کی خاطرداریوں کا پوچھنا کیا ہے، جھٹ پٹ غسل کے بعد ہی باریابی ہوئی۔ اور کھانے سے جلد فراغت کرکے تین سے قبل ہی اس سفر پر روانگی ہوگئی، دیر بہت ہو چکی تھی اور پورے ۲ گھنٹے کا وقت ریل والوں کی غفلت کا نذر ہو چکا تھا، پھر بھی جی نہ مانا کہ پروگرام کو خواہ مخواہ ملتوی کردیا جائے اور آج کا دن ضائع شدہ سمجھ لیا جائے کاش بندہ کو وقت کی قیمت کا یہ احساس اور اس کی حفاظت کا یہ اہتمام ہر طاعت اور دینی خدمت کے باب میں پیدا ہوجائے۔!

وقت ابھی تین کا نہیں ہوا تھا کہ موٹر نالندہ کے لئے روانہ ہوگئی پٹنہ شہر کی آبادی گو یا صرف لمبان میں ہے اور اصل اور بڑی سڑک شہر بھر میں کہنا چاہیئے ایک ہی ہے۔ گاڑی اسی راستہ سے گزری اور شہر کے ہر قسم کے منظر نظر سے گزرتے گئے، تا آنکہ نوبت دیہات کی آگئی، ابھی یہ

گاؤں ملا ابھی وہ اور درمیان میں بہار شریف کے اندر سے بھی گزر ہوا۔
پانچ بج رہے تھے کہ صبا رفتار گاڑی نے نالندہ پہنچادیا، میوزیم بند ہونے کا وقت ہوچکا تھا پھر بھی مہتمم (کیوریٹر) صاحب نے جو لکھنؤ کے ایک شریف کائستھ ہیں، گورنمنٹ ہاؤس کی گاڑی کا احترام کر کے میوزیم کی خاصی تفصیلی سیر کرادی خود ساتھ ساتھ رہے، اور ایک ایک چیز بتاتے دکھاتے سمجھاتے گئے، یہ فلاں عہد کے مٹی کے برتن ہیں یہ گھڑے ہیں، صراحیاں ہیں، بدھنے ہیں، مطہریں ہیں یہ اس زمانے کے چمچے ہیں، چاقو ہیں سکے ہیں، علمی سندوں پر لگنے والی مہریں ہیں، یہ فلاں خط کے کتبے ہیں یہ فلاں دور کے چاول جو جلی ہوئی حالت میں پائے گئے ہیں اور اب تک محفوظ ہیں اور گوتم بدھ کی مورتیں کا تو کوئی شمار ہی نہیں چھوٹی بڑی ہر سائز کی اور ہر نمونہ کی —— ایک موحد کا جی ایسے منظروں میں کیا لگ سکتا ہے، پھر بھی انسان سبق لینا چاہے تو اپنے ہر مشاہدہ سے لے سکتا ہے اور قل سیروا فی الارض اور افلم یسیروا فی الارض کے حکم کی تعمیل ہر جیہ ارض کی سیاحت سے ہوسکتی ہے اصل زمین نالندہ کی تعمیرات شکستہ کا معائنہ چند منٹ کا کام تھا، اور دل کی نگاہوں نے بہت کچھ پڑھ لیا۔

عصر کا وقت آئے ہوئے دیر ہوچکی تھی اور بارش کے باعث باہر نماز پڑھنا ممکن نہ تھا، سفر واپسی کا شروع ہوا کہ راستہ میں کوئی مسجد مل ہی

جائے گی۔ اتنے میں حکیم صاحب نے جو اسٹیشن سے لے کر اب تک برابر ساتھ ہی ساتھ تھے یاد دلایا کہ راجگیر کی مشہور پہاڑی حضرت مخدوم کی چلہ کشی کی جگہ اور مخدوم کُنڈ چند ہی میل کے فاصلہ پر ہیں کیوں نہ ان کی زیارت سے بھی مستفید ہو لیا جائے گاڑی کا رخ ادھر مڑ گیا اور وہاں پہنچ کر عجیب عجیب خوارق سننے میں آئے بلکہ بعض خوارق کے بعض علامات و نشانات تو اب تک موجود پائے۔ نیم گرم پانی کا پہاڑی چشمہ بھی کچھ عجیب سا نظر آیا۔ تازہ وضو کر کے نماز عصر یہیں مسجد میں ادا کی اور ۶۰، ۶۲ میل کا سفر واپسی شروع ہوا، نماز مغرب اصل وقت پر نصیب نہ ہوئی اور بہت سے موقعوں کی طرح آج پھر تازہ قدر ان احادیث نبوی کی ہوئی جن میں جمع بین الصلاتین کی سہولتیں مسافر کے لئے رکھ دی گئی ہیں، واپسی کا راستہ انھیں منزلوں اور انھیں منظروں کے ساتھ پھر طے ہوا اتنے فرق کے ساتھ کہ پہلے دن تھا اور اب رات۔

گورنمنٹ ہاؤس کا نظام اوقات ایک ایک منٹ کا پابند ہوتا ہے شب کا کھانے کا وقت آٹھ بجے کا مقرر تھا اور واپسی جب ہوئی تو وقت دو چار منٹ نہیں زیادہ گزر چکا تھا ــــ اور اب کیا کیا جائے کہ کتنی ندامت اس وقت ہوئی جب یہ معلوم ہوا کہ معزز میزبان اس لاابالی اور

بے فکرے مہمان کے انتظار میں ابتک اپنا ہاتھ کھانے سے روکے ہوئے ہیں
علی الخصوص اس حال میں کہ علالت کے باعث کھانے پینے کے اوقات کی
پابندی ان کے لئے اور زیادہ موکد ہوچکی ہے۔ طبیعت اپنے اوپر جھنجھلائی کہ
جاتے وقت ان سے بہ صراحت کہہ کیوں نہ گیا تھا کہ انتظار نہ فرمایا جائے!
—— خیر بات چیت کھانے کی میز پر رہی اور بات چیت تو آتے ہی دو بجے
بھی ہوچکی تھی۔ ذاتی و خانگی معاملات پر بھی اور مختلف علمی، دینی، ملی
سیاسی تحریکات اور ہر قسم کے پبلک مسائل پر بھی آزادانہ اور بے تکلف
اور یہ ضرور ہرگز نہ تھا کہ ہر موضوع پر ہم خیالی ہی ہو نقطہ نظر میں اختلاف
قدرتی بلکہ ایک حد تک ناگزیر تھے۔ لیکن شرافت جو ڈاکٹر صاحب کا امتیازی
جوہر ہے وہ سب سے زیادہ نمایاں اختلاف ہی کے موقع پر ہوئی، گفتگو
میں وہ گورنر سے کہیں زیادہ ایک "ٹیچر" (معلم) نظر آئے جامعہ ملیہ کے شیخ،
یا علی گڑھ کے وائس چانسلر، عمر بھر کی کمائی ان کی یہی معلمی ہے اور معلم
بھی کیسے کہ نفسیات بشری کے ایک ایک جزئیہ پر نظر رکھنے والے، چہرہ پر
"اللہ کا نور" داڑھی پہلے بھی تھی اب بھی ہے پہلے کے مقابلہ میں اب اس
پر عمل "قصر" بیشک زیادہ ہونے لگا ہے لیکن بہرحال یہ کیا کم ہے کہ داڑھی
موجود اب بھی ہے۔ صوبہ کا گورنر اور داڑھی والا! بیسویں صدی کا ایک
اعجوبہ!

پٹنہ ۵ راگست ۱۹۵۰ء سید سلیمان ندوی کے دیس دیسنہ کے دیکھنے کی آرزو آج سے نہیں دل میں سالہا سال سے تھی۔ آہ کسے معلوم تھا کہ سید صاحب کی زندگی میں کبھی یہ تمنا پوری نہ ہوسکے گی! ۱۹۵۲ء کا ذکر ہے کہ گیلانی کے راستہ میں پکی سڑک سے جب کسی نے بتایا تھا کہ وہ دیکھئے سامنے دومیل کے فاصلہ پر دیسنہ ہے تو بے اختیار ادھر کشش محسوس ہوئی تھی اور جی بے ساختہ یہ چاہ رہا تھا کہ سواری کو روک، قصد اس گاؤں کا کرچلیے اور سید صاحب کی زندگی کے ہردور کی تصویر نظر کے سامنے خود بخود پھرنے لگی تھی یوں بچپن میں ان گلیوں میں کھیلتے پھرتے ہوں گے، یوں ذرا بڑے ہوکر اس گاؤں سے باہر نکلے ہوں گے، پٹنہ اور پھر لکھنؤ کا سفر یوں کیا ہوگا۔ نوجوانی، جوانی، ادھیڑ سن میں شہرت حاصل کرکے یوں اپنے وطن کا رخ کرتے ہوں گے وقس علی ہذا اور یہ ساری داستان خط میں سید صاحب کو لکھ بھی بھیجی تھی۔ سید صاحب خط پڑھ کر متاثر ہوئے اور جواب میں کچھ اس طرح کا فقرہ بھی لکھا کہ آپ نے میرے لئے وہ سب کچھ سوچ لیا، جو میں خود بھی شاید نہ سوچ سکتا ــــ اور دیسنہ تو وہ مردم خیز بستی ہے جس نے سید صاحب کے علاوہ بھی بہت سے قابل ذکر اور قابل فخر ہستیوں کو جنم دیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آفتاب کے سامنے چاند اور ستارے قابل التفات ہی نہ رہ پائیں اور زندہ ہستیوں

سے قطع نظر یہاں کا کتب خانہ الاصلاح تو خود اس قابل ہے کہ اس کا قصد کر کے یہاں کا سفر اختیار کیا جائے ۔

آج صبح ہی ایک بڑے مخلص صدق نواز پروفیسر عبدالمنان بیدلؔ ایم اے ملنے آگئے کچھ وقت ان کی صحبت میں گزرا اور خوب گزرا (یہ صرف شاعری کی دنیا میں اور تخلص کے اعتبار سے "بے دل" ہیں ورنہ حقیقت میں تو صاحبِ دل ہیں) اور پھر آج کی کڑی منزل کے لئے کچھ وقت پٹرول کی فراہمی میں صرف ہوا۔ غرض یہ کہ روانگی ½ ۹ سے قبل نہ ہو سکی اور آج روانگی کے وقت یاد کر کے بصراحت میزبان سے عرض کر دیا گیا کہ وقت پہ کھانے پر انتظار کی سند نہیں اور یہ معاہدہ کے خلاف بھی ہے میں نے تو پہلے ہی لکھ بھیجا تھا کہ آپ اپنے ہر پروگرام میں بالکل آزاد رہیں گے تو خدا معلوم میری واپسی کس وقت ہو آپ ہرگز فرق اپنے کسی معمول میں نہ آنے دیجیے گا، کل مجھے خواہ مخواہ اس کی شرمندگی اٹھانا پڑ چکی ہے " قریب ۱۲ کے وقت ہو گا کہ موٹر وہاں پہنچ کر رک گیا ۔ جہاں سے دیسنہ کا کچا راستہ شروع ہوتا ہے ۔

کچا راستہ دیہات کا اور وہ بھی برسات میں! ——— اب اندازہ ہوا کہ یہاں کے مہمان نواز حضرات جو اس بھری برسات میں میرے سفر سے کچیا رہے تھے ۔ وہ کچھ بیجا نہ تھا وماھم ببالغیہ الا بشق الانفس یہ تو اللہ

کے گھر کے راستہ کی شان بتائی گئی ہے، لیکن اب معلوم ہوا کہ اس کا کچھ پر تو اللہ والوں کے گھر کے راستہ پر بھی پڑ گیا ہے! بلا مجاہدہ نفس کے ان کے در تک بھی پہنچنا ممکن نہیں۔ میزبانوں نے میری راحت کے لئے جتنا بھی انتظام ان کے بس میں تھا کر دیا تھا، میری سواری کے لئے میانہ موجود تھا اپنے لڑکپن تک میانہ پینس چوپہلا، پالکی کا رواج تھا۔ اب ان کی شکل ہی کہاں دیکھنے میں آتی ہے۔ اور ان سواریوں کا مفہوم بھی سمجھنے والے کئے باقی رہ گئے ہیں (پٹنہ اس لحاظ سے بھی قابل داد ہے کہ اس میں قدامت کی یادگاریں اور بڑی آرام دہ سواریاں فٹن اور پالکی گاڑیاں اب بھی کچھ نہ کچھ باقی ہیں) میں میانہ میں بیٹھ کر نہیں کہ اس میں بیٹھنا ممکن ہی نہ تھا، لیٹ کر روانہ ہوا میرے رفیق اور کھلی ہوئی سواری میں سوار ہوئے جسے یہاں کی زبان میں ٹم ٹم کہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد کہاروں کے کاندھے پر خشک و تر سے گزرتے اور نشیب و فراز طے کرتے اپنے مستقر کو پہنچ گئے، کہاروں نے میانہ زمین پر رکھا اور سامنے کتب خانہ الاصلاح کی عمارت تھی! "عمارت" اگر ایک غریبانہ مختصر سے ہال اور ساتھ کے بغلی کمروں پر عمارت کا اطلاق ہو سکے! آج کل اعلیٰ نہیں اوسط درجہ کے کتب خانہ کے لئے ضرورت کتنے ساز و سامان کی دفتری کیٹلاگر لائبریرین وغیرہ خاصے بڑے اسٹاف کی اور کتنے وسیع رقبہ کی، فن وار کتابوں کے رکھنے اور مرتب کرنے کے لئے ہوتی ہے یہاں ان سارے انتظامات

کی جگہ بس اللہ کا نام سب کا قائم مقام بانیوں اور کارکنوں کا محض اخلاص، کتابوں کا مطالعہ چاہے کچھ ہی دیر کے لیے ہو، سکون، یکسوئی چاہتا ہے یہاں گاؤں کا گاؤں گویا میزبان! اس ہجوم میں پڑھنے پڑھانے کی نوبت کیا آتی اور پھر عجلت در وا روی لیکن بہرحال جتنا دیکھنا بھی بن پڑا ذخیرہ توقع سے بھی بہتر نکلا، پرانے اردو اخبارات اور رسالوں کی جلدوں کے لئے تو اس کا امتیاز تو مشہور رہی تھا، کتابیں نہ صرف تعداد بلکہ نوعیت و کیفیت کے لحاظ سے بھی اچھی خاصی ملیں متعدد مخطوطے اور قلمی نوادر بھی، بستی آخر اہل علم کا وطن ہی ہے، کیا اس کا اتنا اثر بھی نہ ظاہر ہوتا۔ کاش کوئی صورت اب کتب خانہ اور اس کے متعلقات کے لئے نکل آتی، اور اگر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی گورنری اور شاہ محمد عزیز منعمی کی وزارت کے زمانہ میں بھی نہ نکلی تو پھر کب نکلے گی؟

کتب خانہ کی کتاب معائنہ" بجائے خود عجائب و نوادر کے حکم میں ہے بڑے مشاہیر وقت مولانا شوکت علی، صدر یار جنگ، حبیب الرحمن خاں شیروانی وغیرہ کے معائنے اس میں درج ملے اور سب سے بڑا انکشاف یہ ہوا کہ آج جو جمہوریہ ہند کے صدر محترم ہیں! ڈاکٹر راجندر پرشاد بالقابہ خود ان کا معائنہ اور وہ بھی شستہ عبارت اور اردو کے خاصے نستعلیق و روشن خط میں درج ملا۔ کتب خانہ کو اچھا خاصا سراہا ہے اور لکھا ہے کہ کسی امیر کی نظر توجہ اس پر پڑجائے تو کام پورا ہوجائے۔ کاش کتب خانہ والے اس نادر تحریر سے

فائدہ اٹھائیں اور عرضداشت بھیجیں یا خود وفد لے کر بارگاہ صدارت پناہ پہنچیں اور عرض کریں کہ عالی جاہ اب تو آپ خود امیر، بلکہ امیر الامراء کے مرتبہ پر ہیں ہمارا کام بننے میں پھر اب کیا دیر ہے "

سید عبدالحکیم اور بابو بشیر الحق سنا گیا کہ کتب خانہ کے بانیوں میں ہیں سید صاحب اب ضعیف زیادہ ہو گئے اور آنکھ کان دونوں سے تقریباً معذور۔ لیکن جب بات کرنے پر آتے ہیں تو جوانی کے دم خم اختیار کر لیتے ہیں۔ کتب خانہ کے دکھانے میں بشیر الحق صاحب بہت پیش پیش رہے۔

سید صاحبؒ کے مکان آبائی اور مرکان تو تعمیر دونوں کی زیارت تو خیر واجبات میں تھے اور بھی اپنے دیسنوی جاننے والوں کے مکانوں کی سرسری زیارت کے بغیر طبیعت نہ مانی۔ نجیب اشرف ندوی، مولوی سعید رضا ندوی سید صباح الدین، عبدالرحمان، سعید الحق اور جس جس کے بھی نام یاد پڑے سب کے گھروں پر حاضری ہوئی اور چشم تصور میں مکانوں کے مکینوں کی صورت پھرتی رہی۔ کھانے اور ٹھہرنے کا انتظام وحید النبی صاحب کی لق و دق حویلی میں طے پایا تھا، بہار کا دسترخوان اور مہمان نوازی یوں بھی مشہور رہے۔ اور پھر یہ تو عزیزی صباح الدین سلمہ رفیق دار المصنفین کے ماموں بھی تھے۔ کھانے کی میز پر نمکین اور میٹھے کھانوں کی وہ تعداد و تنوع کہ مہمان کے ہاتھ کی رسائی سب کھانوں تک دشوار! ۲ بجے چائے نوشی اور یہاں کی تاریخی مسجد کی زیارت

کرانے کے بعد ان مخلصوں نے اس طرح رخصت کی اجازت دی جس طرح اپنے کسی عزیز کو رخصت کیا جاتا ہے۔ وہ کہئے شروع میں ہی ان حضرات کو شدید تاکید کردی گئی تھی کہ جلوس۔ جلسہ، تقریر، نعرے وغیرہ کا شائبہ بھی نہ آنے پائے وہ احتیاط کام آئی ورنہ جوش محبت یہاں خدا معلوم کیا کچھ کر کے رہتا۔ راستہ میں بے پناہ و ناگہاں بارش کے مزے اٹھاتا ہوا ۱۲ بجے سڑک پر پہونچ گیا جہاں موٹر تین چار گھنٹہ قبل چھوڑ گیا تھا۔ حضرت گیلانی کے چھوٹے بھائی سید مکارم احسن خوب مستعدی کے ساتھ یہیں مل گئے اور ان کی رہنمائی میں صبا رفتار موٹر نے بات کہتے گیلانی کے لب سڑک قبرستان پہونچا دیا۔

"قبرستان"، جی ہاں! نہ کوئی گنبد! نہ کوئی مقبرہ نہ کوئی حجرہ نہ کوئی چبوترہ نہ اونچی پکی قبروں کی قطار نہ کوئی در و دیوار ایک بڑے طویل و عریض باغ میں، خاندان والوں کی دو ایک کچی تربتیں بس یہ کل کائنات اس گورستان کی اس سڑک سے چند منٹ کے فاصلہ پر کھلے ہوئے آسمان کے نیچے مولانا کا مزار پُرانوار.... یعنی مٹی کا ایک ڈھیر، جس کے نیچے جدا خاکی اس مردمومن کا ابھی آرام میں ہے۔ جو وقت کا زبردست فاضل معقول و منقول کا جامع، شریعت و طریقت دونوں کا راز داں، ایک بہترین خطیب ایک بہترین اہل قلم بیدار دل روشن دماغ، مورخ، محقق، شاعر، عارف سب ہی کچھ تھا اور ابھی کل تک جیتا جاگتا اور دوسروں کے دلوں کو زندہ رکھے ہوئے تھا! ــــ دن گذرتے کیا دیر لگتی

ہے ابھی پانچ سال ادھر کی بات ہے یہی برسات کا موسم تھا کہ جولائی ۱۹۵۲ء
میں مولانا اسی باغ میں اپنے اس نیازمند کو سیر کرانے لائے تھے۔ اس کے دریافت
کرنے پر اپنے والد مرحوم کی قبر بتائی تھی، آج اسی کے مزار پر ایک گرفتار قید عنصری
کی حاضری تھی، بارش مسلسل جاری تھی۔ اس پر ہٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا، جو کشش
جو جاذبیت جو محویت زندگی میں تھی اس کا ظہور اس وقت بھی ہو رہا تھا زیر لب
نیم مضطر حالت میں جو دعائیں التجائیں مخاطبے ہوئے وہ اب سب کہاں یاد اتنا
یاد ہے کہ آنسوؤں کے تار کے ساتھ کچھ اس قسم کی صدائیں زیر لب و زبان ٹکراتی
رہیں۔

"دلوں کے دیکھنے والے اور سینوں کے اندر کی خبر رکھنے والے!
اپنے دین کے اس دیوانے کو اپنی بہترین نعمتوں اور بخششوں سے سرفراز فرما۔
اس نے اٹھتے بیٹھتے اپنے کو تیرے دین اور تیرے پیمبر کی عزت و ناموس
کے لئے وقف کر رکھا۔ تو اسے وہ صلہ دے جو اس کے خیال میں بھی نہ آیا
ہو۔ ہاں ہاں اسے اپنی رحمتوں اور سرفرازیوں سے نواز دے! اور
اس نیک اور پاک روح کے طفیل میں ہم لوگوں کا بھی بیڑا پار کر دے جو
جو اس سے محبت کا دم بھرتے تھے۔ بداں را بنیکاں ببخشد کریم، بڑے
بڑے عارفوں کا مقولہ ہے کرم میں کون تیرا مقابلہ کر سکتا ہے اور تو اپنے
عارفوں کی بات سچ ہی کر دکھاتا ہے۔"

۔ ۵ر اگست ۱۹۵۷ء مزار سے اٹھ کر مکان پر آئے چند ہی قدم کا تو فاصلہ تھا۔ وہ کمرہ دیکھا جہاں مولانا کا پلنگ بچھا رہتا تھا سید مکارم سلمہٗ نے ہر چیز حتی الامکاں اسی طرح رہنے دی ہے جیسے مولانا کے حیات میں تھی، چائے پلوائی بانی میں شرابور کپڑے آگ میں جلد جلد خشک کرا دیئے باتیں زیادہ مولانا ہی کی کرتے رہے۔ اس سب کے باوجود کچھ زیادہ جی نہ لگا، طبیعت پر وحشت ہی غالب رہی۔ مکان بغیر مکین کے لطف ہی کیا رکھتا ہے۔ بلبل خوش نوا اڑ چکا تھا اور خالی پنجرہ میں اب کیا رکھا تھا۔ ا جی لگنے کی جگہ تو اب تو وہی کچی مٹی کی ڈھیر رہ گئی تھی اس پختہ مکان میں اب کیا تھا؟ —— بالکل ویسا ہی تاثر حضرت تھانوی کی وفات کے بعد تھانہ بھون جا کر پیدا ہوا تھا، خانقاہ وغیرہ کہیں جی نہ لگا، جی پھر کہیں لگا تو اسی شیخ وقت کی کچی تربت پر حاضری دے کر۔ ۵ بج رہے تھے کہ یہاں عصر کی نماز ادا کی مُعاودا پسی۔ ۰ہ میل کا سفر درمیان میں ایک مسجد میں نماز مغرب اور حکیم صاحب کی تحریک پر متعدد مقابر پر فاتحہ خوانی۔ کوئی ½ ۹ بجے کا وقت ہوگا کہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ معًا اطلاع ملی کہ مولوی ریاست علی ندوی منتظر ہیں پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ قدیم رفیق دار المصنفین اور سب سے بڑھ کر اپنے سابق میزبان ان بیچارہ اطلاعی و معذرتی خط آج دوپہر کو کہیں جا کر ملا۔ ایک ہفتہ قبل کا چلا ہوا! وقت سے مل گیا ہوتا تو کیا ان کا نمبر ہمہ وقتی رفاقت میں حکیم صاحب سے کچھ کم رہتا!

پٹنہ ۸۱ر اگست آج قیام کا آخری دن تھا۔ اور آج کا سفر بھی مختصر ہی تھا۔ یعنی صرف پھلواری شریف تک جو چند ہی میل کے فاصلہ پر ہے۔ لیکن حکیم صاحب اور مولوی ریاست علی کی رائے ہوئی کہ جب وقت میں گنجائش تو پہلے تاریخی اور مشہور قصبہ منیر جہاں کے شیخ شرف الدین یحییٰ کے مکتوبات طالبان سلوک وتصوف کے لیے ایک مرتبہ استناد رکھتے ہیں۔ کی زیارت بھی کیوں نہ کرلی جائے۔ مشورہ پر عمل ہوا دوپہر ہو رہی تھی کہ ہم لوگ حدود پھلواری میں داخل ہو گئے اور محبتوں کا چمن جیسے شگفتہ ہو گیا ــــ پہلی منزل شاہ غلام حسنین ندوی کے ہاں کی تھی یہ ان قاری شاہ سلیمان پھلواری کے جانشیں اور خلف الصدق ہیں جن کی شعلہ بیانی کی دھوم ہندوستان بھر میں مچی ہوئی تھی اور جنھوں نے خود پھلواری کی شہرت کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا تھا۔ شاہ صاحب سے صوری ملاقات غالباً پہلی بار ہوئی۔ گو خاندانی تعلقات ان سے دو ایک پشت سے قبل سے ہیں۔ ملنے پر وہ صدق نوازی میں اپنی نظیر آپ نکلے مطلق مدح وداد دالے اور بہت سے حضرات ہیں۔ لیکن جس باریک بینی اور دقت نظر سے انھوں نے صدق کے خصوصیات گنوائے۔ اس نے خود مدیر صدق کو بھی دنگ کر دیا۔ یہاں امیر شریعت صوبہ بہار مولانا منت اللہ رحمانی سید انوار احمد ایڈوکیٹ قاضی احمد حسین ام۔ ال۔ اے اور نائب امیر شریعت اور جوہر نظامی اور بہت سے حضرات سے ملاقات ہوئی اور غالب نے سب سے زیادہ تاثر ایک وزیر ریاست

شاہ محمد عزیز منعمی سے قبول کیا۔ ان کی سادگی بے تصنعی، اسلامیت کسی طرح یقین نہیں آنے دیتی تھی کہ یہ منسٹر کے عہدہ پر ہیں۔ چہرہ پر خاصی بھری داڑھی کیا کم تھی کہ انہوں نے اپنے لڑکے سے ملایا جسے وہ حفظ قرآن کرا رہے ہیں اور کسی دینی درس گاہ میں داخل کرا کے بجائے وکیل، بیرسٹر، انجینیر، ڈاکٹر ڈپٹی، منصف، کلکٹر وغیرہ کے مولوی بنانا چاہتے ہیں، حفظ قرآن کی فضیلت اور اجر بے حساب کے سلسلہ میں جتنی حدیثیں وارد ہوئی ہیں وہ تو اب صرف عوام کالانعام، کے لیے اور ان کے لیے بھی مشکل سے رہ گئی ہیں، ورنہ اونچے طبقہ میں اب کون "احمق" باقی رہ گیا ہے جو ترقیوں کے بیشمار امکانات چھوڑ چھاڑ اپنے فرزند دلبند کو "ملاّ اور حافظ بنانے کا خواب دیکھے! ایک کامیاب کارگزار اور مقبول خاص وعام منسٹر سے آج اس ذہنیت کا ظہور اگر اس کی کرامت قرار دی جائے تو شاید زیادہ مبالغہ نہ ہو!

دعوت حسب توقع خوب پرلطف تھی اور تکلف میں اگر کچھ کسر باقی رہ گئی تھی تو اسے کھانے کے بعد کی دو دسترخوانی تقریروں نے پورا کر دیا۔ ایک تقریر شاہ عزیزالدین ندوی کی ہوئی، جو قاری شاہ سلیمان کے نواسہ ہیں اور اپنی ذات سے محبت کے پتلے۔ اور دوسری تقریر منسٹر صاحب کی ـــــ خدا معلوم اتنا حسن ظن بعض لوگوں نے اپنے دلوں میں کہاں سے

پیدا کرلیا! دعوت کے بعد مختصر سی حاضری دفتر امارت شرعیہ میں ہوئی۔ اور پھر نماز ظہر کے بعد وقت مشائخ پھلواری کی دوسری شاخ خانقاہ مجیبیہ والوں کے ہاں کے لیے آگیا۔ یہاں کے سجادہ شاہ امان اللہ قادری سلمہٗ گو بہ لحاظ عمر ابھی نوجوان ہی ہیں۔ لیکن فرط اخلاق وکرم میں بڑے بوڑھوں کے ہم سن اللہ ان کی صلاحیتوں کو بہتر سے بہتر کام میں لائے مل کر جی خوش رہا۔ رہے قاضی امارت شرعیہ شاہ عون احمد سلمہٗ تو ان کے اخلاص نے پہلی بار (۱۹۵۲ء میں) بھی شرمندہ کیا تھا اور اب کی تو شرمندہ تر رکھا۔ پرسوں اسٹیشن پر لینے گئے تھے آج بھی پیشوائی کو پھلواری میں وہی سب سے آگے موجود اور پھر اس وقت چائے کے ساتھ پر تکلف ناشتہ سے خاطر کر رہے ہیں حقیقی چھوٹے بھائی علیل اور یہ اُن کی تیمارداری میں مصروفیت کے باوجود مجھے درگاہوں اور مزارات پر لے جانے کے لئے پورا وقت نکالے ہوئے تیار ہیں۔ ان کے والد ماجد شاہ نظام الدین صاحب سے بھی نیاز حاصل رہا۔ اور شاہ عثمان غنی سابق مدیر "نقیب" سے بھی ملاقات رہی۔

عصر سے قبل ہی واپسی ہوگئی اور شہر پٹنہ کے اندر سے گزرتے ہوئے مولوی ریاست علی سلمہ کے مکان پر اور حکیم صاحب کے مطب میں اور شہر کے مشہور ڈاکٹر، ڈاکٹر عبدالحیٔ کے یہاں جو اب ماشاء اللہ حاجی اور صاحب ریش بھی ہیں) سید نظیر حیدر ایڈیٹر "صدائے عام" اور

اور ایک علیل صدق نواز انیس الحق فخر الدین کے ہاں کھڑی سواری حاضری دیتے ہوئے قبل مغرب گورنمنٹ ہاؤس پہنچ گئے اور یہیں کچھ دیر بعد منسٹر شاہ محمد عزیر نے کرم فرمایا۔ کھانے کا وقت کا معمول ۸ بجے شب کا ہے لیکن واپسی کی گاڑی چونکہ نو کے قریب تھا معزز میزبان نے مہمان کی سہولت کی خاطر آج کا کھانا ۷½ ، ہی پر کر دیا۔ بہ اطمینان گفتگو کا ایک اور موقع مل گیا اس کے بعد ایک ڈرائنگ روم میں ساتھ ساتھ آکر وہیں منسٹر صاحب کو اور میرے ملنے والوں کو بلالیا اور خود بھی بے تکلف شریک گفتگو ہوگئے ٹھیک ۸ بجکر ۵۲ منٹ پر اے ڈی سی صاحب فوجی قاعدہ کے ساتھ آموجود ہوئے اور موٹر پر بیٹھ کر جب تک ہم لوگ روانہ نہ ہولیے گورنر صاحب سامنے کھڑے رہے ــــ "لاٹ صاحب" کے نام کے ساتھ کبھی یہ تخیل بھی وابستہ ہوسکتا تھا؟

پابندی وقت کا نظم اس حد تک قائم رہا کہ عین جس وقت ہم لوگ ریل کے پل کے اوپر سے نیچے گاڑی آتی ہوئی گزری اے ڈی سی کی موجودگی میں جگہ ملنے میں کسی زحمت کا سوال ہی نہ تھا اسٹیشن تک حکیم صاحب مولانا ریاست علی شاہ عزیز سید انوار احمد جناب بیدل سب آئے گاڑی چھوٹتے وقت بیدل صاحب نے ایک بند لفافہ دیا۔ آگے چل کر جو اسے کھولا تو اندر سے صدق کے ۵ خریداروں کا سالانہ چندہ برآمد ہوا۔ میزبان کے ذاتی ملازم اسحاق کی سلیقہ مندی

تمیز داری ذوق خدمت سے اس ڈھائی تین دن میں بڑی ہی راحت
پہنچی ان کے شکریہ کا کوئی اور موقع نہ ملا تو کم سے کم خاتمہ تو اسی ذکرِ خیر
پر ہونا چاہیئے ۔ (صدق جدید اگست ۱۹۵۷ء)

۴

بھوپال

دو دن بھوپال میں (۱۴ مارچ ۷۳ء)

سفر خصوصاً دور کا سفر کرنے کی نوبت اب بہت ہی کم آتی ہے۔ پھر بھی سال میں اچھی خاصی آ ہی جاتی ہے اور ہر سفر سے کچھ نہ کچھ کام اور تجربہ کی باتیں سبھی طالب علم کو ہاتھ آ ہی جاتی ہیں۔

فروری کا اخیر ہفتہ تھا کہ بھوپال سے مولانا محمد عمران خاں ندوی کے ایک عزیز خاص یہ پیام لے کر بھوپال سے دریاباد آئے کہ تاج المساجد کا شمالی دالان جو اخیر دسمبر ۱۹۷۱ء سے زیر تعمیر تھا اور جس کا سنگ بنیاد شیخ محمد یوسف نائب سفیر سعودی عرب اس وقت رکھ گئے تھے۔ اب تکمیل کو پہنچ چکا ہے، ۳، اور ۴ مارچ کو اس کے افتتاح کے لیے موجودہ سفیر سعودی عرب یوسف انس یٰسین بھوپال میں موجود ہوں گے، دو دن کے لیے آجاؤ۔ اپنا پیغام لکھ کر لاؤ یہاں سنا دینا اور پھر تار بھی ایک نہیں دو دو اسی مفہوم کے وارد ہو گئے۔

تاج المساجد کی وسعت وعظمت کا لوگوں کو اندازہ نہیں ہندوستان موجودہ کی سب سے بڑی اور عالی شان مسجد ہے۔ یہاں تک کہ دہلی کی جامع مسجد اور حیدرآباد کی مکہ مسجد سے بھی بڑی۔

دالان ایک یا دو ہی نہیں، چار چار جن میں بارہ صفیں باآسانی آسکیں اور صحن تقریباً سوا تین سو فٹ کی لمبائی اور چوڑائی کا (نصف صحن ابھی ناتمام ہے) اور پھر درس گاہ بھی اس کے علاوہ، غرض یہ مسجد نام ہی کی نہیں واقعی

ہند ہی مسجدوں کی سرتاج۔ داعی جلسہ خان صاحب کی شخصیت معمولی نہیں خصوصی بلکہ کہہ لیجئے کہ غیر معمولی، فرمائش کی تعمیل سے انکار نہ بن پڑا۔ سفر کا تصور ہی تکلیف دہ ودحشت انگیز ہوتا ہے جسمانی و مادّی حیثیتوں سے بار تو پڑتا ہی ہے معنوی و فکری زحمتیں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر، لکھنے پڑھنے کا ہرج تمامتر، ڈاک کا انبار واپسی پر بٹا نامستزاد، دعوت و داعی دونوں کی اہمیت نے عذرات ساقط کر دیے۔

لکھنؤ سے روانگی صبح ۴ مارچ کو ساڑھے سات بجے کو ہوئی۔ کانپور اور جھانسی، دو اسٹیشن بڑے پر تاثیر ثابت ہوتے ہیں۔ مرحومہ رفیق حیات کے وطن شہر باندا اور پھر مدفن کی راہیں انھیں دونوں مرکزی اسٹیشنوں سے جاتی ہیں۔ اب کیا بیان ہو (اور کسی کو اس کے سننے میں لطف ہی کیا آئے گا) کہ جب دونوں اسٹیشنوں سے گزرنا ہوتا ہے تو جذبات میں تلاطم کیسا برپا ہو جاتا ہے

زرا عمر رفتہ کو آواز دینا

کو پکار کر اور چیخ کر پڑھنے کے لیے دل کیسا تڑپ تڑپ کر رہ جاتا ہے۔

بھوپال مدفن خدا معلوم کتنے عالموں فاضلوں اور درویشوں کا ہے اور حال کے بزرگ شاہ محمد یعقوب مجددی نے تو واقعی اسے بھوپال شریف ہی بنا دیا تھا۔ بارہ گھنٹے کے مسلسل سفر کے بعد پونے ۸ بجے رات کو پہونچ گئے دیکھا تو لینے والوں میں میزبان صاحب بھی ہیں۔ خوشگوار مسرت کے ساتھ سوال کیا

کہ اس درجہ علالت اور بلیڈ پریشر (فشار دم) کے مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود اسٹیشن آنے کی زحمت فرمائی۔ فرمایا بحمد اللہ اب اچھا ہوں۔

قیام بجائے خاں صاحب کے ذاتی مکان کے تاج المساجد کے مہمان خانہ میں رہا اور دن بھر ملنے ملانے میں گزرا، سفیر صاحب شہر کے اعلا ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ شامی الاصل انس یوسف یسین صاحب، جوان بلند قامت، عہدہ و منصب کے لحاظ سے "افغیٔ صاحب"، ہونا ہی تھا لیکن بحمد اللہ کہ مسلم مجلسوں اور مجموعوں میں خالص عرب لباس پہن کر آئے اور باوجود اردو سے ناواقف ہونے کے ایک ایک سے جھک کر ملتے اور کہیں انگریزی سے کہیں عربی سے کام پوری طرح چلا لیتے۔ تواضع وانکسار اور خندہ جبینی سے دل ہر ایک کا موہ لیتے۔ مہمان ہو کر میزبان بھی بن جاتے اور عرب مہمان داری کے اقتضار سے ہر ایک کو قہوہ پیش کرتے۔

سفارت کا عہدہ ایک نازک سیاسی عہدہ ہوتا ہے، اسلامی سلطنت کے نمائندہ کی حیثیت سے ہاتھ اسلامی ہند کی نبض پر رکھنا اور زبان پر سیکولرزم کی مہر لگی رہنا، اسلامی اخوت اور سیاسی مصلحت بینی کا آمیزہ ہر وقت بنے رہنا اور یہ کام ہر ایک کا ہو بھی نہیں سکتا۔

ہر ہوسنا کے ندا ند جام وسنداں باختن

گیارہ بجے مسجد کی زیارت کو آئے خوب گھومے پھرے اوپر نیچے ہر

منزل کو دیکھا اور میزبان اپنی علالت کے باوجود ہر جگہ رفاقت کا حق ادا کرتے رہے۔

اپنے مخلص و عزیز متعدد بھوپال میں ہیں، کچھ ابکی نئے ملے۔ ایک مدرس دارالعلوم مولوی شرافت علی بڑے صاحب فہم نکلے اور قاضی وجدی حسنی تو ہمدم قدیم تھے ہی۔ نواب صابر علی خاں (والیٔ محمد گڑھ) اپنی وضعداری نباہتے ہوئے ملے۔ مولوی محمد مسلم "دعوت" دہلی کے ایڈیٹر کا وطن بھوپال ہے۔ ان کی لڑکی کا عقد بھی اتفاق سے اسی دن تھا۔ ان کے ساتھ وقت جتنا کٹا خوب کٹا اور مقامی صحافیوں الحمراء، افکار وغیرہ کے مالکوں نے بھی اس پردیسی کی خاطرداریوں اور عزت افزائیوں میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھا، اور اردو ادبیات کے دو طالب علم ایک سیفیہ کالج کے عبدالقوی دسنوی اور ایک حمیدیہ گورنمنٹ کالج کے ابومحمد سحر تو ان سے بھی بڑھ کر اپنے لوگ نظر آئے ——— باقی ایک بڑی جماعت حیدرآباد و مدراس کی طرح ایسے آنے والوں کی بھی ملی جو سرتاسر حسن عقیدت کا شکار اور غلو کے مارے ہوئے۔ اگر جم جانے والے اور اس طرح مراقب سر جھکائے آنکھیں نیچی کئے اور لب پر مہر لگائے جیسے میں کوئی شیخ وقت ہوں اور یہ مجھ سے درس سلوک و معرفت کا لینے آئے ہیں، بارہا اسے صاف کر چکا ہوں اور آج ایک بار پھر اس کو صاف کر رہا ہوں کہ حسن ظن کی بھی ایک حد ہونا چاہیئے حلف شرعی کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نہ کوئی

"عالِم اجّل" ہوں نہ کوئی پیر روشن ضمیر محض ایک متعلم ہوں اور وہ بھی منتہی نہیں مبتدی قرآنیات کا اور اپنی زبان کے ادبیات کا بڑا ہی شکرگزار اور احسان مند ہونگا ان حاضر و غائب کرم فرماؤں کا جو مجھے اپنی جگہ پر رہنے دیں گے اور کسی خوش فہمی میں نہ خود مبتلا ہوں گے نہ کسی اور کو مبتلا کریں گے۔

سب سے زیادہ تاسف فوٹوگرافی کے زور پر رہا اور اس مہذب خبط پر بڑا ہی دل کڑھا۔ بجائے خود یہ مرض اب نہیں کہاں ہے؟ لکھنؤ میں بھی خاصا زور ہے لیکن بھوپال کا نمبر اس سے کہیں بڑھا ہوا پایا۔ بعض بعض جلسوں میں ہر ہر منٹ پر ایک نئی تصویر کھینچتی یہ خوش تمیز تصویر اتارنے سے قبل نہ اجازت کی ضرورت سمجھتے اور نہ اطلاع کی۔ جان نہ پہچان ایک صاحب میرے کمرے میں گھس آئے اور قبل اس کے کہ میں ان کی آمد کی غرض سمجھ سکوں جھٹ فوٹو اُتار چلتے بنے۔ اس درجہ بے تکلفی، واللہ اعلم مغرب یا مشرق کہاں کی تہذیب ہے اور کہاں یہ ہے کہ مسجد تک میں ذرا بھی اس سے احتیاط نہیں فوٹوگرافی کے گناہ کبیرہ ہونے کا تو میں خود بھی قائل نہیں۔ لیکن بہرحال اس کا روادار نہیں کہ اسے ثقافت اسلامی کا جزو بنا لیا جائے یا اسے جائے پان، شربت کے درجہ پر پہنچا دیا جائے۔ حیرت اور ناگواری اس پر اور بھی ہوئی کہ اچھے اچھے اہل علم موجود تھے لیکن زید بکر میں بھی منع کرنے پر تیار نہ تھے ——— اور کچھ ایسی ہی زیادتی کھڑے کھانے کی رہی۔ گو میزبان کی خاطر اس درجہ میں بھی عزیز نہیں کہ اس کے

مذاق طبیعت کو سمجھ لیا جائے تو اسے مدعو کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی! اب نام اس سلسلہ میں کس کس کے لئے جائیں ۔

بیگم صاحب بھوپال (سابق ہر ہائی نس) نواب حمید اللہ خاں کی صاحبزادی (بیوہ نواب صاحب پٹودی) کے یہاں ۴ مارچ کی دوپہر کا لنچ ایک عبرت ناک نظارہ تھا۔ بیگم صاحب سے ۱۹۷۵ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ میں اس کی جوبلی کے موقع پر نیاز حاصل ہو چکا تھا۔ بیوہ اس وقت بھی تھیں اور ریاست قبضہ سے نکل اس وقت بھی چکی تھی۔ پھر بھی بد اقبالی جب تک اس درجہ حاوی و مسلط نہیں ہوئی تھی (اور اقبال کے لفظوں میں۔

..... پریدہ رنگ ورمیدہ بو

کا ظہور اس وقت اس درجہ مکمل نہیں ہوا تھا۔ لق و دق ایوان شاہی میں سناٹا پڑا ہوا تھا، خیال تھا کہ دربان اور پہرہ دار قدم قدم پر ملیں گے، کوئی ایک بھی نہ ملا، البتہ ایک میجر فضل صاحب تھے جو شاید نواب مرحوم کے زمانہ میں اے۔ ڈی سی تھے، سابق ریاست و امارت کی یادگار رہی ایک تھے ؎

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

شاہی تکلفات کھاتے میں اور کھانا کھلانے والے خادموں میں البتہ نمایاں

تھے۔ مہانوں میں میزبان سفیر صاحب کے مرتبہ کی مناسبت سے اونچے حکام بھی متعدد تھے۔ سننے میں آیا کہ والیان ریاست کے ساتھ جو بدعہدی گاندھی جی کے نام لیواؤں کی طرف سے ظاہر ہوئی اس سے ملول و شکستہ خاطر ہو کر اب بیگم صاحبہ قصر و ایوان فروخت کرنے والی ہیں اور برائے سرکاری مہمان خانہ میں منتقل ہو رہی ہیں۔

کچھ اپنی کاہلی اور کچھ محض حسرت نصیبی کہ حضرت محمد یعقوب مجددی کے مزار تک اس بار رسائی نہ ہو پائی اور حاضری ہوتا کیا معنی وہاں کا خیال تک نہ آیا۔ ـــــ یہ کل کائنات تھی اپنی عقیدت مندی کی۔

دو دن اور تین راتیں گذار کے ۸ مارچ کو صبح ۸ بجے واپسی کے لئے ٹرین پر بیٹھا، خاں صاحب میزبانی کی دھن میں سخت سے سخت تعب برداشت کرتے رہے۔ بار بار لمبے اونچے زینوں پر چڑھتے اترتے اور ڈاکٹروں کی ہدایتوں کی مسلسل خلاف ورزی کرتے رہے، نتیجہ یہ نکلا کہ پانچ کی شب میں انھیں سخت قسم کا دورۂ غشی پڑ گیا، ڈاکٹروں نے دیکھ کر کہا کہ خطرہ ٹل گیا، ورنہ دورہ تھا بہت شدید قسم کا۔

مخلصوں میں سے دو صاحبوں کے نام چھوڑے جا رہا تھا اور یہ ان دونوں کے حق میں ناانصافی ہوتی۔ ایک تو آفتاب الدین صاحب پہلے اسمبلی کے ممبر رہ چکے ہیں، دوسرے صاحب کا نام بڑے "سر مغزن" کے بعد آپ جاکر یاد

پڑا۔ مولوی عبید اللہ کوٹی ندوی ثم دیوبندی یہ اب یہیں دارالعلوم میں مدرس ہیں اور صاحب علم ہیں۔ دونوں دن ملا کر کئی گھنٹے کی ہم نشینی رہی، اور طبیعت پر ذرا بھی بار نہ پڑا، ایسے صاحب فہم ہم نشیں بس قسمت ہی سے ملتے ہیں۔

———— (صدق جدید ۱۶ مارچ ۱۹۶۳ء)

حیدرآباد

دکن! یعنی کیا؟

دکن سے مراد سمت جنوب نہیں مملکت دکن یا ریاست حیدرآباد ہوتی تھی۔ کان اس کے سننے کے، آنکھیں اس کے پڑھنے کی، دل اس کے سمجھنے کا عادی۔ جی نہیں مانتا کہ اس پرانی، محبوب دل پسند اصطلاح کو یکلخت چھوڑ دیجیے۔ اور کسی نئی سیاسی، کسی نئی جغرافیائی اصطلاح کو زیب عنوان بنانے لگیے!

ایک تمنا جو پوری ہوئی

زیارت حیدرآباد کی تمنا ایک آدھ سال سے نہیں برسوں سے چلی آرہی تھی ــــ اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی مانع قوی، عزم میں حائل ہوتا گیا۔ آخری بار آمد ایک خانگی تقریب سے اکتوبر ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی ــــ پورے ۲۵ سال بعد اکتوبر ۱۹۶۳ء میں خواب کو پورے ہونے کا موقع نکلا۔ درمیان میں ایک بار حاضری، فروری ۱۹۵۸ء میں دن کے

چند گھنٹوں کے لئے ہوئی تھی، لیکن اسے حاضری کہنا ہی صحیح نہیں وہ تو مدراس سے لکھنؤ کی واپسی تھی براہ حیدرآباد اس لئے اس ذکر ہی کو سرے سے القط کیجیے۔ یہاں پہلی بار آنا بہ صد شوق و اشتیاق، ستمبر ۱۹۱۷ء میں ہوا تھا، سررشتہ تالیف و ترجمہ کے رکن کی حیثیت سے اور گویا گیارہ مہینے جم کر رہنا بھی ہوا تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی ابھی باقاعدہ وجود میں نہیں آئی تھی۔ اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ اور بہ طور تمہید یہ نیا ادارہ سر اکبر حیدری، سر راس مسعود اور بابائے اردو عبدالحق کی سرپرستی میں قائم ہو چکا تھا اس کے بعد بھی بارہا آنا ہوا۔ اور ایک آدھ قیام بھی دنوں کا نہیں ہفتوں کا رہا۔ ۲۵ سال کا وقفہ کوئی معمولی ہوا ہے جوان بوڑھے ہو گئے اور جو ۴۶ سال کا ادھیڑ تھا وہ ۷۰، ۷۱ سال کی عمر کو پہنچ چکا!

آغاز سفر

تقریب سفر اب کی بھی بالکل خانگی ہی تھی، اور اب سفر عموماً نجی ہی کے ہوتے ہیں۔ قومی اور پبلک جلسوں میں شرکت کا معمول سالہا سال سے ترک ہے۔ صدق نوازوں اور دوسرے کرم فرماؤں کے خط پر خط اس ساری مدت میں برابر پہنچتے رہے کہ فلاں یوم منایا جا رہا ہے۔ فلاں کی سالگرہ ہے۔ فلاں کی برسی ہے، فلاں ادبی کنونشن ہے، فلاں دینی کانفرنس

ہے اور کبھی کبھی تو دعوت نامے تار پر پہنچے اور خواہش ہوائی جہاز سے سفر کی کی گئی۔ فرمائش کرنے والے مخلصوں کو

بے خبر بودند از حال دروں

کے مصداق اس کی کیا خبر کہ ان خطوط پر اصرار کرنے کا اثر ہمیشہ الٹا ہی پڑا، بلکہ طبیعت میں انقباض ہی پیدا ہو کر رہا۔ یہ حضرات ذرا بھی غور نہیں کرتے کہ اگر ایک بار بھی کسی پبلک جلسے کے لئے قدم باہر نکالا، تو پھر قومی دینی جلسوں کی کوئی حد و نہایت ہے؟ ہر جلسہ اپنی جگہ اہم اور ضروری، وطن کی واپسی ہی دشوار ہو جائے گی اور صدق کا ہی نہیں، کہنا چاہیئے کہ تحریر کا سارا ہی دفتر بند کر دینا ہو گا۔ تصنیف و تالیف کا کام ہمہ وقتی مطالعہ چاہتا ہے۔ اور پورا سکون خاطر۔ سفر کی ناہمواریاں خلقت کا ہجوم، تقریری ہیجان یہ سب اس کے لیے جو گویا اب مقصد حیات بن چکا ہے، زہر قاتل! کسی بزرگ کی زیارت کرنی ہوئی یا کسی عزیز کی عیادت، یا کسی محدود اور چھوٹی سی کمیٹی میں شرکت، بس یہی لے دے کے دو ایک صورتیں ہیں جو اس ترک سفر کے عہد میں استثناء کی گنجائش پیدا کر سکتی ہیں ــــ تقدیر الٰہی نے ایسی ہی ایک صورت اخیر ستمبر میں پیدا کر دی اور ڈھائی ہفتہ کا پروگرام بنا، ۲۷ر ستمبر کو صبح سویرے لکھنؤ سے حیدرآباد کے لئے رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْنِیْ مِن لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا ۝ پڑھتا ہوا ریل کے ڈبے میں داخل ہو گیا۔ گھوڑے پر کہ وہی ایک زمانہ میں بہترین

سواری تھی، سوار ہوتے وقت تک کی دعا ما ثور کتابوں میں یہ آیت قرآنی پڑھی تھی۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ	پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لئے تابع کر دیا اس (سواری) کو ورنہ ہم تو ایسے تھے نہیں۔ کہ ہم قابو میں کر لیتے اس کو

اور گھوڑے کی تسخیر سے کہیں بڑا اعجوبہ تو ریل اور انجن کی تسخیر ہے اور گھوڑے کی سواری پر یہ آیت کا محل اگر ایک بار پڑھنے کا تھا تو ریل پر پڑھنے کا تو بار بار۔

افسوس ہے (اور حیرت بھی) کہ ملک کے دو ایسے اہم صوبائی دارالحکومتوں کے درمیان جیسے کہ حیدر آباد اور لکھنؤ ہیں. کوئی سیدھا اور براہ راست ریلوے رابطہ نہیں۔ دہلی سے آگرہ جھانسی ہوتے جو سیدھی ٹرین (جی، ٹی ایکسپریس) مدراس کو جاتی ہے۔ اس میں دو سیدھی بوگیاں حیدر آباد کے لئے ہوتی ہیں. جو قاضی پیٹ میں کاٹ کر حیدر آباد کی ٹرین سے جوڑ دی جاتی ہیں، لیکن اس سے لکھنؤ والوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ انہیں وہ سیدھی حیدر آباد والی بوگیاں کہیں جھانسی پہنچکر ملتی ہیں۔ اور وہاں وہ گاڑی رات کو بہت ہی ناوقت ملتی ہے۔ اس وقت گاڑی بدلنا ٹکٹ خواہ کسی درجہ کا ہو، بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس لئے لکھنؤ والے اپنی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ بمبئی والی گاڑی پر لکھنؤ سے سیدھے اٹارسی چلے

جائیں۔ اور وہاں سے دن کے وقت حیدرآباد والی گاڑی پر بیٹھیں۔ اپنے کو مناسب یہ معلوم ہوا کہ لکھنؤ سے صبح سویرے بمبئی والی گاڑی پر چل کر ۸ بجے شب کے بعد بھوپال اُتر لیا جائے۔ اور رات بھر وہاں رہ کر صبح سویرے حیدرآبادی بوگی میں بیٹھ کر روانہ ہوجایئے۔ بھوپال جنکشن کے ویٹنگ روم، ریٹائرنگ روم خوب گنجائشی اور جاذب نظر پھر اپنے دو ایک ذی اثر عزیز بھی وہاں موجود اور سب سے بڑھ کر مولانا عمران خان ندوی، مہمان داری کے لیے موجود ہی نہیں، میزبانی کے لیے ہر وقت مستعد و کمربستہ۔ رائے یہی طے پا گئی، اور مکین کے مکان موسوم بہ "غریب خانہ" کو اپنا "کاشانۂ شب یا رین بسیرا" تجویز کرلیا۔

غریب خانہ

۲۷ کو عشاء کا وقت ہوچکا تھا کہ بمبئی میل بھوپال اسٹیشن میں داخل ہوا پلیٹ فارم پر خان صاحب مع اپنے خدم وحشم کے نظر پڑ گئے۔ ہاتھوں ہاتھ سامان اتروا ایک بڑی سی جیپ گاڑی پر بٹھا بات کی بات میں اپنے غریب خانہ پہنچادیا۔ غریب خانہ کے نام سے تخیل کیا ذہن میں آتا ہے؟ یہی نہ کہ تنگ سا ایک آدھ حجرہ، پست سا برآمدہ، دروازے نیچے، انگنائی چھوٹی۔ زمین میں سیلن، بشری ضرورتوں کی جگہیں تاریک اور غلیظ اور عجب نہیں کہ جائے وقوع ایسی گلی در گلی ہو، کہ وہاں تک سواری پہنچنا دشوار۔ غرض یہ کہ وہاں کا قیام درویشوں اور

زاہدوں کے لیے کیسی ہی ایک نعمت ہو، لیکن ہم تن پروروں کے لیے خود ایک مجاہدہ۔ تخیلات کچھ اسی قسم کے تھے، کہ جیپ کا رکھٹ سے عین دروازے کے سامنے آرُکی اور اب جو اُتر کر دیکھا تو "غریب خانہ" کے در و دیوار تک بجلی کی روشنی سے جھلا جھل، خاصہ صحن، خاصہ برآمدہ، خاصہ کمرہ، پرتکلف اُجلا برف فرش، بستر مکلّف گدّے دار، تخت وسیع جانماز و سوزنی سے لیس، حمام اور فلش والے بیت الخلا تک جگ مگ کرتے ہوئے، چپل جوتی، پانی تولیا، صابن ضرورت کی چھوٹی بڑی ہر چیز سے آراستہ، پورا امکان، صفائی کے لحاظ سے آئینہ اور سلیقہ مندی کے لحاظ سے مکین کے حسن انتظام کا آئینہ دار!

گویا جہاں تک مہمان کی راحت رسانی کے جزئیات کا تعلق ہے، یہ ندوی و مصری فاضل اگر سمت علوی کی طرف جائیے تو حکیم الامت تھانویؒ کے مدرسہ میں پڑھے ہوئے، اگر نظر سمت سفلی تک محدود رکھیے، تو یوں کہیے کہ کسی اعلیٰ ہوٹل والے کے یہاں تربیت پائے ہوئے۔ تخیل اور واقعہ میں یہ زمین و آسمان کی نسبت دیکھ، زبان سے اور کچھ تو نہ نکلا۔ سوائے حیرت کے لہجہ میں دہرائے ہوئے اس فقرے کے، کہ "یہی غریب خانہ ہے!" اور دل یہ کہہ کر رہ گیا کہ تواضع و انکسار کے سیاق میں کیسے کیسے ثقہ حضرات تک بھی شاعری سے نہیں چوکتے!

اسلامیت کے نقش و نگار:۔

بھوپال کل تک ایک اسلامی ریاست تھی، حیدرآباد کے بعد شمالی ہند کے مسلمانوں کا بہت بڑا سہارا، خاص شہر کی اسلامیت، دینی علوم کی قدردانی مسجدوں کی رونق، اسلامی عدالتِ قضا، خیرخیرات بندہ نوازی دیتیم پروری سے قطع نظر، باہر بھی چشمۂ فیض کس زور شور سے جاری تھا۔ علی گڑھ، ندوہ وغیرہ ملک کے طول و عرض میں بیسیوں دینی و دنیوی درسگاہوں پر ابرکرم کس طرح جھوم جھوم کر برس رہا تھا۔ کتنے خاندانوں کی پرورش ہو رہی تھی، کتنوں کی پنشنیں اور وظیفے جاری تھے اور آہ آج اسلامیت کے وہ نقش و نگار کہاں سے ڈھونڈ کر لائے اور نکالے جائیں۔ دماغ میں ان خیالات کا گونجنا قدرتی تھا۔ ابھی نماز فجر میں کچھ دیر تھی کہ میزبان جائے اور ناشتہ سمیت موجود! اور دم بھر میں اسٹیشن!

مسلمانوں کے جاہ و جلال کی آخری یادگار!

راستے کے رنگ برنگ منظر بھوپال ہی سے شروع ہو جاتے ہیں۔ دل لبھانے والے بھی اور خوف و دہشت پیدا کرنے والے بھی، زمانے کے نشیب و فراز کی ہو بہو تصویر! اٹارسی آیا، ناگپور گزرا، اور سہ پہر کو واردھا سے گزرنا ہوا۔ یہاں سے گاڑی کا رخ اُلٹا ہو گیا۔ یعنی بجائے مغرب کے مشرق کی طرف چلی۔ یاد پڑا کہ گاندھی جی کی راجدھانی مدتوں یہی شہر واردھا رہا ہے۔

برسوں ہندوستان کی قسمت کے فیصلے یہیں سے صادر ہوتے رہے ہیں، اور سیاسیات آزادی کا رخ یہیں سے پھرا ہے۔ حق ہے کہ اسی شہر کو شمال سے جنوب کے سفر کرنے کا رخ متعین کرنے کا حق حاصل رہے۔! فجر کا وقت سکندرآباد میں آیا۔ اور مرحوم مملکتِ محروسہ سرکار نظام، کے حدود رات ہی میں کسی وقت شروع ہو چکے تھے۔ مرحوم و مغفور سلطنت! ہندوستان میں مسلمانوں کے دور اقبال اور مسلمانوں کے جاہ وجلال کی آخری یادگار! مٹنا اگر مقدر ہو ہی چکا تھا، تو کاش تمام تر غیروں ہی کے ہاتھ سے مٹی ہوتی اور کوئی دخل اس میں اپنوں سے بعض کی نادانی، بے راہ روی، ناعاقبت اندیشی اور بعض کے جبن وبزدلی کو نہ ہوتا!

خوشگوار یادیں

شہر وسلطنت دونوں سے کیسی خوشگوار وکتنی قدیم یادیں وابستہ تھیں، پہلی آمد ۱۹۱۱ء میں اپنی عین جوانی کے زمانے میں ہوئی تھی۔ کن کن ولولوں، کن کن حوصلوں، کن کن آرزوؤں اور تمناؤں سے! اور پھر کیسی کیسی صحبتیں بھی یہاں نصیب ہوئی تھیں۔ اب وہ سارے ارمان اور سارا ساز وسامان ایک خواب وخیال! بابائے اردو عبدالحق، مہاراجہ سرکشن پرشاد، سر افسرالملک سرامین جنگ، مسعود جنگ، عمادالملک، مسز نائیڈو، مفسر قرآن مولانا حمیدالدین فراہی

ابن الحسن فسبلؔ موہانی، سید عبدالمجید دہلوی اور جلیل القدر جلیل فصاحت جنگ، اختر یار جنگ، اکبر یار جنگ، صدر یار جنگ اور کتنے مخلص بزرگ و اعزہ، و احباب سب پیوند خاک ہو چکے! بلکہ ان میں سے اکثر کے تو نام و نشان تک مٹ چکے ہیں۔ بقول شخصے ؎

اب نہ خود ہیں نہ ہیں مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشاں باقی

اب لے دے کے پرانے عزیزوں میں ایک نواب ناظر یار جنگ (پنشنر جج ہائی کورٹ) باقی رہ گئے ہیں کہ انھیں کے خاندان کی کشش اس سفر پر لائی، اور انھیں کی "منزل عدل" (حیدر گوڑہ) میں فروکش ہونا مقصود ہے۔ اور ہاں بہت سے نئے مخلصین کی جو اس درمیان میں آکر اس سرزمین میں رس بس گئے ہیں، اور ان کے علاوہ شخصًا اجنبی صدق نوازوں کی ایک انبوہ در انبوہ تعداد جو محض اللہ کے واسطے، بلا کسی ذاتی غرض کے اپنے حسن ظن سے کام لیے ہوئے۔ اس بے مایہ کے ساتھ رشتہ جوڑے ہوئے اور رابطۂ اخلاص و مودت قائم کیے ہوئے ــــ حقیقت کے اعتبار سے یہ کیسے ہی دھوکے میں پڑے ہوں اور کیسی ہی سادہ دلی سے پیتل کو سونا سمجھ لینے میں مبتلا، بہرحال اجر تو اخلاص و خوش ظنی ہی کے تناسب سے ملتا ہے۔ اور بہتیرے جو گذر چکے (مَنْ قضیٰ نحبہ) ان کے مزار اور تربتیں

تو ابھی فنا نہیں ہوئی ہیں۔ ان خاک کے ڈھیروں پر حاضری تو زندوں کے ملنے جلنے سے بھی مقدم ہے۔

بہادر سردار

اور دکن پہنچتے ہی پہلا پروگرام ان مرحوم مخلصوں، محسنوں، بزرگوں، عزیزوں رفیقوں کی خاکی آرام گاہوں پر حاضری کا تھا، اور سب سے پہلا قدم جو اس سلسلے میں اٹھا، وہ بہادر یار جنگ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی طرف! کیا شخصیت تھی، اور کیا شخص تھا۔ اب ناواقفوں کو کیا بتایا جائے۔ اور جو واقف ہیں انھیں کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ دین و ملت کے لیے ساری زندگی وقف کیے ہوئے اور پھر جوش کے ساتھ ہوش کا غیر معمولی و عدیم النظیر اجتماع! حیدر آباد کی مسلم اور نیم اسلامی سلطنت کا وجود ہی مشیت ربانی کو منظور نہ تھا کہ ایسے کلے ٹھلّے کے توانا و تندرست کو یک بیک ایسے سن میں اٹھالیا، جبکہ کہنا چاہیے کہ وہ جوان ہی تھے ورنہ اس افراتفری اور اس ہولناک بربادی کی نوبت ہی کیوں آنے پاتی، بہرحال ایک نیم رہنما کی رہبری میں بڑی مسافت طے کر، اس حظیرہ تک رسائی ہوئی جس کے اندر اس شہید حق پرستی کا جسد خاکی آسودہ ہے۔ دروازہ مقفل تھا، اس لیے صرف جالیوں سے اندر کا کچھ نظارہ ہو سکا۔ قلب نے لطافت و حلاوت کے ساتھ ساتھ شاہانہ وقار و ہیبت کی بھی کیفیت محسوس کی۔ فاتحہ پڑھا۔ اور

فاتحہ کیا پڑھا، یہ کہیے کہ درد دل کی کچھ تھوڑی سی داستان دہرادی، عرض و معروض عالم تخیل میں کچھ اس قسم کی رہی۔

"بہادر سردار! عین ایسے نازک وقت اپنی خستہ قوم وملت کو بے سہارا چھوڑ کر کہاں چلے گئے۔ یہی تو خاص وقت مخلصانہ حکیمانہ دلیرانہ، رہنمائی کا تھا۔ ہمارا حقیقی رہنما تو وہ تھا جو ہمیں سبق جنگ بدر اور صلح حدیبیہ دونوں کے دے گیا۔ تم اس ہادی بے خطا کے نقش قدم پر چلنا، اپنے لیے مایۂ افتخار سمجھے ہوئے تھے۔ تم ہوتے تو اپنی مومنانہ فراست سے ادھر حیدرآباد کو سنبھالے رہتے، اور اُدھر مسلم لیگ کے بھی بہترین مشیر ہونے کی حیثیت سے پاکستان کو بھی ابتری کی راہ پر نہ پڑنے دیتے، لیکن خدائے بے نیاز سے کس کو مجال گلہ وشکوہ کہ عین وقت پر تمہیں کو اٹھالیا! اپنی ملت کی پستی و ذلت کو یقیناً وہاں بھی نہ بھولے ہوگے، خون کے آنسو اس کے حال زار پر بہارہے ہوگے۔ اور جنت برزخی کی ساری نعمتوں، راحتوں، لذتوں کے باوجود یہ کانٹا دل میں برابر کھٹک ہی رہا ہوگا۔"

مرحوم کی خوش روئی اور خوش خوئی کی تصویر دیر تک نظر کے سامنے رہی۔

ادائے تعزیت میں مرحوم کی ڈیوڑھی پر بھی حاضری ضروری تھی، گیا اور ڈیوڑھی کی سادہ آرائش کو اسی طرح پایا، جس طرح ۱۹۳۸ء میں مرحوم کی زندگی میں ان کے ساتھ کھانا کھانے میں دیکھا تھا۔ کھانے پینے کی خاطر داریوں میں بیگم نے اپنے مرحوم شوہر کی یاد تازہ کردی، اور گفتگو میں اسی ایمانی صلاحیت کا ثبوت دیا۔ جس کی توقع ایسے مردمومن کی رفیق زندگی ہی سے کی جاسکتی تھی۔ مرحوم کے چھوٹے بھائی ماندور خاں صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے، عین میری روانگی کے دن آگئے اور بڑی محبت سے سہ پہر کو اپنی نئی کوٹھی میں چائے، زبردست ناشتہ کے ساتھ پلائی۔

مخلصین

زیارت قبور کے سلسلے میں دوسرا نمبر ایک عزیز، مخلص دوست سید احمد محی الدین بی۔ اے (علیگ) کا تھا، حیدر آباد میں اردو صحافت میرے زمانے تک (یعنی سنہ ۱۷، وسنہ ۱۸ء میں) بالکل پرانے قسم کی تھی۔ دہلی، لاہور، لکھنؤ وغیرہ کی صحافت کا پرتو بھی وہاں نہیں پڑا تھا۔ محی الدین حیدر آبادی جب علی گڑھ سے گریجویٹ ہوکر آئے تو انہوں نے ہمت اور اپج سے کام لے کر ایک بالکل نئی راہ اپنے ملک و ملت کے لئے مملکت آصفی کی سرکاری زبان اردو میں کھول دی۔ رہبر دکن پوری شان سے نکلا کہ چند ہی روز میں اس نے

ملک بھر میں دھوم مچا دی۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان اور دکن کے فرق کو اس نے توڑا، اور اپنی اسلامیت، انفرادیت اور صحافی ذمہ داری کا نقش دلوں پر بٹھا دیا۔ بہادر یار جنگ مرحوم کی طرح ان کا بھی ابھی سن ہی کیا تھا کہ دفعۃً اللہ کو پیارے ہو گئے۔ پتہ لگا کر اور اس پتہ لگانے میں کوئی مدد ان کے وارثوں سے نہ مل سکی، ان کے قبرستان تک پہنچا اور حسرت و تاثر کے ساتھ ان کی تربت پر بھی فاتحہ پڑھا۔ آج زندہ ہوتے تو میری آمد سے کس درجہ خوش ہوتے اور کس کس طرح میری خاطر مدارات میں لگ جاتے۔ "صدق" اور مدیر صدق کی جو بے پناہ محبت اہل حیدرآباد کے دلوں میں ہے کون بتا سکتا ہے کہ اس میں کتنا بڑا ہاتھ مرحوم احمد محی الدین کی مخلصانہ کوشش کو ہے۔ ان کے کتبۂ مزار کے ساتھ ان کے بعض عزیزوں مثلاً ان کے بھائی عارف الدین مرحوم انجینئر کے کتبوں پر بھی نظر پڑ گئی اور دل سے دعائے خیر ان کے حق میں بھی نکلی۔

ان دو ایک شخصیتوں کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد میرے ذاتی ملاقاتیوں، عزیزوں، مخلصوں کی تھی۔ جو اب مرحومین میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس طبقہ میں سب سے پہلا نمبر مولوی سید امین الحسن بسمل موہانی مرحوم کا آتا ہے ستمبر ۱۹۱۰ء میں جب سب سے پہلی بار میں حیدرآباد آیا ہوں تو یہاں کے طور طریقوں سے اجنبی محض تھا اور اپنی ذات سے شرمیلا اور خشک مزاج بھی تھا، تو یہ

نواب سالار جنگ مرحوم کی اسٹیٹ کے ناظم تھے، مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا، دو چار دن نہیں ہفتوں اپنا مہمان عزیز بنائے رکھا اور میزبانی کے فریضے بڑی اولعزمی سے ادا کرتے رہے، اس کے بعد بھی برسوں یہی معمول رہا کہ جب بھی میں حیدرآباد آیا، ان کا گھر مستقل مہمان خانہ بنا رہا۔ بڑے ذہین بڑے زندہ دل بڑے سخن فہم بذلہ سنج، نکتہ رس و صاحب علم تھے۔ اور شاعری میں غالباً داغ کے شاگرد تھے۔ حسرت موہانی کے ہم وطن ہی نہیں عزیز قریب بھی تھے۔ بیعتِ ارادت سلسلہ قادریہ خاندان فرنگی محل اور رخانوادہ، رزاقیہ (بانسہ مضافات دریاباد) سے تھی، اس لیے میرا لحاظ زیادہ کرتے تھے۔ اور مجھے اپنے عزیزوں سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے۔ شرافت اسلامی و مشرقی کے مجسمہ تھے۔ آخری بار ملاقات ۱۹۲۸ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت بلدہ میں سٹی مجسٹریٹ تھے۔ ابھی پنشن بھی نہیں لینے پائے تھے کہ بلڈپریشر کے ایک حملہ سے نذر اجل ہو گئے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان کی تربت تک بھی رسائی ہو گئی۔ اور دل ان کے اخلاص و وفا پر آنسو بہا کر چلا آیا مرحوم عزیزوں مخلصوں کی تعداد بہت بڑی تھی حاجی محمد یوسف رزاقی قادری دریابادی عزیز قریب تھے ان کے علاوہ مولوی علی الدین حسن پنشنر ناظم عدالت اختر یار جنگ، (ناظم محکمہ امور مذہبی) اکبر یار جنگ (جج ہائیکورٹ) مولوی غلام یزدانی (ناظم آثار قدیمہ) نواب عماد الملک، سر امین جنگ، مرزا محمد ہادی لکھنوی، مرزا رسوا، نزدر حیدرآبادی وغیرہم سب کے نام نہ اس وقت یاد پڑے نہ اب فوراً

یاد آرہے ہیں۔ درگاہ حضرت خاموشؒ اور جن جن قبرستانوں تک رسائی ہوسکی سب کے مزارات پر حاضری دے لی، اور اس کار اہم سے فراغت پہلے ہی دن کرلی۔

فاضل گیلانی مولانا مناظر احسن صاحب کا مزار یہاں نہیں۔ ان کے وطن موضع گیلانی (بہار) میں ہے۔ اور مولانا عبدالباری ندوی تو اللہ ان کی عمر میں بہت برکت دے، ابھی ماشاء اللہ ہم ناسوتیوں ہی کے درمیان لکھنؤ میں ہیں۔ پھر بھی یہاں آکر ان دونوں یاران قدیم کی یاد تازہ ہوجانا بالکل قدرتی تھا۔ دونوں ایک ہی مکان میں عابد روڈ پر رہتے تھے۔ اور مجھے ان کی مہمانی کا بھی شرف ۱۹۲۷ء میں حاصل رہ چکا تھا۔ ان کے بغیر شہر کچھ ویران سا نظر آیا۔ حالانکہ یہ بھی نفس کا دھوکہ ہے۔ اللہ کی آبادی کہیں کسی کے اُٹھ جانے سے ویران ہوتی ہے۔ ؎

ہزاروں اُٹھ گئے، رونق وہی باقی ہے محفل کی

ایک جاتا تو دو اس کی جگہ آجاتے ہیں۔ نظام تکوینی یوں ہی بھرا پُرا چلا آرہا ہے۔ اور دنیا اپنے رب جلیل و قدیر کے امر عظیم کی تعمیل میں خاموشی کے ساتھ یوں ہی جِلاتی، مارتی، پیدا کرتی، فنا کرتی، اٹھاتی، گراتی، پست کو بلند بلند کو پست کرتی، ہنساتی، رلاتی، بڑھاتی، گھٹاتی، مٹاتی، دفناتی، بناتی بگاڑتی، اچھالتی، ٹھکراتی، چلی آرہی ہے۔ بہ قول حکیم عارف اکبر الہ آبادی ؎

ے دنیایوں ہی ناشادیوں میں شاد رہے گی
برباد کئے جائے گی آباد رہے گی

ہاں لیجیے ایک نام تو رہا ہی جاتا ہے۔ اس وقت بھی قریب تھا کہ رہ جائے تلاش میں غیر معمولی سرگردانی اٹھانا پڑی۔ یہاں کے ایک بڑے پرانے ملنے والوں میں یعنی ۱۹۱۷ء کے زمانے کے ہوش بلگرامی تھے۔ ایڈیٹر وغیرہ" یہ ماہنامہ تو کچھ ہی روز بعد عتاب شاہی میں آکر بند ہوگیا۔ اور ہوش صاحب کو اکبارگی حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ ہوش اُڑکر بھوپال پہنچے اور شاید کسی اور ریاست میں بھی رہے آخر رام پور جاکر دم لیا۔ مجھ سے دوستانہ محبتانہ تعلقات گردش ایام کے ہر دور میں قائم رکھے۔

سیاسی، دینی، اخلاقی، تصورات میں مجھ سے بہت دور تھے۔ اور مزاج وطبیعت میں بھی بہت الگ، لیکن اس سب کے باوجود رشتۂ انس و مودت مجھ سے قائم رکھے ہوتے۔ اور آخر آخر تو میرے مخلص ہی نہیں محسن بھی ہوگئے۔ حیدرآباد جب کئی سال کے بعد دوبارہ آئے اور یہاں ہوش یار جنگ بن کر پورے عروج پر پہنچے تو جہاں تک مادی و مالی نفع پہنچانے کا تعلق ہے، میرا ہر موقع پر لحاظ رکھنے لگے۔ ایسا کہ مجھے شرمندہ ہو ہو جانا پڑا اور ایسا ہی رابطۂ اخلاص ان کا میں نے اپنے محترم و مخدوم دوست اور بزرگ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ بھی دیکھا۔ بلکہ یہی ربط اس سے

ہلکے درجے میں اپنے ایک دوسرے مخدوم ومحترم مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے ساتھ بھی پایا۔ حیرت ہوتی رہی، لیکن بہرحال واقعیت اپنی جگہ پر رہی۔ ان کی شائع شدہ بعض تحریروں سے مجھے تکلیف بھی اچھی خاصی ہوئی۔ لیکن میری ذات کے ساتھ ان کی وابستگی میں ذرا فرق نہ آیا۔ لکھنؤ اپنے دورِ عروج میں دو بار آئے ایک بار کارلٹن ہوٹل میں ٹھہرے اور ایک بار نیاز فتحپوری ایڈیٹر نگار کے ہاں۔ دونوں بار مجھ سے ملنے اس طرح آئے، جیسے کوئی اپنے عزیز وقریب کے ہاں جاتا ہے۔ اور دونوں بار میرے نواسوں، نواسیوں سے اس طرح پیش آئے جیسے وہ خود انھیں کی نواسیاں نواسے تھے۔ بہرحال ان کا قرض مجھ پر واجب تھا۔ بڑی ہی جستجو کے بعد ان کی تربت کا پتہ چلا۔ قطبی گوڑہ کے ایک قبرستان میں ملی، جو شیعہ سنیوں کا مشترک ہے وہاں جاکر فاتحہ پڑھا اور عرض معروض کچھ اس طرح پر کی۔

"بار الٰہا آپ کے اس بندے کے اور جو کچھ اعمال واحوال ہوں، وہ تو آپ ہی پر خوب روشن ہیں۔ میں حال اپنے سابقہ کا جانتا ہوں۔ میرا تو یہ شخص پورا مخلص بلکہ محسن تھا اور آپ کے بعض نیک ومقبول بندوں کے سابقہ میں بھی میں نے اسے سراپا اخلاص پایا۔ اس کی شہادت دیتا ہوں، اور التجا کرتا ہوں کہ اپنی کریمی کے صدقہ میں اس کے ساتھ معاملہ

تمام تر عفو و فضل کا فرمایا جائے ۔ اور اس کے حسنات کو اس کی کمزوریوں کا کفارہ اور شفیع قرار دے دیا جائے ۔ اِنَّہٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْم۔

شنیدم کہ در روز امید و بیم
بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

قدیم حیدرآباد، جدید حیدرآباد

ایک حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ صحابی کے حوالہ سے آتا ہے ۔

عَنْ اَبِی ھریرۃ عن رسول اللہ صلعم قَالَ لَا تقومُ السَّاعۃ حَتّیٰ یتطاول النّاس فی البُنیانِ	کہ رسول اللہ (صلعم) نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک نہ آئے گی، جب تک لوگ بلند و بالا عمارتیں نہ بنانے لگیں ۔

اور یہی نہیں کہ قرب قیامت کے زمانے میں جسے عین ترقی تمدن کا زمانہ سمجھا جائے گا، بڑی عالی شان عمارتوں کی کثرت ہوگی، انہیں داخل فیشن سمجھا جانے لگے گا بلکہ یہ عالی شان عمارتیں طرح طرح سے آراستہ و منقش بھی ہوں گی ۔ انہیں صحابی ابوہریرہؓ کی سند سے اس کتاب میں امام بخاریؒ نے یہ روایت بھی درج کی ہے ۔

عن ابی ھریرۃ عن النبی	رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ قیامت اس وقت

صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تقوم الساعۃ حتی یبنی الناس بیوتا یشبھونھا بالمراجل!	تک نہ آئے گی جب تک لوگ ایسے مکان نہ بنانے لگیں، جنہیں وہ رنگین چادروں سے مشابہ کردیں گے۔

اور روایتیں بھی اسی مضمون سے ملتی جلتی ہیں، گویا پیغمبر اعظم نے نگاہ کشفی سے صریحاً دیکھ لیا تھا کہ آخر زمانہ میں عالی شان، رنگین و آراستہ عمارتوں کی بڑی کثرت ہوگی اور اسے عین دلیل ترقی اور تمدن کی سمجھا جائے گا۔ بات غلط کیسے ہو سکتی تھی۔ دوسرے دولت مند و خوشحال ملکوں کا ذکر نہیں اپنے ہی مفلس ملک کو دیکھ لیجیے کس سرعت اور کس کثرت کے ساتھ ہر جگہ نئی نئی عالی شان، دیدہ زیب سر بہ فلک کوٹھیاں، کچہریاں دفتر، ہوٹل، ہر ہر شہر بلکہ قصبات تک میں گرانی و مفلسی کی داد دیا کے باوجود ابھر رہے ہیں، نکھر رہے ہیں "تعمیری پروگرام" کا گویا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ اپنے مجازی معنی میں نہیں لفظی معنی میں!

حیدر آباد اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ کیوں اور کیونکر رہ سکتا تھا؟ قدیم حیدر آباد سلطنت آصفیہ کی حسرت نصیب یادگار بے شک مٹ چکا، لیکن جدید حیدر آباد بھی انڈین یونین کی اقبال مندی اور فیروز بختی کا پرچم لہراتا ہوا وجود میں آگیا ہے، بیسوں محل اور حویلیاں جہاں اجڑی ہوئی، لٹی ہوئی، گری ہوئی، گری پڑی، ٹوٹی پھوٹی، دکھائی دیں وہیں پچاسوں نئی کوٹھیاں نئے بنگلے

ہوٹل اور سینما گھر، کالج اور اسپتال، یہ دفتر اور وہ دفتر، جدّت اور تازگی
سرسبزی شادابی کا حق ادا کرتے ہوئے بھی نظروں کے سامنے آگئے! تخریب و
تعمیر کی یہ دوگونہ نیرنگیاں، نیرنگ سازِ فطرت کے ہر آنی کرشموں میں سے ہیں۔

ادارۂ ادبیات اُردو

اردو کے ایک قدیم خادم کی حیثیت سے نظر اپنے رنگ و مذاق کے
اداروں اور عمارتوں پر پڑنا بالکل قدرتی تھا۔ گو اپنے وطن یوپی میں اُردو
کی بے خانمائی کا حال دیکھ کر اس طرف سے مایوسی تھی اور کسی سے اُردو کا پتہ
نشان پوچھنے کی ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی اور اسٹیشن کی عمارت اور دفتروں
کا منظر خود اسی مایوس کو اور گھبرا کرنے والا تھا۔ وہی تار گھر، اسٹیشن ماسٹر
ویٹنگ روم، مسافر خانہ وغیرہ کی عام فہم ناموں کی تختیاں سب غائب اور ان
کے بجائے نامانوس اور تمام تر ناگری رسم الخط میں گدے ہوئے، لیکن
اسٹیشن سے باہر شہر کی عام آبادی میں قدم رکھتے ہی یاس کی گہری تاریکی دور
ہونے لگی، اور امید کی کرنیں کسی درجہ میں نظر آنے لگیں۔ دکانوں، ہوٹلوں
مکانوں، چائے خانوں یہاں تک کہ سرکاری دفتروں کے بھی سائن بورڈوں
پر اردو حروف دکھائی دیئے۔ اور کارپوریشن کی طرف سے سڑکوں پر جو مختصر
ہدایتیں لکھی رہتی ہیں، وہ بھی اردو میں نظر آئیں اور دل نے کسی قدر اطمینان

کا سائن لے کر کہا کہ بحمد اللہ یہاں اردو سے وہ بیزاری اردو کے نام سے وہ تعصب
نہیں جو ہمارے اتر پردیش کا حصہ ہو گیا ہے! نام کی کشش جب ادارۂ ادبیات
اردو تک لے گئی، تو ایوان اردو کو نام کا نہیں، واقعی ایوانِ اردو ہی پایا۔
عمارت کے ظاہری حسن و جمال، وسعت و طول و عرض سے قطع نظر جب عمارت
کے اندر قدم رکھا، اور چل پھر کر، اِدھر اُدھر اوپر اور نیچے دیکھنا شروع کیا تو
شان خدا نظر آئی، میوزیم اور لائبریری، آڈیٹوریم اور لکچر گیلری سب ہی کچھ
اس ایک ایوان کے اندر جمع! — اللہ اکبر، اپنی اردو کی بھی یہ شان! قلمی کتابوں
نادر مخطوطوں کا پورا ذخیرہ فراہم، ریسرچ اسکالر (طلبہ برائے تحقیق فن) آئیں تو
اپنے کام کے لیے مدتوں قیام کا سامان پائیں۔ ان کے رہنے، ٹھہرنے کا انتظام
بھی معقول اسی عمارت کے اندر موجود۔ یوپی والے اردو دشمنی کے مارے
ہوئے غریب، دکن میں اردو کے اس مان دان کو سُن پائیں تو خوشی سے
پھولے نہ سمائیں، بلکہ عجیب نہیں، جو مسرت کے ساتھ جذبۂ رشک بھی اپنے
سینے میں موجزن پائیں۔ ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں مرحومین متقدمین کے
علاوہ معاصرین تک چھوٹے بڑوں کی محفوظ، یہاں تک کہ مدیر صدق کے
• بدخط و خام نویس کی بھی! سچ یہ ہے کہ اس احاطہ کے اندر آ کر یہ بھی یاد نہیں
رہ جاتا کہ اردو کوئی مظلوم زبان اور ناقدری اور کس مپرسی کی شکار
ہے یا یہ کہ کسی بھی ترقی یافتہ زبان سے پیچھے یا نیچے ہے! —— اللہ نے خلوص

میں بڑی برکت رکھی ہے۔ ڈاکٹر زورؔ مرحوم اردو کی خدمت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھے۔ اللہ نے ان کی کوششوں کو کامیابی و سرسبزی کا یہ مرتبہ عنایت کیا اور بابائے اردو کا صحیح جانشیں بلکہ یوں کہیے کہ بابائے اردو ثانی بنا دیا!

اسی ادارے کے ایک گوشے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی یادگار میں آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہے۔ اور اس ادارہ کے دو سرگرم کارکن پروفیسر علی اکبر اور پروفیسر عبدالمجید صدیقی ہیں۔ دونوں صاحب قلم اردو ہی کے نہیں، انگریزی کے بھی۔ صدیقی صاحب تاریخ کے استاد رہ چکے ہیں۔ اور معلوم ہوا کہ ادارہ کے ارکان انتظامی میں کئی ہندو صاحبان بھی شریک ہیں۔

انجمن ترقی اردو حیدرآباد اور دیگر ادارے

اردو کے قدم دکن میں جمائے رکھنے کا سہرا تمام تر انجمن ادبیات اردو ہی کے سر نہیں ایک دوسرا ادارہ بھی اس فخر میں برابر کا شریک و سہیم ہے۔ اور اس کا نام انجمن ترقی اردو حیدرآباد ہے۔ بلکہ علمی، تحقیقی قدروں کا حصہ ادارہ ادبیات کے لئے چھوڑ کر اردو کی چلتو اور روزمرہ کی ضرورتوں کا جہاں تک تعلق ہے، انجمن کی کارگزاریوں بلکہ کہنا چاہیے کہ کارناموں کا نمبر کچھ بیس ہی ہے۔ ایک وسیع احاطۂ زمین اور اس کے اندر دو دو اردو کالجوں کو بڑے پیمانے پر چلانا کوئی آسان اور معمولی درجہ کی چیز

نہیں، اور کتابوں کی تالیف و اشاعت جو اس کے علاوہ ہے وہ ظاہر ہی ہے اور یہ سارا ثمرہ ایک بڑی حد تک معتمد انجمن پروفیسر حبیب الرحمٰن کی جوان ہمتی اور ایثار کا ہے۔ اپنی ایک بڑی ذاتی عمارت انجمن کی نذر کردی ہے۔ اور خود دن رات اردو ہی کی (اور یا پھر علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی) خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ انجمن جسے ایسے مخلص کارکن نصیب ہوئے ہیں۔ اور اس انجمن کے چلانے میں ہاتھ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ متعدد ہندو بھی اس میں جان و دل سے شریک ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب شری جانکی پرشاد کا نام بار بار سننے میں آیا۔ اور انجمن کی طرف سے ایٹ ہوم میں ان سے نیاز بھی حاصل رہا۔

ہندوؤں کی شرکت اردو کے کاروبار میں یوپی میں بھی ہے اور وہاں کی اردو کی جد و جہد میں نام کشن پرشاد کول، وحشی ہنکاری کانپوری رام لال، آنند نرائن ملّا وغیرہ کے کون بھلا سکتا ہے۔ تاہم حیدرآباد میں اس شرکت و مشارکت کا مسرت انگیز منظر اور زیادہ ہی دیکھنے میں آیا۔ بلکہ ایک اور انجمن انجمن تحفظ اردو کے نام سے تو حال میں ہندوؤں ہی کے عنصر غالب سے قائم ہوئی ہے، اور اس سے بھی کچھ بڑھ کر خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ ریاست کی ساہتیہ اکاڈمی جو کام کر رہی ہے اس میں اردو دانوں کا بھی پورا حصہ ہے۔ اور تصنیف و تالیف کا کام جس طرح تلنگی وغیرہ کا اس میں

ہو رہا ہے، اسی طرح اُردو کا بھی۔

—— اُردو سے شدید رقابت بلکہ دشمنی اور ضد تو شاید ہندی ہی کے لیے مخصوص ہو چکی ہے۔ تامل، تلنگی وغیرہ کسی اور زبان کی بھی کد اُردو سے سننے میں نہیں آئی۔

حیدرآباد کی اُردو صحافت

ہر زبان کی طرح اُردو کے بھی بڑے نقیب اُردو کے اخبار ہیں جس خطۂ ملک میں بھی وہ نکل رہے ہوں۔ حیدرآباد کی صحافت ایک زمانہ میں بہت پست اور بالکل مبتدیوں کے درجہ کی تھی۔ "رہنمائے دکن" اب دکن کا ایک معروف و مقبول روزنامہ ہے۔ سب سے پہلے اس نے اپنے نقش اوّل رہبر دکن کے نام سے معیار حال کے مطابق روزنامہ حیدرآباد سے نکالا، اور اپنی زندگی کے ہر دور میں اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ اور جہاں تک مسلمانوں کی نمائندگی کا تعلق ہے، اپنی سنجیدگی، معقولیت، میانہ روی، اور اسلامیت کا نقش دوسروں کے دل پر بٹھائے ہوئے ہے — صدق سے اس کا رابطۂ اتحاد و حسن ظن شروع سے گہرا ہے، اور صدق میں اس کی مدح وستائش کرنا ایک طرح خود ستائی ہی کرنا ہے۔ دوسرا قابل ذکر روزنامہ "سیاست" نظر پڑا، اور اس کے مدیر و سر دبیر عابد علی خاں صاحب سے بھی نیاز حاصل

رہا۔ خاصہ سنجیدہ، شریفانہ، معقول و پُرمعلومات پرچہ ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ اپنا ظریفانہ کالم خوب سنبھالے ہوئے ہے، ورنہ لوگ ظرافت اور توہین، دل آزاری یا پھکڑ کے درمیان فرق ہی نظر انداز کرجاتے ہیں۔ اور ایک تیسرا معقول و کثیر اشاعت روزنامہ ملاپ کے نام سے دیکھنے میں آیا۔ دلی و جالندھر کے مشہور روزنامہ ملاپ کا حیدر آبادی ایڈیشن ہے، اور اب مدتوں سے مسلمانوں کی دل آزاری کے بغیر کامیابی سے نکل رہا ہے۔ ایڈیٹر شری یدھ ویر ہیں۔ ایک ایٹ ہوم میں سرسری ملاقات رہی۔ عام تاثر اس مختصر اور پہلی ملاقات میں اچھا ہی قائم ہوا۔ جو پرچے اکثریت کے ہاتھ میں ہیں انھیں اپنے قلم کی ذمہ داری کا خاص طور پر احساس رکھنا ہے، ملک کے بناؤ اور بگاڑ دونوں کی قوت بڑی حد تک انہی کے قلم کی روش سے وابستہ ہے۔ عین اسی زمانہ قیام میں ایک نئے روزنامہ صحیفہ کا پہلا نمبر ہاتھ میں آیا۔ صحیفہ نئے نہیں بہت پرانے پرچہ کا نام ہے۔ مولوی فاضل مولوی اکبر علی مرحوم کی ادارت کے زمانہ میں یہی پرچہ حیدر آباد پر چھایا ہوا تھا۔ محض پہلا نمبر دیکھ کے کوئی ذمہ دارانہ رائے قائم نہیں ہوسکتی۔ خدا کرے اس کی روش اُردو معاصرین میں اس کی نیک نامی کا باعث بنے۔

حیدر آباد کی تہذیبی شرافت

اُردو صحافت محض اُردو زبان کی صحافت نہیں، اُردو کلچر کی مظہر و ترجمان

ہے، اردو محض ایک زبان کا نام نہیں، اردو کلچر یا تہذیب خود ایک مستقل چیز ہے اردو تہذیب کا آئینہ ہے، اور اس آئینہ کی ساری جلا صرف ایک لفظ شرافت کے اندر مضمر ہے۔

حیدر آبادی تہذیب، لکھنوی تہذیب، اسی جوہر شرافت کی یادگار تھی۔ وہ جب مٹتی ہے تو ہر شریف کو اس کے مٹنے کا رنج ہوتا ہے۔

ٹھیٹھ مذہبی عقائد کا تعلق عالم غیب سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ تہذیبی شرافت ایسی چیز ہے جو اسی دنیا میں بندوں کا دل بندوں سے جوڑے رہتی ہے۔ اور جب اس تہذیب کا جنازہ اٹھتا ہے تو ماتم داروں میں سب سے آگے شرافت ہی ہوتی ہے۔

پُرانا حیدر آباد مٹا فنا ہوا۔ نظام جاگیرداری گیا۔ نئے نظام حکومت و آئینی سیاست نے جگہ لے لی ـــ اکثریت نے آزادی محسوس کی لیکن آخر کوئی بات اس مرحوم اُردو کلچر میں تھی کہ جب پولیس ایکشن کے بعد ایک نامور ہندو ایڈوکیٹ نے ازراہ ہمدردی ایک اونچے مسلمان عہدیدار سے کہا" زمانہ اگر میر محبوب[1] علی خاں کا ہوتا تو ہم خود آپ لوگوں کے ساتھ ہو کر

---

[1] مملکت حیدر آباد پر آصف جاہی خاندان کے سات بادشاہوں نے حکومت کی۔ محبوب علی خاں چھٹے بادشاہ تھے اور اسم بامسمّیٰ! وہ ہندو مسلمان بھی کے محبوب ہندوؤں کے بعض فرقے تو انھیں اوتار مانتے تھے۔ ان کا زمانہ حکومت ۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء ہے (محمد احمد خاں حیدر آبادی)

پولیس ایکشن کا مقابلہ کرتے "، تو اس مسلمان عہدیدار نے کتنا بلیغ وجامع یہ جواب دیا، کہ ـــــ خیر ہم تو مر چکے، خوشی اس کی ہے کہ ہم پر آنسو بہانے والے آپ بھی ہیں!"

دور بد اقبالی میں

قصہ ملکہ سبا میں ملکہ کی زبان سے قرآن مجید میں نقل ہوا ہے۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا اَعِزَّةَ اَهْلِهَا اَذِلَّةً (النمل: آیت ۳۴)	بولی کہ بادشاہ جب کسی بستی میں (فاتحانہ) داخل ہوتے ہیں تو اسے تہ و بالا کر دیتے ہیں، اور اس کے معززین کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں

اور ملکۂ ملک سبا نے کہی یہ بات بڑے پتے کی اور بڑے تجربہ کی۔ دنیا کی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے۔ فاتح جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اپنے کو بادشاہ کہیں یا جمہوریئے، یا عوامئے، یا اشتراکیے۔ یا جو کچھ، بہرحال مفتوحوں کے حق میں ایک عذاب بن کر آتے ہیں ـــــ ان کے قلعوں کو توڑنا ان کی حویلیوں کو گرانا، ان کی شان وعظمت کو مٹانا، دنیا کے ہر فاتح کا عام شیوہ رہا ہے، اور مفتوحوں کی قسمت میں کچھ صبر کے ساتھ سہنا ہی رہتا ہے حیدرآباد پولیس ایکشن کے بعد اپنے انجام پر حیرت ہی کیوں کرے؟ ـــــ عاقبت اندیشی اگر ہوتی تو اس کی نوبت ہی کیوں آنے دی جاتی؟ بہرحال

اس بداقبالی کا ظہور کسی درجہ میں تو ناگزیر ہی تھا، لیکن اللہ کا یہی بڑا فضل ہے کہ حالت نکبت زدہ اس درجہ میں دیکھنے میں نہیں آئی جس کا اندیشہ تھا بلکہ اسے برسوں کے مسلمانوں کی خود اعتمادی پر محمول کیجیے یا حکمرانوں اور ہم وطنوں کی رواداری پر (اور یہ تو واقعہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کے خلاف نہ لسانی تعصب اس پیمانہ پر ہے اور نہ دینی تعصب جس پیمانہ پر اُتر پردیش میں ہے) بہرحال یہاں کے مسلمان اپنی اپنی ثقافتی، معاشرتی حالت بہت کچھ سنبھالے ہوئے ہیں، مکہ مسجد تو خیر اس ڈر سے جانا نہیں ہوا کہ وہاں پہچان لیا جاؤں گا۔ اور پھر مجمع سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن جن دو ایک چھوٹی مسجدوں میں جمعہ پڑھنے یا کسی اور وقت جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں نہ صرف نمازی ہی اچھی خاصی تعداد میں دکھائی دیے بلکہ جماعت و نماز کا انتظام اور روشنی، فرش صفائی، پانی، وغیرہ کا انتظام بھی تقریباً اسی حال میں ہے، جس میں دورِ نظام دکن میں تھا، یہ دیکھ کر جی بڑا خوش ہوا۔ اس زمانہ میں مسجدوں کے نظام ظاہری ہی کو مسلمان سنبھال لے جائیں تو یہی ایک بڑی بات ہے۔

دارالقرأت

نماز اور قرآن سے ملا اور جڑا ہوا مسئلہ قرأت و تجوید کا ہے، ہندوستان میں حافظ تو خیر اب بھی تھوڑے سے بہت مل جاتے ہیں، لیکن قاری برابر کمیاب

سے کمیاب تر ہوتے جاتے ہیں۔ ورنہ قرأت و تجوید کا نظام بجز لکھنؤ کے مدرسہ فرقانیہ اور ریاست کی چند دینی درس گاہوں کے بھلا کہیں نظر آتا ہے۔ بلدہ حیدرآباد بحمد اللہ اس خصوص میں بھی اپنی امتیازی شان قائم کئے ہوئے ہے۔ ایک بڑا مرکزی ادارہ دار القرأت کے نام سے بازار نور الامرا میں قاری کلیم اللہ صاحب حسینی ایم اے کی نگرانی و سرپرستی میں ماشاء اللہ خوب چل رہا ہے۔ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ قاری صاحب خود اپنی ذات سے جامع صفات ہیں۔ ایک طرف صورۃً، سیرۃً پختہ و کھرے مسلمان اور دینی علوم کے عالم اور دوسری طرف انگریزی زبان اور مغربیات میں برق۔ جامعہ عثمانیہ میں فارسی کے استاد رہ چکے ہیں، اور اب بھی شاید اعزازی پروفیسر ہیں۔ مکان کا نام کلیم اللہ کی مناسبت سے "طور"، خوب رکھا ہے۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ اس کا جلوہ بغیر کسی لن ترانی کے از خود کرا دیتے ہیں اور کھانے کی میز پر جب بٹھاتے ہیں تو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابھی ابھی دعاے موسوی رب انی لما انزلت الیّ من خیر فقیر، دل میں پڑھ چکے ہیں، مہمان کے حق میں طعامی لذتیں من و سلوی کا نقشہ پیش کئے ہوئے! اور چھوٹے مدرسے قرآنیات سے متعلق اور بھی متعدد ہیں۔ انھیں میں سے ایک امتحانی ادارہ دار العرفان (لال ٹیکری) کے نام سے ہے۔ اور ایک سعید المدارس (خیرت آباد) میں جہاں ایک انگریزی اور اسلامیات کی جامع قاری

خاتون سعید جہاں کے اہتمام میں پردہ نشین خواتین اور لڑکیوں کے لئے حفظ قرآن و تجوید کا بندوبست ہے۔ البتہ بڑے اور چھوٹے ہر مدرسہ تجوید و قرأت میں لڑکیوں کو (دس برس کی بچیوں کو بھی) لڑکوں سے بالکل علیحدہ رکھنے کی شدید ضرورت ہے اور لڑکیوں اور عورتوں کا بلا تکلف مردوں کو اپنی آواز سنانے لگنا، خود ایک فتنہ کی جڑ ہے، قرآن مجید کی برکت، ہرگز ایسے فتنوں کے روکنے کے لئے کافی نہیں، جیسا کہ مردانہ نفسیات کے ہر واقف کار پر روشن ہے۔

دینی درس گاہیں، اعلیٰ اور اوسط، ادنیٰ، شہر میں بہ کثرت موجود ہیں اور اپنا کام کیے جا رہی ہیں۔ سب تک کیا معنی۔ دس فیصدی تک پہنچنا بھی ناممکن تھا، نہ اس کی کوشش ہی کی گئی۔ دو ہی چار کے معائنہ سے ایک اجمالی رائے قائم کرنے پر اکتفا کرلی۔

دینی سرگرمیاں

جماعت تبلیغ کا مرکز۔ مولد تو ہمارا شہر دہلی ہی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے کہ اس کی شاخیں اصلہا ثابت وفرعہا فی السماء کی مصداق ہندوستان۔ پاکستان کے ہر شہر میں کیا معنی، افریقہ، یورپ اور امریکہ تک میں پھیل گئی ہیں۔ حیدرآباد میں اس کے خدمتی جلسے خوب

ب دیکھنے میں آئے ۔ اور حیرت ہی ہوتی رہی کہ اس کی باگ کیسے کیسے
ں سنبھالے ہوئے ہیں ۔ ایک ڈاکٹر ادھیڑ سن دسال کے ڈاکٹر وحیدالزماں
احب دیکھنے میں آئے ۔ ایلوپیتھی کے ایم ، بی ۔ اپنے فن میں ممتاز ایک زمانے
ں شاہی طبیب بھی رہ چکے ہیں ۔ اپنی بزرگی کے لحاظ سے قابل زیارت
ی تحریک تبلیغ کے لیڈر ! صورۃً ہمارے لکھنؤ کے مشہور ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم
ظم ندوہ سے مشابہ ، اور سیرت بھی انھیں کے ہم رنگ ! انھیں کے ہمراہ ایک
احب دراز ریش فوجی وردی میں ملبوس اور دکھائی دیے ۔ اپنا وقت
ی تبلیغ کے لئے وقف کئے ہوئے ۔ یقین نہیں آتا تھا ، لیکن یقین کرنا پڑا ،
ہندوستانی کیا معنی ، مشرقی بھی نہیں ، خاص اسکاٹ لینڈ کے باشندے
ں نومسلم ، یہاں نظام دکن کی ذاتی رجمنٹوں کے کرنل ہیں ۔ اسی جماعت
لوں کے اثر سے ولایت میں اسلام قبول کیا ، اور اب ماشاءاللہ خود
عت میں شریک ہوکر دوسروں کو اسلام کی طرف لا رہے ہیں ۔ ایک
ر ممتاز رکن اور سرگرم کارکن ، سکندرآباد کے سیٹھ حسین سے بھی ملاقاتیں
ں ۔ چند ہی روز پیشتر تک سنا ہے کہ صاحب بہادر تھے ، اور اب صورت
ل تک مولویانہ ۔ اور نام کتنوں کے لکھے جائیں ۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ
وری و شہرت سے کوسوں دور بھاگنے والے ہیں ۔

جماعت تبلیغی کے ساتھ دوسرا نام جماعت اسلامی کا یاد پڑ جانا بالکل

قدرتی ہے۔ یہ جماعت بھی ہندوستان میں اپنے رنگ میں بڑا مفید کام کر رہی ہے۔ کام کی نوعیت اس سے بالکل مختلف لیکن دین و ملت کے حق میں افادیت کے لحاظ سے کم درجہ پر نہیں۔ یہاں اس کے بھی کارکنوں سے ملاقات رہی اور معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ یہ بھی کام میں سرگرم عمل ہیں۔ اسلام کے سپاہیوں کو تو داخلی اور خارجی دونوں محاذوں پر اپنی زندگی کا ثبوت دینا ہے، قلب میں جلا پیدا کر کے اندر کی روحانیت و نورانیت کو بیدار کرنا، کام جماعت تبلیغی کا ہے۔ دماغ کو مغربی اور غیر اسلامی فتنہ دفسوں کے حملہ سے محفوظ کر دینا اور تاریخ و جغرافیہ، معاشیات، فلسفہ، نفسیات، طبعیات وغیرہ پڑھ چکنے کے بعد بھی شہادت توحید و رسالت پر قدم جمائے رکھنا، یہ دائرۂ عمل جماعت اسلامی ہند کا ہے، جس پر شاہد عادل، اس کی لکھائی ہوئی درسی کتابیں ہیں۔

دائرۃ المعارف عثمانیہ

دوسرے دینی اداروں سے قطع نظر ایک دینی علمی ادارہ ایسا ہے جس کے لحاظ سے حیدر آباد اب تک سارے ہندوستان میں منفرد تھا اور اب تک ہے۔ اور ہندوستان کیا معنی، اس کی نظیر اس بڑے پیمانہ پر عالم اسلامی میں بھی کمتر ہی نظر آئے گی، اس کا موجودہ نام دائرۃ المعارف العثمانیہ

ہے ۔اس کی بنیاد تو انیسویں صدی کے آخر ہی میں پڑ چکی تھی ۔غالباً عماد الملک
ید حسین بلگرامی کی تحریک پر ۔باقی پھر مولانا شبلی اور دوسرے علماء کی
ششوں نے اسے چار چاند لگا دیے ،اور اس کی شہرت مصر ،عراق ،شام
یرہ سے گزار کر برطانیہ ،ہالینڈ ،فرانس ،جرمنی وغیرہ تک پہنچادی ،اس کا
ل کام مسلمانوں کے قدیم ذخیرہ سے نادر کتابوں کو نکال کر انھیں چھاپنا تھا ،
چہ حدیث ،رجال ،سیرت ،فقہ ،کلام ،لغت پر بیسیوں بلکہ بچاسوں نادر
تابیں اس نے تصحیح و تہذیب کے پورے لوازم کے ساتھ چھاپ کر شائع
یں ۔چنانچہ سُنن بیہقی ،تاریخ الکبیر (بخاری) کنز العمال ،المستدرک ،الاستیعاب
ل الحدیث ،مشکل الآثار ،جمہرۃ اللغت ،تہذیب التہذیب ،تذکرۃ الحفاظ
یرہ اپنی مطبوعہ شکل میں سب اسی ادارے کا فیض ہے ۔ابتداً یہ ادارہ
لاً دینی تھا ۔اور ضمناً علمی ،رفتہ رفتہ یہ ترتیب کچھ اُلٹ سی گئی ۔اور اب یہ
ں سے زیادہ ایک علمی ادارہ ہے ۔اور اب اس میں فلسفہ فلکیات وغیرہ
تابیں کچھ زیادہ ہی چھپنے لگی ہیں ۔یہاں تک کہ شاید کوئی کتاب جوتش
وم کی بھی ،سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہو کر اب چھپ رہی ہے ۔

پہلے یہ ادارہ خود ایک مستقل حیثیت رکھتا تھا اور قائم بالذات
سنہ ۱۹۴۴ء سے جامعہ عثمانیہ کے تحت آگیا ،اور اب شہر سے چند
ما دور اس کی ایک بڑی عالیشان وسیع عمارت یونیورسٹی کے لق ودق

حلقہ کے اندر ہے۔ کتابوں کی تصحیح، مقابلہ و تہذیب کے فن سے واقف عالموں کا ایک پورا گروہ کام میں لگا رہتا ہے، اور کتابوں کو یورپ ہی کے معیار پر ایڈٹ کر کے شائع کرتا رہتا ہے۔ اور ایک بہت بڑے پریس کا مالک ہے۔ پریس چھپائی کی جدید ترقیوں سے لیس ہے جنھیں یہ عامی پوری طرح سمجھ بھی نہ سکا۔ صرف حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ پریس میں عربی کا اچھا ٹائپ تو خیر ہوتا ہی، انگریزی چھپائی کا بھی پورا سامان موجود ہے۔ چنانچہ پکتھال صاحب مرحوم کے انگریزی ترجمہ قرآن کا ایک ایڈیشن اس کا چھاپا ہوا ہے، اور عربی کتابوں کے تو کئی کئی نسخے بیک وقت مخطوط سے مطبوعہ میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ ادارے کے ناظم یا ڈائرکٹر ایک فاضل اسلامیات و مغربیات ڈاکٹر عبدالمعید خاں پی، ایچ، ڈی ہیں جو نظامت ادارہ کے ہمہ دقیق و نازک کام کے علاوہ بلند پایہ انگریزی سہ ماہی اسلامک کلچر کے ایڈیٹر بھی ہیں، اور شاید یونیورسٹی میں پڑھاتے بھی ہیں، اور اسلام کے علمی محاذوں پر بھی سپاہی کی خدمت انجام دیتے رہتے ہیں۔ مستشرقین کے مخفی لیکن گہرے حملوں سے مقابلہ کے لئے ہمارے قدیم حربے سب کند ہو چکے ہیں۔ اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضرورت ایسوں ہی کی ہے جو ایک طرف اپنے عقائد و ایمانیات میں پختہ ہوں اور دوسری طرف حریفوں کے بھی ایک ایک دار کے الٹ دینے کا فن جانتے ہوں۔

ہمارے قدیم علما زہد و تقویٰ ریاضت و مجاہدہ میں جو مرتبہ بھی رکھتے ہوں وہ اس میدان میں آنے کے بالکل ہی نااہل ہیں۔ فلپ ہٹی (لبنانی ثم امرکی) جو مستشرقین میں اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ ایک حد تک بجا طور پر ہمدرد اسلام بھی سمجھے جاتے ہیں۔ ان حضرت نے اپنی مشہور عالم تاریخ عرب میں ایک ذراسا شوشہ سلسلہ ولادت میں یہ چھوڑ دیا کہ عرب کے ایک شریف قبیلہ میں ولادت ایسے بچہ کی ہوئی جس کے نام کی صحت غیر یقینی ہی رہے گی، بس اس پر ایک دوسرے بزرگ نے عمارت یہ کھڑی کر دی کہ محمد کوئی شخصی نام یا علم نہیں یہ تو محض ایک توصیفی لقب ہے۔ جسے شاعر دربار نبوت حسان بن ثابت نے اپنی ایک نعتیہ نظم میں باندھا ہے۔ اور اسی سے قرآن نے اپنی آخری مدنی سورتوں میں لے لیا ہے! ــــ مسلّمات میں شک و شبہ پیدا کردینا، قطعیات میں رخنہ ڈال دینا، یہ وہ کمال تلبیس ہے کہ یہاں تک جاہلیت کے ابوجہل، ابولہب کا بھی ذہن نہیں پہنچ سکتا تھا! ــــ ایسے دجالی فتنوں کی روک تھام، اور ایسے باریک شبہات کا جواب اس مستشرقانہ تکنک کو استعمال کرکے اور انھیں کے رنگ میں گھس کر عبدالمجید خاں کا قلم دے سکتا ہے ــــ بلکہ عجب نہیں کہ دہلی کے تازہ اجلاس مجلس مستشرقین میں دے بھی دیا ہو۔

انھیں ناظم ادارہ نے اپنے ادارہ کے ایک ایک کمرہ کا گشت کرایا

ایک ایک چیز دکھائی بتائی اور پھر کھلانے پلانے کی خاطر داریاں رئیسانہ پیمانہ پر رہیں وہ الگ!

یاروں نے کیا کوئی کسر ادارہ کے بند کرادینے کی اٹھا رکھی تھی، ادارہ مسلمانوں کا مخصوص کام کر رہا ہے۔ فرقہ وارانہ ہے ـ سیکولر حکومت میں اس کا کیا کام؟ اسے فوراً القط ہونا چاہیے۔ قریب تھا کہ فرمان قضاء اسی مضمون کا شائع ہو جائے، اور حکومت آندھرا پردیش کے حکم سے ادارہ کے دروازوں میں قفل پڑ جائیں، لیکن حافظ حقیقی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وزیر تعلیم سرکار ہند: مولانا ابو الکلام (اللہ انھیں غریق رحمت فرمائے) نے اپنے منصب عالی کی کرسی سے زبردست احتجاج نامہ بھیجا کہ "بند ہونا کیا معنی ایسے ادارہ کو قائم ہی نہیں اور ترقی دینا چاہیے۔ بیرون ہند کی پڑھی لکھی دنیا میں تو سرکار ہند کی سیکولرازم کا بھرم ہی اس سے قائم ہے۔ اپنے سرکاری دورہ میں، میں نے کیا جرمنی اور کیا فرانس، کیا برطانیہ اور کیا اٹلی سب کہیں کے اہل علم کو اس کی خیریت دریافت کرتے اور اس کے کارناموں کے راگ گاتے ہوئے پایا۔ جب کہیں جا کر ادارہ کی جان بخشی ہوئی۔

کتب خانہ آصفیہ

۱۹۱۷ء سنہ ۱۹۱۸ء میں جب کچھ دن جم کر رہنا حیدرآباد میں ہوا تھا

تو اپنے شوق و دلچسپی کی ایک خاص چیز کتب خانہ آصفیہ تھا۔ عابد شاپ سے
جو سڑک اسٹیشن کو آتی ہے۔ اسی کے شروع میں اس کی عمارت واقع
تھی، کئی کئی سڑکیں یہاں ملتی تھیں۔ بڑے موقع کی جگہ تھی۔ ناظم کتب خانہ
ہمارے ہی جوار کے لوگ تھے۔ یعنی قصبہ کنتور ضلع بارہ بنکی کے امامیہ
خاندان کے لوگ مولوی سید تصدق حسین، سید عباس حسین وغیرہم
اکثر یہاں آنا ہوتا رہتا۔ اور یہ لوگ بڑے اخلاق و محبت سے پیش آتے
رہتے۔ حالانکہ میں کم عمر تھا، اور یہ لوگ اچھے خاصے مسن تھے۔ کتابیں اپنی
تعداد کے لحاظ سے بھی وافر تھیں۔ اور بعض ان میں سے نوادر کے حکم میں
تھیں۔ یہیں ایک صاحب اور بھی تھے۔ اور اپنے عجیب و غریب کمالات
کے لحاظ سے ملنے کے قابل تھے۔ نام عبداللہ خاں راولپنڈی کی طرف
کے کہیں کے رہنے والے تھے۔ بالکل مجرد خوب گراں ڈیل سرحد والوں
کی طرح۔ ادھیڑ سن کے، اب ہجرت کر کے یہیں کے ہو گئے تھے، اُمّی محض
نام تک بھی نہیں لکھ سکتے تھے۔ لیکن علم کے شوق کے ساتھ حافظ کا کمال یہ تھا کہ
خدا معلوم کتنی کتابوں کے نام متعلقہ عبارتوں کے ساتھ بہ قید صفحہ و کالم
ازبر تھیں، اور کتابیں محض اردو کی نہیں فارسی اور عربی کی بھی خصوصاً
فن تاریخ کی۔ انھیں دیکھ کر اور ان کی باتیں سُن کر اگلے محدثین کی
حیرت انگیز قوت حفظ کی جو کرامتیں مشہور ہیں، وہ عین الیقین کے درجہ

میں نظر آنے لگتی تھیں۔ کتابوں کا کاروبار کرتے تھے۔ اور اس وقت کے اہل علم مولوی عبدالحق مرحوم وغیرہ سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ مولانا شبلی سے بھی تعلقات رہ چکے تھے ـــ

بات کتب خانہ سے رونق کتب خانہ تک پہنچ گئی، اب ظاہر ہے، کہ کتب خانہ اس ہئیت وصورت کے ساتھ کہاں باقی رہ سکتا تھا، "آصفیہ" کا نام ونشان مٹ کر کتب خانہ " اسٹیٹ لائبریری" میں تبدیل ہوگیا ہے۔ اور اس پرانے نام سے، دور ایک نئی جگہ نئی شان سے قائم ہے عمارت جدید[1] طرز کی اور عالی شان، وسیع احاطہ، نئی وضع، نیا سامان عربی، فارسی کتابوں کا ذخیرہ اب بھی خاصہ ہے اور بعض نوادر کے لحاظ سے قابل دید البتہ یہ مشرقی ذخیرہ اب نیچے کی منزل میں ہے، جہاں دن دھاڑے بھی لکھنے پڑھنے کے کام کے لئے بجلی کی روشنی ناگزیر ہے۔ اور یہ تو اب جدید سرکاری اور نیم سرکاری عمارتوں کے فیشن میں داخل ہوچکا ہے کہ کمروں کے اندر سارا کاروبار بجائے

---

[1] جدید طرز کی یہ عالی شان، وسیع وعریض عمارت، رود موسیٰ کے کنارے نظام سابق اعلےٰ حضرت میر عثمان علی خاں کے دور حکومت میں بصرف زر کثیر تعمیر کی گئی۔ عربی، فارسی، اردو، انگریزی کتابوں کی کثیر تعداد مخطوطات نوادرات بھی اس دور میں مہیا کئے گئے۔ (محمد احمد خاں حیدرآبادی)

سورج کی روشنی کے، بجلی کی مصنوعی روشنی میں کیا جائے) ہندی
اور انگریزی کی کتابوں پر پورا زور ہونا ہی تھا. مرہٹی وغیرہ کا بھی دور
دورہ ہے، البتہ اردو کے ساتھ سوتیلے پن کا رویہ اس پردیش میں
بھی دکھائی دیا، اردو کی اتنی انجمنوں اور اردو کے اتنے ہمدردوں
اور کارکنوں کے باوجود، اردو کی نئی کتابوں کی کوئی فہرست باہر
آویزاں نہ ملی، بہ خلاف انگریزی اور ہندی کے، کہ ان کے تازہ مطبوعات
کے نام مع ان کے تعارف کے بورڈ پر چسپاں تھے، اور اس ایک جزئیہ
کے لحاظ سے حیدرآباد کی اسٹیٹ لائبریری کی زمین لکھنؤ کی پبلک
لائبریری کے آسمان کے ہم رنگ ہی نکلی!

کتب خانہ سالار جنگ

کتاب کے کیڑے کی اصلی دلچسپی کی جگہ کتاب گھر ہی ہوتے ہیں
اور یہی شوق شہر کے ایک دوسرے مشہور کتب خانہ سالار جنگ
لائبریری لے گیا۔ نوادر کے اعتبار سے یہ کتب خانہ مشہور رہا ہے، کئی
بار پہلے کا دیکھا ہوا تھا۔ واقع اب بھی اسی جگہ ہے. یعنی سالار جنگ
کی ڈیوڑھی میں لیکن عمارت بالکل نئی اور دومنزلی بڑی حد تک، اپٹوڈیٹ
لائبریری کے کارکن اچھے ملے۔ بڑی خوش اخلاقی سے ایک ایک چیز

دکھاتے بتاتے رہے اور یہیں ملاقات تفصیلی (علاوہ دوسرے موقعوں کے) مولوی نصیر الدین ہاشمی سے رہی پڑھے لکھوں اور تحقیق کام کرنے والوں میں کون ان سے ناواقف ہوگا! اپنی ذات سے خود ایک زندہ کتب خانہ ہیں۔ کتنی کتابوں اور کتاب سازوں کے نام پتے، خصوصیات کے حافظ ـــ اور کتب خانوں کی ترتیب، فہرست سازی وغیرہ کے ماہر۔ ڈیوڑھی پہنچ کر خود سالارجنگ ثالث نواب یوسف علی خاں مرحوم کی یاد تازہ ہوجانا امر طبعی تھا۔ ان کا شاہانہ، سجاوٹ کا ڈرائنگ روم، قد آدم تصویریں قدِ آدم آئینے، کھانے کی میز رئیسانہ تکلفات سے بھرپور، ان کی دلچسپ گفتگو ان کے وسیع مطالعۂ مغربیات کی آئینہ دار اور ان کی اس پردیسی کے ساتھ خصوصی شفقت، ایک ایک چیز سینما کے پردوں کی طرح حافظہ کے سامنے آتی جاتی رہی اور دل کو دنیا کی ناپائیداری اور اس سے عبرت کا سبق دیتی گئی۔

اونچے اونچے مکاں تھے جن کے بڑے آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
اب نہ خود ہیں نہ ہیں مکاں باقی نام کو بھی نہیں نشاں باقی

مرحوم دنیا سے لاولد گئے۔ ان کے زمانے تک یہ کتب خانہ انکا ذاتی و شخصی تھا، اب پبلک ہوگیا ہے۔ مرحوم تک مجھے لانے والے، اور ان سے ملانے والے، میرے ایک مخلص، بزرگ دوست سید

امین الحسن بسمل مرحوم تھے۔ انھیں کی ریاست کے سیشن جج اور ناظم تھے۔ ان کی کچہری بھی اسی احاطہ کے اندر ایک الگ عمارت میں تھی۔ ان کے اجلاس کے کمرہ کا منظر بھی نظر کے سامنے ہوگیا۔

دیگر کتب خانے

کتب خانے شہر میں اور بھی متعدد ہیں اور بہت اچھے اچھے ہر ایک تک رسائی اور وہ بھی محدود وقت میں کہاں ممکن تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی، لائبریری اور بعض ذاتی کتب خانوں مثلاً شہرۂ آفاق ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی، ثم فرانسوی کے عزیز قریب ڈاکٹر یوسف الدین کے کتب خانہ کے نہ دیکھ سکنے کا افسوس آج تک قائم ہے، لاکھوں کی آبادی والے بڑے شہروں میں ایک بڑا مرحلہ سواری کا ہوتا ہے میلوں اور کوسوں دور محلوں تک بہ آسانی پہنچنے کی کوئی سبیل نہیں جب تک کوئی ہمہ وقتی تیز رفتار سواری اپنے قبضہ میں نہ ہو، یہاں بھی لائبریریوں وغیرہ تک پہنچنے کے لئے یہ سوال برابر سامنے آتا رہا۔ لیکن بڑی حد تک سعودی امداد و اعانت سے حل بھی ہوجاتا رہا سعودی سے ذہن کہیں شاہ سعود والئ نجد و حجاز کی طرف منتقل نہ ہونے لگے۔ اس لیے اسی لمحہ یہ بھی سن لیجیے کہ یہاں مراد مخلص و محب قدیم پروفیسر

ہارون خاں شیروانی کے صاحبزادہ سعود سلمۂ ہیں، جو ایسی ہر ضرورت کے وقت اپنا موٹر لیے حاضر و کمربستہ رہتے تھے۔

مجلس تعمیرِ ملّت

شہر میں ملّی ادارے، چھوٹے بڑے اور گرم و نرم، خدا معلوم کتنے قائم ہیں، سب تک پہنچنے کی نہ ہمت ہی ہوئی اور نہ فرصت تھی، نہ ضرورت البتہ ایک ادارہ ضرور ایسا دیکھنے میں آگیا جو شہر ہی کی نہیں ساری ریاست کی ملی زندگی میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور جس کو دیکھے بغیر واپس چلے جانا خود اپنی محرومی شمار کرتا۔

مجلس کا نام تعمیرِ ملّت۔ کوئی بارہ سال سے قائم ہے۔ صدر مجلس سید خلیل اللہ حسینی، ایم۔اے۔ ایل۔ایل بی سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ سرگرمیٔ عمل مجسم ہیں، اور اس جوش کے ساتھ ہوش کے بھی بڑے حصہ دار۔ جوان، سن و سال کے اعتبار سے بھی ہیں اور اس سے کہیں زیادہ ہمت و عزم کے لحاظ سے۔ مجلس کے قیام کو کوئی ۱۲ سال ہوئے۔ اور ۱۹۴۸ء کے بعد سے ملت میں جو افسردگی، انتشار، ہراس بلکہ سراسیمگی پیدا ہوگئی تھی اس کے دور کرنے اور مسلمانوں میں ازسرِنو اعتمادِ نفس پیدا کرنے میں بڑا دخل اسی مجلس کو ہے۔ مجلس کا نصب العین، جیسا کہ

اس کے نام سے ظاہر ہے تعمیر ہے، تخریب نہیں۔ ٹھوس کام کرنا ہے محض نعرے لگانا اور جلوس گشت کرانا نہیں۔ جدوجہد اسلام کے خمیر میں داخل ہے، لیکن بزم کا رنگ رزم پر غالب ہے۔ جوانی کی طراری پیر دانا کی ہوشمندی کے سایہ میں قدم بڑھا رہی ہے۔ ایک اسٹیڈی سرکل قائم ہے۔ جو اقبال و بہادر یار جنگ کے رنگ میں اسلام کے حقائق و معارف پر غور و مطالعہ کے بعد ان تعلیمات کو پھیلاتا، نشر کرتا رہتا ہے۔ اور دین کو ایک مکمل نظام حیات و دستور زندگی کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ یوم رحمتہ للعالمین کے سلسلے میں مجلس خوب خوب مقالے لکھواتی رہتی ہے، مدرسے چلاتی ہے۔ طلبہ کو وظیفے دیتی ہے۔ اور نظر ملت کی مختلف جماعتوں کے اتحاد پر خاص طور سے رکھتی ہے۔ کمیونزم، الحاد، اور ہر گمرہی کا مقابلہ اصلاحی انداز سے کرتی ہے۔ شعور دینی و ملی کو بیدار کرتی ہے۔ زور کردار سازی پر دیتی ہے۔ سیرت طیبہ، تفسیر، حدیث، فقہ سارے ہی دینی علوم کو تعلیم میں شامل رکھتی ہے۔ کالج گروپ اور اسکول گروپ قائم کر کے انعامات نقد دیتی ہے۔ اور رقموں سے بھی ہمت بڑھاتی ہے اور تصنیف تالیف اُردو ہی میں نہیں، انگریزی میں بھی کراتی رہتی ہے۔

مدینہ مینشن کے نام سے ترا ین گوڑہ میں سر نظامت جنگ مرحوم کی بڑی وسیع حویلی میں مجلس کا دفتر ہے۔ سر نظامت جنگ کی شخصیت

خود قابلِ قدر رہی۔ انگریزی پر عبور اہل زبان کی طرح، بے تکلف انگریزی نظموں کا ایک بڑا سا مجموعہ اپنی یادگار چھوڑ گئے، سب سے پہلے ان کی نظمیں مولانا محمد علی کے کامریڈ میں پڑھنے میں آئی تھیں۔ وزیر سیاسیات تھے اور بڑے پختہ اور صاحب نظر مومن۔ حسنات اور کار خیر کی لمبی فہرست میں آخری یہ اضافہ کر گئے کہ ایک لق ودق عمارت اس مجلس کو دے گئے۔ دفتر جا کر دیکھا تو سلیقہ مندی، حسن انتظام، کارکردگی کا ایک مثالی نمونہ پایا۔ ہر چیز نہایت صاف ستھری بڑے ڈھنگ اور قرینہ سے لگی ہوئی، سوا تصویروں کے حصہ کے کہ اس سے اپنے ذوق کو کسی طرح ہم آہنگ نہ کر سکا۔

مجلس کے ارکان سے بھی مل کر فرحت و مسرت حاصل رہی اور ایک مردم بیزار شخص سے اس کا اظہار ہونا بڑی بات ہے۔ ان میں کوئی فلسفہ کا اُستاد ہے اور کوئی کمیونزم کے دام سے نکل کر آیا ہوا نومسلم جو کل تک کمیونزم کا پروپگنڈسٹ تھا، آج اسلام کا مطیع ہے یہ فلاں فلسفہ میں ایم اے ہیں، وہ فلاں مشہور شاعر۔ فلاں ادیب اور اور فلاں خطیب۔ اب سب خدمت دین و ملت میں لگے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے شریک۔ جس طرح ایوان اردو میں قدم رکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ اردو بھی کوئی بدقسمت اور مظلوم زبان ہے

اسی طرح تعمیر ملت کے احاطہ میں اگر یہ خیال کرنا مشکل ہو گیا کہ ملّت اسلامی
بھی کوئی منتشر بدنظم و پراگندہ حال اور غیر مطمئن جماعت ہے۔

بدرالدین طیّب جی

قیام ابھی حیدرآباد ہی میں تھا کہ اتفاق سے مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ کے وائس چانسلر بدرالدین طیّب جی صاحب ادھر آنکلے اور
میرے میزبان اور علی گڑھ کے مشہور فدائی ناظر یار جنگ بہادر نے انھیں
اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے عصرانہ دے دیا۔ ان "بوڑھے
لڑکوں" کے کرتا دھرتا، یہاں جوان ہمت پروفیسر حبیب الرحمٰن ہیں،
(انجمن ترقی اُردو والے) ان کا حسن انتظام کوئی کور کسر کیسے رہنے دیتا
اس تقریب میں بہت سے علی گڑھیوں سے ملاقات ہو گئی۔ ان میں سے
اکثر کا شمار یہاں کے عمائد میں ہوتا ہے۔ نیاز خود طیب جی صاحب سے
حاصل ہوا۔ اور انگریزی تقریر اور گفتگو سننے کا اتفاق ہوا۔ آدمی وجیہہ
شریف اور بڑے صاحب عمل و کردار نظر آئے۔ علی گڑھ کی کشتی کو
اس نازک وقت میں کھینا کوئی آسان چیز نہیں۔ ایسے میں ان کا دم غنیمت
ہے۔ جبکہ کردار و ایمان کی کمزوری کی کئی کئی بڑی ہی افسوسناک مثالیں
مسلمانوں کے اونچے اور صاحب اثر طبقہ میں موجود ہیں۔ اللہ فتنہ و شر

کے ماحول میں انھیں ہر طرح محفوظ رکھے ۔

فخر دکن

طویل ہفتہ کے قیام میں آنا جانا بہت جگہ رہا، افراد کے یہاں بھی اور اداروں میں بھی. لیکن سہو و نسیان تو انسان کے دم کے ساتھ لگا ہوا ہے ۔ ایک جگہ جانے کی لازمی تھی، اور اس وقت اس کا خیال نہ آیا۔ اس بے خیالی پر تو اب بھی پچھتاوا ہے ۔ حیدرآباد کا اتنا لمبا سفر روز روز کیونکر ممکن ہے اور عمر کی اس منزل پر پہنچ کر اب دوبارہ سفر کا تو کوئی قرینہ ہی نہیں نظر آتا، اسی لئے قدرتاً قلق بھی زیادہ ہے ۔ ان قابل زیارت جگہوں میں نمبر اول پر فخر دکن بلکہ فخر ہند ڈاکٹر حمید اللہ[1] فرانسوی کے مکان کا آتا ہے ۔ سچے مجاہد اور سچے مہاجر کی مثال انھیں کی ذات میں ملتی ہے ۔ علم و دین دونوں کے لیے بہ یک وقت وقف کئے ہوئے

---

[1] ڈاکٹر محمد حمید اللہ ایم، اے، ایل، ایل، بی (عثمانیہ)، ڈی لٹ (پیرس)، جامعہ عثمانیہ کے قابل فخر فرزند. دکن کے مایہ ناز سپوت کئی کئی کتابوں کے مصنف، استادوں کے استاد اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں

لیاقت علی خاں کے دور وزارت عظمیٰ میں اسلامی دستور کی تدوین کے سلسلہ میں، جو بورڈ آف تعلیمات اسلامی قائم ہوا تھا. اس کے رکن رہے. تقریباً دو سال کراچی میں قیام رہا. پھر کچھ دل برداشتہ ہو کر پیرس چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی ۔ (محمد احمد خاں حیدرآبادی)

اس وقت ایک انھیں کی شخصیت ہے جس نے محض اپنے عقیدہ کی خاطر عمر بھر کے لئے جلاوطنی اختیار کرلی۔ لازم تھا کہ ان کے مکان پر حاضری دیتا۔ ان کے رہنے سہنے اور سب سے بڑھ کر ان کے لکھنے پڑھنے کی جگہ کی بست عقیدت سے جاروب کشی کرتا۔ موقع ہاتھ آکر محض سہو و غفلت کی نذر ہوگیا۔ اب یہ چند سطریں بطور سجدہ سہو کے ہیں۔ دو ایک جگہ کی اور ضروری حاضری بھی اس طرح رہ گئی، گو ضروری اس درجہ میں نہ تھی۔

دھوم تھی شہر میں کہ داغ آیا

آغاز سفر سے پہلے ہی بڑا دھڑکا یہ لگا ہوا تھا کہ کہیں خلقت کا ہجوم نہ ہو جائے، اسٹیشن پر پیشوائی کرنے والوں کا یا گھر پر ملنے والوں کا۔ صدق بلکہ اس کے پیش رو "سچ" کو اللہ نے جو مقبولیت حیدرآباد میں دے رکھی تھی، اس کے لحاظ سے یہ اندیشہ خواہ مخواہ نہ تھا، اور حیدرآباد کا مقبول و معروف روزنامہ رہنمائے دکن حلقہ دق کو برابر وسیع سے وسیع تر کرتا رہا ہے، اس لئے ہجوم خلق سے بچنے کے لئے پیش بندی یہ کی کہ اپنے خصوصی مخلصوں کو پہلے ہی سے لکھ بھیجا، کہ آمد کی خبر ہرگز وہاں کے اخباروں میں نہ چھپنے پائے۔ ورنہ اپنی جان غضب میں ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ طبیعت پر گرانی اس درجہ بڑھ جائے کہ مدت قیام ناتمام چھوڑ کر اور

بغیر خاص لوگوں سے ملے ہوئے ہی واپس چلا آنا پڑے۔ الحمد للہ، کہ استدعا قبول ہو گئی، کسی اخبار نے اشارہ تک آمد کا نہ کیا۔ اور بجز ایک خصوصی مخلص کے جو شب میں قاضی پیٹ جنکشن تک پہنچ گئے تھے، اور کوئی باخبر بھی نہ ہوا اور یہ صاحب بھی اس درجہ لحاظ رکھنے والے تھے کہ رات کو انھوں نے جگانا یا سکون میں خلل ڈالنا کسی طرح مناسب نہ سمجھا بلکہ اسی ٹرین میں بیٹھ کر صبح تڑکے سکندر آباد جنکشن پر آکر ملے، اور دن نکلنے کے بعد جب حیدر آباد خاص پر اترا ہوں، بجز گنتی کے دو چار مخصوص عزیزوں و مخلصوں کے اور کوئی نہ تھا! مقبولیت و مرجعیتِ خلق تو اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ لوگ اس کی تمنا میں رہتے ہیں۔ اس کی تدبیریں کرتے رہتے ہیں، لیکن اپنا اپنا ظرف ہے۔ بعض سے اس نعمت کا تحمل ہی نہیں ہوتا۔ اور اپنا شمار بھی اسی طبقہ میں ہے۔ اور جس نعمت کا تحمل اپنے ظرف کو نہ ہو سکے، تمنا اس کے حصول کی نہیں، اس سے محرومی ہی کی کرتے رہنا چاہیئے۔ جب زبان پر قابو نہ ہو اور قلب بھی مجمع کے سامنے بجائے انشراح کے انقباض ہی محسوس کرے۔ تو ایسے حال میں عقل و دل دونوں کا مشورہ گوشہ گیری یا مردم بیزاری ہی کا ہے۔ اور اس مشورہ پر عمل بھی اب ۲۵، ۳۰ سال سے ہے۔ مجمع میں گھس کر فریضۂ تبلیغ ادا کرتے رہنا، سلسلۂ دعوت کو عام رکھنا، کام عالی ہمتوں، جوان مردوں کا ہے۔

بدمستوں کی راہ اس سے بالکل مختلف دوسری ہے۔

زاہد نہ داشت تاب جمال پری رخاں
کنجے گرفت و ترسِ خدا را بہانہ ساخت

بہرحال یہ بہانہ سازی بڑے موقع پر کام آجاتی ہے، اور ترسِ خدا کا نقاب اختیار کرلیتی ہے۔

بھولے، بامروّت، مہمان نواز حیدرآبادی

لیکن بات چھپی کب تک رہتی۔ ایک نے دوسرے سے کہا، دو نے دس سے، اور دس نے بیس سے۔ اور خلقت کا تانتا لگنا شروع ہوگیا یہ آرہے ہیں، اور وہ فلاں آرہے ہیں اور فلاں تنہا بھی اور ٹولیاں بناکر بھی۔ موٹرنشیں بھی اور پاپیادہ بھی، کیا صبح اور کیا دوپہر اور کیا شام وقت ناوقت کی کوئی قید نہیں گویا زُو (چڑیا گھر) میں کوئی عجیب الخلقت جانور آگیا ہے۔ اور تماشائیوں کے ٹھٹ اس کے دیکھنے کو لگ رہے ہیں اور پھر کن کن توقعات اور کیسی کیسی خوش اعتقادیوں کے ساتھ! خلق کو فریب دے دینا کس درجہ آسان ہے۔ اور پھر حیدرآباد کی مخلوق تو شاید کچھ اور زیادہ ہی بھولی اور سریع الاعتقاد ہے۔! اف رے مالک و مولا کی ستاری! کیسے کیسے ذرّوں کو آفتاب بناکر دکھایا جاتا ہے! کتنے

سفلیوں کو روپ علویوں کا دے دیا جاتا ہے کتنے سنگ ریزوں میں تابش لعل و جواہر کی پیدا کر دی جاتی ہے، حیدر آبادیوں کے انس و محبت کا ان کی مسافر نوازیوں کا قائل تو شروع سے تھا۔ لیکن دعوتی تکلفات کا جو درجہ مشاہدہ میں آیا، اس حد تک اندازہ نہ تھا، آج یہاں عصرانہ ہے تو کل وہاں ظہرانہ اور پرسوں وہاں عشائیہ، دعوت، ایٹ ہوم کا ایک مسلسل چکر، اور بندھے ہوئے وقتوں کے علاوہ بے وقت بھی، چائے پیسٹری اور پھل پھلاری پر اصرار سارے کرم فرماؤں کے نام تو اب بھلا کہاں یاد رہ سکتے ہیں اور یاد ہوں بھی تو اتنی لمبی چوڑی فہرست درج کر کے داستان سفر کہاں تک پھیلاتے چلے جائیے۔ پھر بھی کچھ نام لانے اور تذکرے کرنے بہرحال ناگزیر ہیں، کہ ان سے خود اپنے دل کو مسرت حاصل ہوگی، جیسا کہ قبل کے نمبروں میں مختلف اداروں کے ذیل میں مختلف شخصیتوں کے تذکرے میں حاصل ہو چکی ہے

جامعۂ عثمانیہ، اساتذۂ جامعۂ عثمانیہ

قدرتاً سابقہ سب سے زیادہ یونیورسٹی والوں سے رہا۔ یونیورسٹی کو اس زمانہ میں دیکھا تھا، جب وہ شہر میں تھی، اور صرف چند بڑے کمروں اور برآمدوں اور چھوٹے چھوٹے صحنوں کا مجموعہ تھی۔ اب اس کے شباب کو اسکے بچپن سے کیا نسبت! شہر سے باہر اور مرکزی آبادی سے میلوں دور خود

ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ میلوں کے رقبہ میں آباد۔ یہ شعبہ قانون ہے، وہ آرٹس کالج، ادھر سائنس کی عمارتیں ہیں، ادھر لائبریری کی، ایک سے بڑھ کر ایک۔ شاندار لق ودق، مرعوب کن۔ وقت، گھنٹوں کا نکال کر سیر کی جائے۔ تھک جائے گا اور سیر تمام نہ ہو سکے گی۔ صدق نوازوں میں ایک استاد شعبہ نباتات میں کپتان فتح یاب خاں ہیں۔ خوب ملے اور خوب کھلایا پلایا۔ شعبہ مذہب، و ثقافت کے استاد ڈاکٹر یوسف الدین، پرانے ملنے والے نکلے۔ کئی کئی کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں۔ ایک بڑے علمی خاندان کے، ڈاکٹر حمید اللہ کے عزیز ہیں۔ خود بھی سر تا پا علم ہیں، بلکہ علم داں بھی۔ نئی نئی کتابوں کے عنقریب طبع و اشاعت کی خوشخبریاں انھیں سے سننے میں آئیں خصوصاً فن حدیث میں مُصنّف عبد الرزاق کی۔ گھنٹوں ان سے صحبت رہی اور ہر بار یہ گمان گزرتا تھا کہ کسی اچھے کتب خانے میں بیٹھے ہوئے معروف مطالعہ ہیں یا پھر الملل والنحل (شہرستانی) کے قسم کی کتاب کے ورق سامنے کھلے ہیں۔ اللہ ان کے کام میں برکت دے، ان سے بڑی بڑی توقعات ہیں۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید صوفی منش شخصیت رکھنے والے شعبہ فارسی کے صدر رہیں، صدق کے قدر دان اس زمانے سے جب وہ "سچ" کے نام سے نکلتا تھا، اور یہ خود کالج کے ابتدائی درجوں کے طالب علم تھے، فاضل گیلانیؒ کے چہیتے اور رشید شاگردوں میں تھے، ان سے مل کر شخصی علمی

دینی ہر حیثیت سے کتنی ہی خوشگوار یادیں تازہ ہوگئیں اور یہ معلوم ہونے لگا کہ جیسے کچھ دیر کے لئے کسی بوڑھے کی جوانی پلٹ آئی ہو!

شعبۂ تاریخ اسلام کے اُستاد ڈاکٹر ابو نصر خالدی اپنے رنگ میں سب سے منفرد ہیں، بڑے مخلص گہرے مذہبی۔ اپنا دل کھول کر رکھ دینے والے ساتھ ہی بڑے پڑھے لکھے، کہاں کہاں کی کتابیں دیکھ ڈالنے والے۔ قرآنیات کے سلسلہ میں دو ایک کتابیں ایسی ہدیۂ پیش کر دیں، جو اس کے قبل کہیں نظر سے نہیں گزری تھیں۔ جزاہ اللہ! دعوت تو ایسی کی کہ دوسروں کے لیے نظیر اور قابل تقلید، یعنی کھانا نہایت لذیذ لیکن بس دو ہی ایک چیزیں۔ یہ نہیں کہ عام رواج کے مطابق دس چیزیں لاکر سامنے لاکر رکھ دیں۔ معدہ اس تعدد و تنوع سے الگ خراب ہو، اور نیت پھر بھی نہ بھرے کہ اپنے پسند کی کوئی ایک چیز بھی سیر ہو کر نہ کھائی جا سکی، بس اسراف ہی اسراف ہاتھ آیا۔ اور میاں منظر احسن گیلانی سلمہٗ (استاد معاشیات) کی تو کچھ پوچھیے ہی نہیں وہ کیا ملے گویا مدت کا ایک بچھڑا ہوا عزیز مل گیا۔ میرے ایک عزیز ترین دوست و بزرگ مولانا مناظر احسن گیلانی کے آخر چھوٹے بھائی ہیں۔ صورت و سیرت دونوں میں انھیں کے مثیل و نظیر! نماز مغرب عمدًا انھیں سے پڑھوائی۔ آواز میں کچھ ویسا ہی درد ویسا ہی رس جیسا فاضل گیلانی کی آواز میں تھا۔ وہ مسجد دکھائی جہاں مولانا

اور مولانا عبدالباری سلمہ اللہ نماز پڑھتے تھے۔ وہ مقامات دکھائے جہاں یہ دونوں لکھتے پڑھتے، اٹھتے بیٹھتے تھے۔ یونیورسٹی کے دو اور استادوں کی بھی اسلامیت کی تعریف کئی زبانوں سے سننے میں آئی۔ ایک ڈاکٹر ولی الدین (فلسفہ) دوسرے پروفیسر صلاح الدین کی۔ افسوس ہے کہ دونوں سے ملاقات کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔

ڈاکٹر میر ولی الدین اب یونیورسٹی میں ضابطہ سے ہوں یا نہ ہوں، بہرحال ان کا تصور یونیورسٹی سے الگ کیونکر کیا جاسکتا ہے، جتنی بار ملئے طبیعت سیری حاصل نہ کرے، ملاقات کی خواہش کچھ اور بڑھتی ہی جائے اور کچھ بیجا نہ ہوگا اگر انھیں سے ملنے اور ان سے استفادہ کے لئے خود ایک سفر حیدرآباد کا کیا جائے۔ فلسفہ، تصوف، اسلامیت کے جامع۔ ایک خاص تجربہ یہ ہوا ہے کہ جہاں وہ دماغ کے لحاظ سے فلسفی ہیں، اور قلب کے اعتبار سے صوفی ہیں، ان کے دسترخوان پر جب بیٹھے تو نہ یہ معلوم ہو کہ یہ نان جویں پر بسر کرنے والے کوئی صوفی مرتاض ہیں اور نہ تکلفات کے نقاضوں سے بے زار، کوئی خشک مزاج فلسفی، بلکہ ایوانِ نعمت ہیں۔ کیا بہ لحاظ رنگا رنگی اور کیا بہ لحاظ مقدار رئیسوں، جاگیرداروں کو بھی سبق پڑھا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف

داستان کا یہ ٹکڑا اتمام تر ناقص رہے گا، اگر ذکر کسی قدر تفصیل

سے ایک حیدر آبادی شخصیت ڈاکٹر عبداللطیف کا نہ آئے، اب تو ریٹائر ہو چکے ہیں۔ لیکن اُستادوں کے استاد رہ چکے ہیں، یعنی ان کے پڑھائے ہوئے ان کے سکھائے ہوئے، درجہ فضیلت پاس کر کے خود اپنے فن کے یونیورسٹی میں اُستاد بھی بنے، اور اب وہ بھی ریٹائر ہو چکے ہیں۔ آنکھوں کے مریض اور اب دنیا کے ہنگاموں سے کچھ الگ تھلگ سے رہتے ہیں، پھر بھی بڑی گہری نظر دنیا کے حالات پر رکھتے ہیں۔ یونیورسٹی میں استاد تو شاید انگریزی ادب کے تھے، لیکن اب تو ان کی ماہرانہ نظر سیاسیات عالم پر رہتی ہے۔ سرسری نیاز ان کی خدمت میں پہلے سے تھا، لیکن خوب ہوا کہ اب کی ملاقاتیں بار بار اور خوب کھل کر رہیں۔ بدگمانی ان کی طرف سے دل میں یہ جمی ہوئی تھی کہ یہ تجدد مآب ہیں۔ مل کر معلوم ہوا کہ، نہیں ان کے دل میں بڑی اسلامیت ہے۔ مڈل ایسٹ (مشرق وسطی) کے کسی انسٹی ٹیوٹ کے سرکاری طور پر ناظم ہیں، اور مسلم ملکوں کے حالات و انقلابات سے خوب باخبر ہیں۔ ان ملکوں کی تجدد مآبی اور فرنگیت کا ذکر بڑی دردمندی سے کرتے رہے

سلہ ڈاکٹر سید عبداللطیف پی، ایچ۔ ڈی (لندن) انگریزی زبان کے ماہر غالب کے نقاد، برصغیر ہند کو ثقافتی وحدتوں (CULTURAL ZONES) میں تقسیم کرنے کے محرک (PAKISTAN ISSUE) اور دیگر کئی کتابوں کے مصنف، آخری عمر میں قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا، کچھ عرصہ قبل داعی اجل کو لبیک کہا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ (محمد احمد خاں حیدر آبادی)

اور دنیا کے بعض بہترین مبصرین (مثلاً شہرہ آفاق پروفیسر ٹائن بی) سے ان کے گہرے تعلقات ہیں اس نے انھیں خود ایک بڑا مبصر بنا دیا، میں نے متعدد معاملات میں ان کے وسیع معلومات اور رچے تلے تبصروں سے استفادہ کیا ایک روز انھوں نے بڑے وسیع پیمانہ پر پرائیوٹ ہوم (عصرانہ) دیا، اس میں کہنا چاہیئے کہ پورے شہر کا عطر کھنچ کر آگیا تھا، کتنوں سے ملاقات گھنٹہ سوا گھنٹہ کے اندر ہوگئی۔ اور مولانا بادشاہ حسینی سے ملاقات یہیں ہوئی، مگر افسوس ہے کہ موقع زیادہ بات چیت کا نہ مل سکا، ڈاکٹر محمد مسعود حسین خاں (شعبہ اردو) بھی یہیں دکھائی دیے۔ علاوہ ان سے ذاتی تعلقات کے ان کے بزرگوں سے بھی دیرینہ اور مخلصانہ تعلقات ہیں۔ لیکن ان سے ملاقات کی توقع تشنہ ہی رہی۔ عزیز مرزا مرحوم کے دو صاحبزادوں احمد مرزا اور ابوسعید مرزا سے بھی ملاقاتیں یہیں ہوئیں گو احمد مرزا اتنے فاصلہ پر تھے کہ ان سے بات چیت کی حسرت ہی رہ گئی۔ عزیز مرزا مرحوم اپنے دور کے مشاہیر ملت میں تھے، علی گڑھ کے بڑے ممتاز اولڈ بوائے، حیدرآباد کے ہوم سکریٹری، اور یہاں سے ہٹنے کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری۔ ابھی ادھیڑ ہی سن کے تھے کہ ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ میں پیام اجل آگیا۔ یہ لڑکے سب کم سن ہی تھے۔ میں بی۔ اے کا طالب علم تھا، ان بے چاروں کی تازہ یتیمی اور مرحوم کی کوٹھی کے

ماتم کدہ میں تبدیل ہو جانے کا منظر سب آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔!!

ڈاکٹر عبداللطیف کے تعلقات مولانا ابوالکلام سے خصوصی تھے۔ان کی ایک آدھ کتاب کو انگریزی کے قالب میں یہ لائے ہیں۔ان کے زمانہ علالتِ وفات میں یہ وہیں انھیں کی کوٹھی پر مقیم تھے۔انھیں کے بیان سے معلوم ہوا کہ مرحوم جب سے غش کھاکر گرے پھر ہوش نہ آیا، اور نہ کچھ بول ہی سکے۔صرف ایک بار وقتِ وفات سے چند گھنٹے قبل ذرا سے آثار ہوش آنے کے معلوم ہوئے۔ڈاکٹری تدبیروں سے سخت کرب واذیت میں تھے، ہونٹ ہلے اور آواز صرف اتنی سنائی دی، کہ

'چھوڑ دو، بس خدا پر چھوڑ دو'

اور بس پھر کوئی آواز اس عالم آب وگل میں نہ نکل سکی!۔مبارک اور خوش قسمت ہے وہ مسلمان جس کی زبان کا آخری کلمہ خدا کا نام ہو! مضطرب کی آخری پکار چارہ سازِ حقیقی کے نام کی!

کچھ اور مشہور شخصیتیں

مشہور میر تعمیر (ARCHITECT) فیاض الدین صاحب کا نام عرصہ سے کانوں میں پڑا ہوا تھا۔مگر خیال میں یہ بسا ہوا تھا کہ یہ دہلی یا نئی دہلی کے ہیں۔وہیں کی عمارتوں کے سلسلے میں ان کا نام ذہن میں تھا۔اب پتہ چلا کہ

یہیں کے ہیں۔ ایک سے زائد ملاقاتیں رہیں۔ فنی شہرت ملک گیر حاصل کئے ہوئے ہیں ــــ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے انھیں کو تو بہزاد دکن کا لقب دیا تھا ــــ اس سے قطع نظر یہ معلوم ہوا کہ قوم و ملت کے معاملات میں بھی دل دردمند رکھتے ہیں۔ تعمیر ملت والوں کے اجتماع میں خاصے پیش پیش تھے۔ اور بعض اور متفرق حضرات کی ملاقات کے نقش حافظہ پر رہ گئے۔ انھیں میں سے ایک شہر کے مشہور معالج ڈاکٹر عبدالمنان ہیں، ان کی حذاقت کے قصے اپنے عزیزوں کی زبانی سنے اور انجمن ترقی اردو کے عصرانوں میں ان سے ملنے کی بھی مسرت حاصل رہی۔ ایک اور ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر محمد عثمان خاں سے پروفیسر مناظر احسن گیلانی کے ہاں نیاز حاصل ہوا۔ یونیورسٹی کے سررشتہ ترجمہ میں ڈاکٹری کتابوں کے اردو مترجم تھے۔ اور رسالہ ہمدرد صحت وغیرہ میں اب بھی طبی مضمون برابر لکھتے رہتے ہیں۔ ایک اتفاقی حادثہ پیش آجانے سے چلنے پھرنے سے گویا معذور ہوگئے ہیں۔ اپنے فنی کمال کے ساتھ ماشاء اللہ ایسے زبردست صاحب ایمان ہیں کہ ان سے بات چیت کرکے دوسرے کا ایمان تازہ ہوجائے۔ اور ایک اور صاحب ملے یونس سلیم صاحب، ممتاز ایڈوکیٹ ہیں۔ اور ایک عرصہ تک صحافت کے کوچہ کی بھی ہوا کھاتے رہے ہیں، روزنامہ پیام والے قاضی عبدالغفار

(اللہ انھیں بخشے) کے رفیقوں، جلیسوں میں تھے۔ خود بھی محبت کے نظر آئے۔ ایسے ہی ایک نعت گو شاعر، مرزا شکور بیگ سے بھی مل کر خوش ہوا، پیشہ کے لحاظ سے شاید یہ بھی ایڈوکیٹ ہیں، اور پہلے مزاحیہ رنگ کی شاعری کرتے تھے، برجستگی آمد، اور بذلہ سنجی میں شوکت تھانوی مرحوم کے ہم طرح، اب شاید صرف نعت کہتے ہیں۔ اور تاثر میں ڈوب کر کہتے ہیں۔ اپنے دو محبوں عثمانیہ یونیورسٹی کے استادوں، مولانا مناظر احسن صاحب علیہ الرحمہ اور مولانا عبدالباری صاحب ندوی حفظہ اللہ کے متعدد شاگردوں سے ملاقاتیں رہیں۔ سب اچھے حال میں ہیں۔ اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان دونوں کا ذکر خیر ان کے شاگردوں کی زبانوں پر برابر جاری ہے۔ ایسا بھی اب کم ہی ہوتا ہے، ملنے والوں اور خاطر مدارت کرنے والوں کی فہرست مختصر و منتخب بھی ناتمام رہے گی، اگر نواب بہادر یار جنگ علیہ الرحمہ کے چھوٹے بھائی نواب ماندر خاں کا نہ لیا جائے۔ ملازمت پر کہیں باہر متعین ہیں۔ قیام کے بالکل اخیر زمانہ میں آئے، لیکن خلوص شدت، وقت کی قلت کی تلافی کے لئے بالکل کافی ہوگئی۔

سرکاری حلقوں میں رسائی کے موقع قدرتاً کم ہی نکلے۔ پھر بھی ڈاکٹر لطیف کے عصرانہ میں ایک وزیر میر احمد علی خاں، وزیر اوقاف سے تو نیاز حاصل ہی ہوگیا۔ ان کا ذکر خیر زبانی بھی بہت سن چکا تھا، اور ان کی

جرأت کے کارنامے اخباروں میں پڑھ چکا تھا۔ ہندوستان بھر کے ان گنتی کے دو تین منسٹروں میں ہیں، جو اپنے اسلام پر شرمندہ نہیں، اور سیکولرزم کے تقاضوں کے ساتھ اپنے ایمان کے مطالبات و واجبات کو ہم آہنگ رکھنے کی کوشش میں برابر لگے رہتے ہیں، ان کے چہرے، بشرے، انداز گفتگو سب سے اثر اچھا ہی قائم رہا، اور سادگی و تواضع و انکساری نومایاں تھی۔ ایک اور عہدہ دار محکمہ فنانس کے سکریٹری محامد اللہ صاحب عباسی کاکوروی سے بھی ملاقاتیں رہیں، آدمی پڑھے لکھے ہی نظر آئے، اور ساتھ ہی دین و ملت کے پورے دردمند، اپنے محکمہ میں نیک نامی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے بھی کام آنے والے۔ لادینیت اور دینداری دونوں کے مزاج اور تقاضے الگ الگ بلکہ اکثر ایک دوسرے کے متضاد اور دونوں کے تقاضوں کو بڑی حد تک نباہ لے جانا پل صراط پر چلنے سے کم نہیں، پھر بھی کچھ نہ کچھ خوشگوار نظیریں خوشگوار امتزاج کی اس دور میں بھی مل ہی گئی ہیں۔ ریاست مدراس میں افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مرحوم (صدر پبلک سروس کمیشن) اور ہماری اپنی اسٹیٹ میں سید صدیق حسن مرحوم (سینئر ممبر بورڈ آف ریونیو) کی خوشگوار مثالیں بہت کم تعداد میں سہی، بہر حال جہاں کہیں مل جاتی ہیں، پژمردہ اُمیدیں نئے سرے سے شاداب ہو جاتی ہیں۔ یہاں ایک بڑا طبقہ مشائخ کے لقب سے موسوم ہے۔ سلوک اگر صحیح معنی

میں ہو، جو ابوبکرؓ و علیؓ کا تھا، تو ظاہر ہے کہ اس کا کہنا ہی کیا! وہ تو ہر مسلمان کا عین ایمان اور بلند ترین نصب العین ہے، لیکن اس لفظ سلوک و تصوف کے پردہ میں جو ایک بڑا ملغوبہ اوہام و رسوم کا تیار ہو گیا ہے، اب اس پر کیا کہا جائے اور یہ اس کے کہنے کا محل کچھ ہے بھی نہیں۔ خوشی اس کی ہے کہ ملاقات اس طبقہ مشائخ کے ایک ایسے فرد سے رہی جس کا وجود اپنے طبقہ کے لیے باعث فخر ہے۔ مولوی شاہ قطب الدین الحسینی شہر کی مرجع عام درگاہ شاہ خاموشؒ کے صاحب سجادہ ہیں۔ صاحب علم ہیں۔ دینیات میں علامہ گیلانیؒ کے شاگرد رہے ہیں اور سارے لوازم سجادگی کے باوجود عثمانیہ یونیورسٹی کے ایم اے ہیں، حالانکہ وضع و قطع ایسی بنا رکھی ہے کہ انگریزی کے حرف شناس ہونے کا بھی گمان نہیں گزرتا۔ انگریزی زبان پر اتنے قادر کہ بے تکلف اس میں لکھ لکھا بھی لیتے ہیں۔ چنانچہ کچھ ہی روز ہوئے کہ اسلامی تعدد ازدواج کی حمایت میں ایک رسالہ انگریزی میں شائع کر چکے ہیں۔ اور صدق میں اس کا ذکر خیر بھی آ چکا ہے۔ سلسلہ چشتیہ صابریہ ہے۔ اگر ان کے سے پڑھے لکھے اور خدمت دین کا ولولہ رکھنے والے ان کے طبقہ میں اور پیدا ہونے لگیں تو کہنا چاہیئے کہ امت کے ایک خاصے بڑے حصہ کا بیڑا پار ہو جائے۔

حضرت عبداللہ شاہ :۔ شہر کے بزرگوں میں خصوصی

مرجعیت مقبولیت کے تاجدار حضرت عبداللہ شاہ نظر آئے جس سے بھی ملئے اُن کی عقیدت کا کلمہ پڑھتے ہوئے پایئے۔ میں ان کی اس حیثیت مشیخت سے تو کچھ زیادہ واقف نہ تھا۔ البتہ انھیں علوم دینی کا سرگرم خادم مدت سے جانتا تھا۔ محدث بغوی کی کتاب المصابیح کو سامنے رکھ کر حدیث نبویؐ کا جو ایک بڑا اچھا مجموعہ مشکوٰۃ المصابیح کے نام سے تبریزی نے تیار کر دیا ہے۔ اسے امت میں قبول عام حاصل ہوا۔ اور وہ صدیوں سے محدثین و فقہاء، دونوں کے ہاں مستند و معتبر چلی آتی ہے، مگر اس کے مؤلف شافعی ہیں۔ اپنے مذہب کی رعایت، انتخاب حدیث میں کر جانا ان کے لیے بالکل قدرتی تھا۔ حنفیہ اس باب میں پچھڑے ہوئے تھے۔ مولانا کو صدیوں کے بعد اس طرف توجہ ہوئی۔ اور ایک نیا مجموعہ اسی انداز کا حنفیہ کے نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھ کر زجاجۃ المصابیح کے نام سے کئی جلدوں میں شائع کر دیا۔ یہ کارنامہ بجائے خود اس قابل تھا کہ ان کی خدمت میں حاضری ضرور دی جاتی، اور ان سے اپنے حق میں دعائے خیر لی جاتی۔ اللہ انھیں عمر نوح عطا فرمائے، سن و سال اندازہ سے زیادہ نکلا قیام مسجد میں رہتا ہے ضعف نے بہت ہی نڈھال کر رکھا ہے۔ خوب ہوا کہ حاضری ہو گئی، چہرہ پر نور ہی نور تھا۔ بات چیت زیادہ کیا ہوتی، یہی بہت ہے کہ جو مقصود تھا، یعنی دعائے خیر لینا۔ وہ حاصل ہو گیا۔ ہاتھ پکڑ کر جب اپنے

ہاتھ میں لیا ہے، تو قلب کو وہ سرور اور ٹھنڈک محسوس ہوئی کہ جی یہی کہتا رہا، بس اب یہ ہاتھ اسی ہاتھ میں رہے اور اس کی گرفت کبھی نہ ڈھیلی ہونے پائے!۔ دستگیری جس اہل دل، جس اہل اللہ کی بھی نصیب ہو جائے ایک بے سہارے کے لئے بڑا سہارا ہے!!

مولانا فضلُ اللہ و مولانا ابوالوفا

طبقۂ علماء کی کافی بلکہ بھرپور نمائندگی کے لیے صرف ایک ہی ذات کافی ہو گئی، مولانا فضل اللہ سابق صدر شعبۂ دینیات کے علم و فضل کے شہرے عرصہ سے سننے میں آرہے تھے۔ مراسلت بھی ہو چکی تھی، دیدار کی نوبت اب آئی۔ امام بخاری کی الادب المفرد کو بڑے اہتمام سے شرح و حاشیہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اور مستشرقین کی دیدہ ریزی کے ساتھ اسے "ایڈٹ" کیا ہے۔ حدیث ہی کی خدمت مشغلہ زندگی ہے۔ صاحب حدیث کے انوار، کردار و اخلاق کو کہاں تک متاثر نہ کرتے صاف شان نائب رسول کی نظر آئی۔ علم و متانت، تواضع و انکسار کا ایک سرچشمہ اس پر علاوہ حدیث کے دوسرے علوم و فنون سے متعلق وافر معلومات کا ذخیرہ مستزاد۔ افسوس ہے کہ مولانا کو اس وقت شمالی ہند میں کام تھا اس لیے ملاقات کا موقع کم ہی ملا، پھر بھی جتنا ملا

دل ودماغ دونوں کی آسودگی ہی کاسامان فراہم کرتارہا۔شہر کے مشہور فاضل اورخادم دین، مولانا ابوالوفا افغانی اوران کے مشہور تر ادارہ معارف النعمانیہ کے نام اور کام سے ہند وبیرون ہند کے علمی ودینی طبقہ میں کون ناواقف ہے؟ حنفیہ کے قدیم علمی ذخیرہ کو اپنی بیش بہا خدمات سے گراں بار کردیا ہے اور ایسے انہماک اور یکسوئی کے ساتھ اس میں لگے ہوئے ہیں کہ جیسے دنیا کے اور کسی مشغلہ سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ خوب ہی ملے اور ایک کم علم وکم سواد مسافر کی خوب ہی قدر افزائی کی۔ مولانا باوجود اس کے کہ اُردو پر عبور ایک ہندوستانی کی طرح رکھتے ہیں، ہندی نہیں افغانی ہیں اور اس سن وسال پر بھی اپنے وطن سے بالکل بے تعلق نہیں ہوئے ہیں، کبھی کبھی اب بھی آنا جانا رہتا ہے۔ اور اپنی جوانی تک تو بارہا آئے گئے امیر امان اللہ خاں کے زمانہ میں ایک بار وہیں تھے، جب امیر کی بعض جدتوں اور رنگ تجدد سے ملک کی مذہبی طبقہ میں شورش پیدا ہوئی باتیں کچھ ایسی زیادہ متجددانہ نہ تھیں، پھر بھی وقت کے ماحول کے لحاظ سے وہاں کے علماء حق کے لیے ناقابل برداشت ثابت ہوئیں۔ امیر کے حکم سے ملکہ ثریا کی سر دربار بے نقابی نے تیل پر دیا سلائی کا کام دیا ایک مشہور ومقبول شیخ طریقت اور قاضی عدالت شیخ عبدالرحمٰن نے خفیہ تبلیغ جہاد شروع کی۔ سرکاری پولس دونوں کو گرفتار کر لائی۔

خیر شیخ طریقت کی تو جان کسی طرح بچ گئی، قاضی عبدالرحمن کو سزائے موت ملی۔ اور حکم ہوا کہ فوجی طریقہ پر انھیں گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے تاریخ موعود آئی۔ تو قاضی صاحب نے کہا کہ وقت آخر کے لیے صرف دو باتوں کی اجازت چاہتا ہوں۔ ایک یہی کہ پہلے وضو کر کے دو رکعت نفل پڑھوں گا اور اس کے بعد اذان دوں گا۔ حالت اذان میں جس وقت اشارہ کروں عین اسی لمحہ گولی ماردی جائے۔ درخواست منظور ہوئی، اور شہادت کا آرزومند اور جنت کا حریص قاضی حالتِ اذان میں جس وقت شہادتِ توحید کے بعد شہادت رسالت پر پہنچا، عین اسی لمحہ اشارہ کر کے فرشتۂ موت کو لبیک کہا۔ فوجی دستہ نے باڑھ ماری اور قاضی اپنی مراد کو پہنچ گیا! خوش نصیب قاضی کی قابل رشک موت! بڑے سے بڑے متقی و زاہد کی بھی تمنا اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ مولا جس گھڑی بندہ کو حاضری سے سرفراز کرنا چاہے تو بندہ کی زبان پر یہی نغمۂ جانفزا ہو، جو ہر تلخ کو شیریں اور ہر مشکل کو آسان بنا دینے والا ہے! ساری عبادتوں کا حاصل، ساری ریاضتوں کا نچوڑ، دو بندھے ہوئے اور مختصر سے فقروں میں!

چند اہل اخلاص

روداد سفر ختم پر آگئی۔ نہیں نہیں پھر بھی خدا معلوم کتنوں کے نام

زبانِ قلم پر آگئے۔ اکثر کے تعظیم کے ساتھ بعض کے عقیدت کے ساتھ اور محبت کے ساتھ تو کہنا چاہیئے کہ سب ہی کے، پھر بھی چار نام ایسے بھی ہیں جو باقی رہ گئے، اور باقی ہی رہیں گے۔ سہواً وہ چھوٹ نہیں گئے قصداً وہ چھوڑ دیئے گئے۔ تین صاحب اس میں خاص بلدہ کے ہیں اور ایک صاحب باہر کے اضلاع میں سے۔ مخصوصین کا طبقہ بھی رفیع ہوتا ہے لیکن کچھ مخصوصین میں بھی اخص و ارفع کے مرتبہ پر ہوتے ہیں۔ یہ وہ اہل اخلاص ہیں، جن کی کوئی بھی دنیوی، مادی غرض مجھ سے وابستہ نہ تھی، انھیں مجھ سے کوئی بھی خدمت لینا نہ تھی۔ نہ انھیں اپنے کسی ادارہ یا انجمن میں مجھے لے جانا تھا، نہ مجھ سے اپنی کتاب معائنہ پر کسی قسم کی داد حاصل کرنا تھی۔ نہ اپنا تعارف صدق کے ذریعہ سے کرانا تھا۔ انھوں نے خالص اللہ کے واسطے مجھ سے اپنا رشتۂ محبت قائم رکھا۔ یہ مجھے دیکھ کر مسرور اور میں ہر مرتبہ ان کے سامنے فرط ندامت سے گویا زمین پر گڑا کر رہا۔ "کل" انکشاف حقائق کے وقت میں تباہ کار تو ان کے کیا کام آؤں گا، لے وہی انشاء اللہ میرے لیے ایک سہارا ثابت ہوں گے۔ ان کا عمل لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ پر تھا اور ان کے پیش نظر یہ کلام ربانی تھا۔ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى۔ کا غذ پر ان کا ذکر لانا ان کے اخلاص کامل کی ناقدری کرنا ہے ان کا نام لوح قلب پر محفوظ ہے

رہے گا، اس عالم میں اور انشاء اللہ اس کے بعد بھی۔ اخلاص و محبت کامل کا، کاروبار دنیا کے ہر کاروبار سے جدا ہے، اور یہاں کا دستور سے الگ۔ الفاظ لاکھ لایئے، حروف عبارت کی بھرمار ہزار کیجیے، کیفیت قلب کا نقش کیوں کر کھینچ سکتا ہے۔ اور عبارت آرائی حقیقتِ وجدانی کی مصوری کہاں سے کر سکتی ہے؟

گرچہ تفسیر زباں روشن گرست
لیک عشق بے زباں روشن ترست

(لفظ زبان سے شرح و تفسیر لاکھ روشن ہو پھر بھی عشق بے زبان اس سے کہیں بلیغ تر ہے)

عشق کے معنی و مفہوم پر تحقیقی مقالہ تیار کر دینا اور ہے اور خود عاشق ہونا چیز ہی اور۔

گرچہ گویم عشق را شرح و بیاں
چون بہ عشق آیم خجل باشم ازآں

(عشق کی تشریح و تفسیر میں دفتر کے دفتر لکھ ڈالے لیکن جب خود عاشق ہو کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اتنا کاغذ سیاہ کر ڈالنے پر بھی کچھ نہ لکھ پائے)

حیدرآباد کی کشش

بڑی بڑی عمریں بات کہتے اور لمبی لمبی زندگیاں پلک جھپکاتے ختم

ہوجاتی ہیں۔ تو ۱۷، ۱۸ دن کی بساط ہی کیا تھی۔ ابھی حیدرآباد کے پلیٹ فارم پر آمد ہی ہوئی تھی کہ اسی اسٹیشن سے روانگی کی گھڑی بھی آگئی وہ ۲۹ ستمبر کی صبح تھی اور یہ ۱۶ اکتوبر کی شام! خوب یقین کے ساتھ شروع ہی سے معلوم تھا کہ قیام بالکل عارضی اور چند روزہ ہے! پھر بھی دل کسی حد تک لگ گیا تھا۔ اور طبیعت در و دیوار سے گلی کوچے سے مانوس ہوگئی تھی چلتے وقت دل کسی درجہ میں ضرور کڑھا۔ بشریت اسی کا نام ہے۔ بندہ کو خوب کھول کر بتادیا گیا ہے کہ زمین پر قیام چند روزہ رہے گا۔ وَلَكُمْ فِى الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ۔ لیکن باوجود اس عقلی اذعان کے اور باوجود اس نوید کے من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاءہ

جو بندہ اپنے رب سے ملاقات کا شوق رکھتا ہے تو اس کا رب بھی اس کی ملاقات کا مشتاق رہتا ہے۔ جب وہاں سے بلاوا آتا ہے تو طبیعت ان وقتی مالوفات کو چھوڑتے کچھ انقباض ہی سا محسوس کرتی ہے۔

رخصت کی گھڑی

خیر جب شام کا وقت آیا تو کچھ لوگ تو گھر ہی مل ملا کر رخصت

ہو گئے، اور کچھ لوگوں نے عین اس وقت رخصتی مصافحہ کرلیا، جب ابھی اسٹیشن کی برساتی ہی میں داخل ہوا تھا، پھر بھی گاڑی کے چھوٹتے وقت پلیٹ فارم پر مجمع مخلصوں اور محبوں کا اچھا خاصا ہوگیا، کالجوں کے یونیورسٹی کے جلیل القدر استاد، ایڈوکیٹ، اخبار نویس، بوڑھے جوان سب ہی اس قافلہ میں شامل فرط اخلاص، اکثر کی چشم نم سے نمودار بعض رومال سے آنکھیں پونچھ رہے تھے۔ اور ایک عزیز تو درجہ کے اندر آکر مجھ سے لپٹ کر زار و قطار رو دیئے!

جدائی اور رخصت کا منظر بھی کتنا موثر ہوتا ہے۔ غم انگیز مگر لذیذ، تلخ مگر کتنی مٹھاس لیے ہوئے! گاڑی چلی تو عالم ناسوت سے آخری رخصت کا منظر سامنے آگیا۔ اور کسی فارسی گو شاعر کے یہ دو شعر بھی لوح حافظہ پر چمک اٹھے۔

یاد داری کہ وقت زادن تو ہمہ خندان بدند تو گریاں

آں چناں زی کہ وقت مُردن تو ہمہ گریاں بدند تو خنداں

اے بندے۔ کچھ یاد ہے کہ جب تو پیدا ہوا تو سب کے چہروں پر خوشی کی ہنسی تھی اور ایک تو رو رہا تھا۔ اب زندگی یوں گزار اور دنیا میں یوں بسر کر کہ جب دنیا سے اٹھنے کا وقت آئے تو سب رو رہے ہوں اور ایک تو خوش ہو، مگن ہو کہ واپسی اپنے اصلی وطن کو اور

حاضری اپنے مولا کے دربار میں ہورہی ہے!)

اے سب کے سننے والے! اس تباہ کار کے حق میں یہ مضمون شاعری نہیں، واقعہ اور حقیقت بن کر رہے، سب کی آنکھوں میں آنسو ہوں اور کانوں میں اپنے بشارت یہ آرہی ہو، کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔ اب دیر کیا ہے، اے بندے میرے مغفور بندوں میں شامل ہو، اور میری مرضیات کی جنت میں داخل ہوجا! آرزو اس غلط شہرت کی ہرگز نہیں کہ ایک عالم وفاضل اُٹھ گیا، ایک عابد و زاہد اپنی جگہ خالی کرگیا۔ دُعا صرف اتنی ہے کہ زمین والے زبان پر یہ لائیں کہ ہمارا ایک مخلص مشیر چلا گیا اور عرش والا یہ گواہی دے کہ ہاں یہ ہمارے دین کی تھوڑی بہت عزت رکھنے والا ہمارے حضور میں حاضر ہوگیا!

دہلی

سیر دہلی

دوستوں، مخلصوں کا مدت سے اصرار چلا آرہا تھا کہ دہلی کی حاضری دی جائے۔ اپنا جی خود بھی یہی چاہ رہا تھا لیکن اپنا لگا بندھا کام چند روز کے لئے بھی چھوڑ، سفر کرنا اب دشوار سے دشوار تر ہوگیا ہے۔ اس لیے بات برابر ٹلتی ہی گئی۔ گورنر ریاست بہار ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سے دہلی میں ملاقات کا وعدہ پرانا تھا اس لیے جب موصوف نائب صدر جمہوریہ ہوکر دہلی آگئے تو قدرتاً یہ تقاضا طبیعت میں زیادہ قوی ہوگیا۔ پھر بھی وقت نہ نکلنا تھا نہ نکل سکا ــــــ ایک زمانہ تھا کوئی ۶، ۷ سال کی طویل مدت کا اکتوبر ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۰ء تک جب پہلے ہمدرد کا مرتبہ اور خلافت کمیٹی کے سلسلے میں اور پھر نفس نفیس محمد علیؒ کے لیے دہلی بار بار اور جلد جلد جانا ہوتا رہتا تھا اور ایک دور اس سے بھی قبل کا تھا (۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء) جب آستانہ نظام الدین اولیاء سلطان المشائخ کی کشش بار بار اور کبھی کبھی لمبی مدتوں کے لیے دہلی لے جاتی تھی! ــــ آہ عمر گذشتہ کی پلٹ کر نہ آنے والی اور ہمیشہ کے لئے داغ حسرت بن جانے والی دلچسپیاں!

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا!

بہرحال جوں توں وقت تین دن کا قیام دہلی کے لئے نکالا، آمد و رفت کا ایک ایک دن اس کے علاوہ اور ۱۸ راگست کو صبح، بجے

کے بعد دہلی وارد ہوگیا۔

پارلیمنٹ کا اب تک نام ہی سنا تھا اور سڑک سے کبھی کبھی اس کی عمارت دیکھ بھی لی تھی۔ بہ حیثیت مجموعی اب تک اس کی حیثیت "دیدہ" سے زیادہ "شنیدہ" ہی کی تھی ابکی پہلی بار اس کی زیارت کا موقع ملا، راجیہ سبھا کا پاس مل جانا تو کچھ ایسا دشوار نہ تھا، جبکہ اس کے صدر خود نائب صدر جمہوریہ تھے۔ اور پاس (چیرمین کی گیلری کا) انھیں کے دستخط سے ملتا تھا البتہ لوک سبھا کا پاس ملنا خاصہ دشوار نظر آیا اس لئے کہ عین اسی دن اتفاق گورنمنٹ پر عدم اعتماد کی تحریک آرہی تھی۔ اور اس کے شوق میں تماشائیوں کا وہ ریلا تھا کہ خدا کی پناہ! جس گیلری میں ۳۰ کی گنجائش تھی اس میں ۷۰، ۷۵، کس طرح دھنسے ہوئے تھے۔ خیر یہاں کا پاس بھی بالآخر محترم میزبان نائب صدر جمہوریہ ہی کے اسم اعظم کی برکت سے حاصل ہوگیا۔ اور اسپیکر گیلری میں گھس گھسا کر رسائی ہوگئی ـــــ عمارت لکھنؤ کے کونسل چیمبر کی بھی اپنے نزدیک کچھ کم شاندار اور مرعوب کن نہ تھی لیکن اس پارلیمنٹ ہاؤس کی ہیبت وجلال رفعت وعظمت، طول وعرض کے آگے اس کی بساط ہی کیا اونٹ پہاڑ کے نیچے! نام جمہوریت کا لیجئے اور اصطلاح سوشلزم کی استعمال کیجئے بادشاہت بہرحال بادشاہت ہے، دبدبہ وطنطنہ جاہ وجلال ٹھوس

حقیقت کے لحاظ سے ملوک وسلاطین کے دیوان عام اور اس قصر جمہوریہ میں اصلاً فرق نہیں!

دونوں ہاؤسوں (ایوانوں) کی سرسری گھنٹہ دو گھنٹہ کی سیر سے اتنی بصیرت حاصل ہوگئی، جتنی محض اخبار میں ان کی کاروائیاں پڑھتے رہنے سے مہینوں کیا برسوں میں بھی نہیں حاصل ہوتی، کہاں صورت کہاں تصور کجا حقیقت کجا اس کا عکس ـــــ جتنا وقت یہاں صرف ہوا بحمد اللہ ضائع نہیں ہوا۔ مشاہدہ کہیے یا مطالعہ بہرحال تجربہ آموز وبصیرت افروز ہی رہا۔

دہلی دارالسلطنت، مزارات ومقابر کا بھی ہے بقول حالیؔ ـــ

چپہ چپہ پہ ہوئے یاں گوہر غلطاں تہ خاک!

آستانہ نظام الدین اولیاء خواجہ نظام الدین سے ربط خصوصی اس سیہ قلب کو قدیم سے ہے۔ مدتوں رہ چکا ہے اور حاضری کا اتفاق بھی یہاں (خواجہ حسن نظامی مرحوم کی مہمان نوازی کے طفیل) بار بار رہ چکا ہے۔ ابکی حاضری کی نوبت سالہا سال کے بعد آئی خیال یہی تھا کہ اب قلب میں قساوت و باطن میں تیرگی بہت آگئی ہے۔ حاضری کچھ بیکار ہی سی ہوگی لیکن اللہ والوں کے فیض کے در اللہ شاید ہمیشہ ہی کھلے رکھتا ہے۔ حاضری گو چند منٹ کے لئے ہوسکی پھر بھی وجدان کو پورے لطف وسرور کی نعمت

حاصل رہی۔ وہی شفقت وہی کرم وہی ذرہ نوازی وہی لطف فرمائی! ـــــ بالمومنین رؤف رحیم کے جانشینوں کی شان بندہ پروری پوری تابانی کے ساتھ!

ایک مخلص کی رفاقت نے قطب مینار، بختیار کاکیؒ کے آستانہ پر بھی رسائی کرادی۔ یہاں کے بھی انوار جمال کا کیا پوچھنا! ـــــ دل میں تمنا اپنے ممدوح و محبوب مولانا حفظ الرحمٰن کی بھی تربت پر فاتحہ خوانی کی تھی، آرزو پوری ہوئی اور ان مرحوم کے نصیبے پر کچھ رشک سا آگیا، جسد خاکی کو جگہ ملی تو کہاں؟ حقیقی شاہان دہلی یعنی خاندان ولی اللہی کے مزارات کے وادی ایمن میں، مفتی کفایت اللہ مرحوم اور مولانا احمد سعید مغفور بھی مزے میں رہے قطب کے جوار رحمت میں آسودۂ خاک ہیں۔ مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام دونوں کی تربتیں اللہ ٹھنڈی رکھے) کے مرقدوں کی طرف سے بھی بار بار گزر ہوا اور کتنی پرانی یادیں خوشگوار اور حسرتناک بھی۔ ہر بار تازہ ہوگئیں!

خواجہ حسن نظامی کی قبر کا کتبہ پڑھ کر آنکھیں قدرۃً نم ہوگئیں، اور مزار غالبؔ پر پہونچ کر وجدان نے شادمانی محسوس کی ـــــ اپنے مرحوم عزیز شفیق الرحمٰن قدوائی جامعی (سابق وزیر تعلیمات دہلی) کی قبر پر بلی للک کے

ساتھ گیا۔ لیکن جاکر غم کے ساتھ غصہ کو بھی تحریک اچھی خاصی ہوئی " قبر"! قبر تھی کہاں؟ بتانے والے کے اصرار کے باوجود یقین نہ آیا کہ کسی مسلمان کی قبر اس شکل و ہیئت کی ہوسکتی ہے! اسلامی قبر کی مطلق کوئی بھی علامت نہیں! محض ایک بہت بڑا سا بالکل گول چبوترہ بنا ہوا! ہو بہو کسی انداز سے کنویں کی جگت! یا زیادہ سے زیادہ کسی ہندو فقیر کی سمادھی کہہ لیجئے۔ واللہ اعلم یہ کن صاحب کی " جدت" یا دماغ کی اپج ہے اور خدا معلوم ارباب جامعہ اس باب میں اپنی ذمہ داری کیوں نہیں محسوس کرتے!

نئی دہلی کی کوٹھی جس میں قیام ہوا۔ اب اس میں بہت کچھ اضافہ ہوگیا ہے یہ ایک زمانہ میں رفیع قدوائی مرحوم کی تھی۔ یہیں ایک بار آکر اُن سے ملا تھا۔ اور ایک بار یہاں آکر کھانا کھایا تھا قدم رکھتے ہی ان کی ایک ایک بات یاد آئی۔ سرکاری حلقوں میں اور انتظامی حیثیت سے جو شہرت انھوں نے مستعدی کارگزاری دیانت فرض شناسی کی پائی اور جس طرح مسلمان وزراء کی وقعت بڑھائی یہ تو انھیں کا حصہ تھا، باقی ذاتی حیثیت تو ان کی مہمان نوازی فیاضی اور جذبۂ خدمت خلق بھولنے والی چیز ہی نہیں — پورا مہمان خانہ وہاں قائم تھا، گویا ایک مستقل لنگر جاری! جس سڑک پر یہ کوٹھی نمبر ۲ واقع ہے اس کا نام پہلے تھا کنگ ایڈورڈز روڈ اور اب ہے مولانا آزاد روڈ، سڑک

کی تختی پر یک بیک نظر پڑی اپنے ساتھ مولانا کی خوشگوار یادوں کو بھی تازہ کر گئی فراخ دلی، رواداری، حلم وتحمل میں اپنی نظیر آپ تھے۔ ان سے بھی ان کے زمانہ وزارت میں ملاقاتیں ایک سے زائد بار ہوئیں تھیں اور ان کی میزبانی کا لطف بھی اٹھایا تھا۔ اپنے تدبر نکتہ رسی وفراست کا قائل گاندھی جی اور جواہر لال تک کو کرلیا تھا۔ سردار پٹیل تک کو ان کا لوہا ماننے پر مجبور ہونا پڑا تھا اور مسلمانوں کو ان کی زندگی تک...... یہ خیال واطمینان رہا کہ کانگریس اور حکمراں جماعت میں ایک آدمی تو ہمارا موجود ہے۔ واردات سفر سے کسی قدر غیر متعلق ہیں پھر بھی موقع پڑجاتے پر دوستوں، محبوب بزرگوں کی خوشگوار ولذیذ یادوں کا امنڈ آنا کچھ ناگزیر سا ہے۔

دہلی میں دیکھنے کی چیزیں دس، بیس، پچاس نہیں بلا مبالغہ سیکڑوں ہیں۔ اور مجھ سے کتابی کیڑے کے لئے سب سے بڑی رغبت وکشش کی چیز یہاں کی لائبریری یا کتب خانے خود بھی تعداد میں خدا جانے کتنے، خیر سب کیا معنی دو چار تک بھی پہنچ اس قلیل مدت قیام میں ممکن نہ تھی۔ جی نے ٹھانی کہ کم سے کم ایک کو تو دیکھ ہی لیا جائے اور قرعہ ایک سرکاری کتب خانہ NATIONAL ARCHIVES (قومی محافظ خانہ) پر پڑا۔ یہ محافظ خانہ کاغذات ودستاویزات قدیم قائم تو مدت دراز سے انگریزوں کے زمانے ہی

سے ہے وزیر تعلیمات ہند مولانا ابوالکلام کی توجہ نے چار چاند لگادیے اس کی سرسری سیر کا اشتیاق بدرجہ کمال تھا سرکاری محکمہ اور پھر اپنے نہایت بیش قیمت قدیم سرکاری سیاسی دخفیہ کاغذات کی بنا پر نہایت درجہ حفاظت در ازداری کا مرکز پاس وغیرہ کے جھمیلے ہمت شکن لیکن وہی اسم اعظم" میزبان محترم کا ایک بار پھر کارگر ہوا ـــــ اور رسم وضابطہ کی خانہ پری کے بعد بالآخر رسائی ہوگئی ـــــ دیکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اوپر نیچے تہ بہ تہ منزلوں میں کتابوں مجلدات و دفاتر کا ایک پورا جنگل۔ ہر منزل کے ہر کمرے میں سے لے کر بلند چھت ہر الماری اور اس کے ہر خانہ میں کتابوں کے انبار اور کتابیں بھی کثرت سے ضخیم وطویل وعریض۔ غرض ذخیرہ میرے اندازے سے کہیں زیادہ وسیع وشاندار ورق ورق اور قلمی فرمانوں شاہی مہروں دستخطوں وغیرہ کا کوئی شمار نہیں، ساری کتابیں اگر ایک ـــــ سیدھے خط میں پھیلائی جائیں تو دو چار فرلانگ نہیں وہیں کے ایک ذمہ دار شخص نے بیان کیا کہ ۲۰ میل کا فاصلہ درکار ہوگا، ظاہر ہے کہ اس عظیم الشان تعداد کا سرسری جائزہ بھی دو ڈھائی گھنٹے کے اندر آسان نہ تھا بس گویا ایک خواب سا دیکھ لیا اور اتنی بھی دیکھ بھال تاک جھانک محض مہتمم محافظ خانہ یا ڈائرکٹر آرکایوز جناب کے ڈی بھار گو ہی کی عنایت سے ممکن ہوئی جو خلق مجسم ثابت ہوئے اور پورے وقت برابر ساتھ رہے یہ دوسرے

علوم اور زبانوں کے علاوہ فارسی کے بھی ماہر ہیں اور ان غیر مسلموں میں سے نظر آئے جن کی ذات سے ملک میں اب تک سیکولرزم کا بھرم قائم ہے شعبہ فارسی کے انچارج ترمذی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی اپنے کام میں خاصے مستعد و سرگرم دکھائی دیے۔

نئی پرانی دلی بھی ۳۰، ۴۰ سال کے عرصہ میں بہت کچھ تبدیل ہو چکی ہے اور بعض محلوں میں تو انقلابی حد تک، پھر بھی پہچانی جاسکتی ہے اور کسی قدر تامل کے بعد پرانے پتے نشان مل جاتے ہیں، اصلی انقلاب نئی دہلی اور اس کے اطراف وجوانب میں آیا ہے۔ نئی دہلی اب نئی دنیا نظر آتی ہے اور اپنی عمارتوں کی ہیئت اور ساخت کے لحاظ سے ہلکا اور ابتدائی نمونہ نیویارک کا! لکڑی کی جگہ ہر عمارت کا ڈھانچہ لوہے کا اور چار چار پانچ پانچ منزلوں کی عمارتیں دور سے دیکھیے تو گمان گزرے کہ کسی ستم ظریف نے یہ سر بہ فلک کابکیں کبوتروں کے لیے کھڑی کر دی ہیں! یہ دیو پیکر کبوتر خانے آج سے چند سال قبل قابل مضحکہ ہوتے۔ مگر اب عین فیشن میں داخل ہیں! کوئی بھلا آدمی ایسی تعمیریں کرتا تو اپنے ہونق پنے پر نکو بن جاتا لوگ اس پر تالی پیٹ دیتے۔ لیکن اب یہی عمارتیں کیا وزیر کیا امیر کیا رئیس اور کیا سیٹھ سب ہی کے نشیمن ہیں اور کسی کی شامت آئی

ہے جو ان پر ہنس سکے ۔ بمبئی اور کلکتہ کی آبادیاں تو ایسی عمارتوں سے
پٹی پڑی ہیں، اب نئی دہلی کی کچھ سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری عمارتیں
انقلاب زندہ باد کی دہائی دیتی ہوئی اس راہ پر چل پڑی ہیں۔ نامور
انگریزی روزناموں اسٹیٹسمین، ٹائمز آف انڈیا، انڈین اکسپریس ہندوستان
ٹائمز کی جگمگاتی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کرتی ہوئی عمارتیں سڑک
پر سے بار بار نظر سے گزریں اور خیال آیا کہ انھیں شال دوشالہ والوں
کی سرزمین پر کہیں کسی تنگ گلی میں ہمارے الجمعیۃ اور دعوت، اور
ریڈینس والے بھی اپنی کمبلوں اور گدڑیوں میں مست پڑے ہوں گے
عمارتوں کا یتیرہ دتار ہونا کسی زمانہ میں عیب تھا اب ہنر ہے۔ لکھنؤ کے
کونسل چیمبر وغیرہ کا تجربہ پہلے ہی ہو چکا تھا کہ کمروں بلکہ کہیں کہیں برآمدوں
تک میں شمع کا فوری نہیں۔ بجلی کے پر قوت لمپ دن دوپہر جل رہے ہیں
اور لکھنے پڑھنے کا سارا کام بجائے سورج کے اس مصنوعی روشنی میں
انجام پا رہا ہے۔ دلی آخر پایہ تخت ہے اس کے قدم لکھنؤ سے بھی کہیں آگے!
—— عجب کیا کہ کوئی ڈاکٹر صاحب یہ حکم لگا دیں کہ مصنوعی روشنی سے
بینائی خوب تیز ہو جاتی ہے اور قدرتی روشنی کی مضرتوں سے امن ہو جاتا
ہے۔

دریا گنج کی سڑک سے جو کہنا چاہیے کہ نئی اور پرانی دہلی کے درمیان

حد فاصل ہے گزر بار بار ہوا۔ یہی وہ سڑک ہے جس پر ڈاکٹر انصاری مرحوم کی مشہور کوٹھی تھی۔ سارے قومی کارکنوں کی مستقل مہمان گاہ۔ اور بعد کو ۱۹۴۷ء کی تباہی تک انجمن ترقی اردو کا مرکزی دفتر بھی اسی کوٹھی میں رہا۔ کیسے کیسے جگھٹے بابائے اردو عبدالحق کی ذات سے یہیں ہوتے رہتے تھے۔ اور کوچہ چیلان کا مشہور دفتر ہمدرد کامریڈ اس سڑک کی ایک شاخ پر واقع پھاٹک پر تحتی محمد علیؒ کے نام کی کندہ! گاندھی جی کا تاریخی شہرت والا اسا روزہ فاقہ اسی مکان سے شروع ہوا تھا۔ اس دن کا سارا ہنگامہ خیز منظر نظروں کے سامنے پھر گیا۔ بی اماں مرحومہ کا جنازہ اسی مکان سے اُٹھا تھا۔ مسلمانوں کی قسمت کے فیصلے برسوں کہنا چاہیے کہ اسی مکان سے صادر ہوتے رہے۔ مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے پہلے حکیم اجمل خاں مسیح الملک اور بعد کو مولانا ابوالکلام کی صدارت میں یہیں ہوتے رہتے تھے! اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر مکان واحدی صاحب اور راشد الخیری مرحوم کے تھے۔

اور اب کیا بتایا جائے کہ کیسے کیسے حسرت ناک نقشے اس سڑک سے گزرتے ہوئے ہر بار نظر کے سامنے پھر گئے۔

ہندوستان میں چند سال ادھر تک شاید سب سے بڑا اور شاندار

اور خرچیلا ہوٹل بمبئی کا تاج تھا۔ دہلی کا نیم سرکاری ہوٹل اشوک، آخر اس سے بھی نمبرلے گیا جی میں تھا کہ ایک بار اس کی زندگی کا مشاہدہ بھی اپنی آنکھ سے کیجئے۔ شنیدا ور دید میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ خیر اتنا وقت کہاں تھا کہ پورے ۲۴ گھنٹہ صرف کرکے ایک ایک چیز کا مشاہدہ کیا جاتا پھر بھی ایک سہ پہر کو گھنٹہ بھر کا وقت تو نکل ہی آیا ــــــ قصر معلا چھوٹے چھوٹے والیان ریاست کا تو کیا بعض خاصے بڑے رئیسوں کا بھی مشکل سے اس کا مقابلہ کرسکے گا۔ دوسرے ہوٹل کا ترجمہ "فرودگاہ" یا قیام گاہ " صحیح ہوگا اسے تو قطعاً عشرت خانہ کہنا چاہیئے۔ راحت و آسائش ہی کا نہیں تزئین و آرائش عیش و عشرت کے سارے سامان مکمل یا " اَپ ٹوڈیٹ " ٹھہرنے کے کمرہ کا سب سے ادنا نرخ ۵۵ روپیہ یومیہ کا اور اس طرح درجہ بدرجہ اور سب سے اعلیٰ کمرہ مالا ۲۵ روزانہ، ڈاکخانہ، تارگھر بینک مرصع جواہر نگار زیورات کی دوکان، ساریوں وغیرہ بیش قیمت زنانہ ملبوس کی دوکان وغیرہ ہر چیز ہوٹل کے اندر ہی موجود اور شراب گھر اور ڈانس ہال ناچ گھر کا تو پوچھنا ہی کیا، سب کے علاوہ خاص مغربی مذاق کا بڑا سا حوض یا تالاب بھی موجود، کنارے غسل آفتابی اور حوض کے اندر غسل آبی کا انتظام نیم برہنگی کے ساتھ ہر وقت لیس۔ ماکولات و مشروبات کی گرانی کا اندازہ اس سے کیا جائے کہ چائے کی صرف ایک پیالی کی قیمت ڈیڑھ روپیہ!

فرنگی مہمان ہر جنس اور ہر سن کے اس میں (اکثر غالباً امریکی) کثرت سے ٹھہرے ہوئے اور ہندوستان کے بھی کچھ راجے مہاراجے قسم کے۔ باہر کے سیاح کو کیسے یقین آئے گا کہ اس شہر کے دوسرے حصوں میں ہزارہا مخلوق رات کو بھوکی سوتی ہے اور کپڑے کی ایک ایک چادر کو ترستے اس کی عمر گزر جاتی ہے۔

اور ایک اس ہوٹل پر کیا موقوف ہے کناٹ پلیس کے طویل و عریض چورا ہے پر بلکہ اس پورے فیشن ایبل بازار میں کہیں بھی کھڑے ہوکر دیکھ لیجئے کہ دنیا کسے کہتے ہیں، کھاتے پیتے چلتے پھرتے سینما کے شوقینوں، اور .... زیورات اور قیمتی ملبوسات کے خریداروں کا وہ ریلا کہ راستہ چلنا دشوار اور قطار در قطار موٹروں کا وہ ہجوم کہ سڑک کا پار کرنا ایک کارنامہ ایک سیلاب رنگ و بو ایک طوفان آرائش و زیبائش، یہ تصور کرنا ہی مشکل کہ اس ملک میں کچھ ننگے اور بھوکے بھی بستے ہیں، غفلت و مادیت، نفس پرستی کے اس ماحول میں خالق و آخرت کی یاد ۲۴ گھنٹوں میں اگر چند لمحوں کے لئے آجائے تو ایک کرامت ہے!

بات میں بات نکلتی آئی۔ اور بات بڑھتی اور چلتی ہی چلی گئی، مخلصوں اور محبوں سے ملاقات کا ذکر ہی نہ آنے پایا۔ قیام گاہ پر پہنچتے ہی تھوڑی دیر

بعد جو فون آیا وہ سپریم کورٹ کے نامور سینیر ایڈوکیٹ اور الہ آباد ہائیکورٹ کے سابق جج شیو پرشاد سنہا کا تھا۔ اونچی پریکٹس والے ایڈوکیٹوں کا وقت بڑا قیمتی ہوتا ہے اس لئے ان سے جواب میں عرض کیا گیا کہ آپ تکلف نہ کریں لیکن وہ بھلا کب ماننے والے تھے آدھ گھنٹے میں آموجود ا۔۔۔ PRO MUSLIM (یعنی مسلم دوست) ہونے میں اکثر ہندوؤں سے کیا بہت سے مسلمانوں سے بھی چند قدم آگے۔ مسلم صوفیہ کے بڑے عقیدت مند اور فارسی کے صوفی شعرا کے دلدادہ شروع زندگی میں فیض آباد کے نیم مجذوب وصاحب حال بزرگ سے ایک خاص موقع پر بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے اور وہی تاثر اب تک قائم ہے ۔۔۔۔

دوسری ملاقات سرکار ہند کے سابق سکریٹری محکمہ تعلیمات اور سابق سفیر ایران ڈاکٹر تارا چند (ممبر راجیہ سبھا) سے ان کی کوٹھی پر جاکر ہوئی۔ مسلمانوں کے علوم وفنون پر گہری نظر رکھنے والے اور تاریخ اسلام کے تو کہنا چاہئیے کہ ماہر دیوان حافظ بلکہ مثنوی رومی تک کے پڑھنے والے ہندو تو خاصی تعداد میں نکل آئیں گے، لیکن مکتوبات مجدد سرہندی کو اصل فارسی میں پڑھ ڈالنے والا کوئی دوسرا ہندو ان کے سوا میری محدود نظر سے نہیں گزرا۔ ان کی نجی گفتگو بھی اسلامی تاریخ کے موضوع پر ایسی ہوتی ہے کہ اسے برابر سنا جائے اور استفادہ کیا جائے۔ شہزادہ

داراشکوہ نے اپنے زمانہ میں ہندوؤں کی مشہور اپنشد کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں کرایا تھا اس کا تذکرہ ہی ابتک سننے میں آیا تھا۔ انھوں نے اس اس کے ضخیم اور تازہ فارسی ایڈیشن کی زیارت کرائی جسے خود انھوں نے ایک ایرانی فاضل کے ساتھ لے کر تصحیح ومقابلہ کے ساتھ ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے اور یہ ضخیم دفتر بجائے خود ان کے علم وکمال کی ایک زبردست یادگار ہے۔ اسی سڑک (تغلق روڈ) پر ان سے چند قدم کے فاصلے پر ڈاکٹر سید محمود (سابق وزیر وغیرہ) کی کوٹھی ہے۔ میرے بہت قدیم دمخلص کرم فرما راجیہ سبھا کے اب بھی ممبر ہیں اور علمی وسیاسی دونوں قسم کے کام کچھ نہ کچھ کئے جاتے ہیں گو بیچارہ کی صحت اب مستقل طور پر خراب رہنے لگی ہے اُن سے ملاقات حسب توقع بے تکلفانہ رہی۔

جامعہ ملیہ سے اس کے ابتدائی علیگڈھی دور یعنی بانی جامعہ مولانا محمد علیؒ کے زمانہ میں تعلق بہت گہرا اور مخلصانہ رہ چکا ہے، بعد کے دونوں پرنسپلوں عبدالمجید خواجہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سے بھی ربط مخلصانہ رہا۔ اسٹاف کے دوسرے ارکان حافظ اسلم جے راجپوری، خواجہ عبدالحیٔ مولانا محمد سورتی وغیرہ ہم بھی کرم فرماتے رہے۔ اور شفیق الرحمان مرحوم تو اپنے عزیز ہی تھے پرنسپل مجیب سے بھی رشتہ برادری اور قرابت کا پہنچتا ہے۔ گو نظریات

الگ الگ ہیں۔ ان سے ملنا جلنا جب بھی ہوتا ہے ان کے والد ماجد مولوی محمد نسیم صاحب مشہور ایڈوکیٹ لکھنؤ کا چہرہ نظر کے سامنے پھر جاتا ہے۔ میرے بزرگ بھی تھے اور محسن بھی۔ بہرحال دعوت پاکر سہ پہر کی چائے ناشتہ پر حاضری لازم ہوگئی۔ ڈاکٹر سید عابد حسین، ڈاکٹر سعید انصاری، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، اسی لطف بشاشت اور تپاک سے ملے جو ان کا معمول تھا، حافظ فیاض کی زیارت سالہا سال کے بعد ہوئی۔ قدیم جامعہ کے مخلص وفاداروں میں اب سب سے پرانے رہی ہیں نئے چہرے بھی دو ایک نظر آئے۔ ان میں ضیا الحسن فاروقی سے مل کر بات چیت کا جی چاہا افسوس ہے کہ موقع نہ ملا۔ سب سے بڑھ کر متعدد کارگزار صاحب فہم رسالہ جامعہ کے ایڈیٹر عبداللطیف اعظمی نظر آئے۔ اور یہ بعد کو اسٹیشن رخصت کرنے بھی آئے۔ مغرب کا وقت قریب آگیا اور نماز جاکر محمد علی ہال میں پڑھی جو مسجد کا کام دے رہا ہے ـــــ جامعہ کی موجودہ حالت کی ابتری دینی و اسلامی نقطۂ نظر سے بہت کچھ سننے میں آچکی تھی، لیکن نماز مغرب کی حد تک تو صحیح نہ نکلی۔ نمازیوں کی تعداد اچھی خاصی تھی اور چھوٹے طلبہ تو کثرت سے تھے مسلمان طلبہ کی تعداد کا مسئلہ بہت اہم تھا اور بہت اہم ہے اور خدا نہ کرے کہ اسلامی عنصر کی اہمیت گھٹتی اور رفتہ رفتہ ختم ہوتی چلی جائے۔ گو یہ بھی ظاہر ہے کہ قدیم اسلامیت کی علیٰ حالہٖ قائم رکھنا اب کسی کے بس کی بات نہیں۔

ایسی ہی ایک دوسری پرلطف صحبت بڑے پرتکلف چائے ناشتہ کی صحبت درگاہ حضرت نظام الدین میں خواجہ حسن نظامی مرحوم کے صاحبزادے حسن ثانی نظامی (یا حسن نظامی ثانی) کے ہاں منعقد ہوئی۔ خواجہ صاحب کی گوناگوں حیثیتیں اور جو کچھ بھی ہوں بہرحال وہ اردو کے ایک بڑے اچھے لکھنے والے اور بڑے اچھے دوست ملنسار، متواضع مہمان نواز اور خدمت کا شوق و ولولہ رکھنے والے تھے مدتوں اُن سے تعلقات مخلصانہ بلکہ عزیزانہ رہے۔ اور بارہا ان کے ہاں مہمان رہ کر نمک خواری کا لطف اٹھایا اخیر ۱۹۲۲ء میں مسلسل کئی ہفتے ان کے مہمان خانے میں قیام کے گزار سے تھے۔ ابکی عمرانہ اسی مکان کے ایک حصہ میں رہا اور ۴۰ سال قبل کی بے ثبات و تغیر پذیر دنیا کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا! لڑکے کم سے کم مہمان نوازی کی حد تک تو اپنے والد بزرگوار ہی کے نقش قدم پر نظر آئے ان کی والدہ کی خدمت میں بڑے تاثر کے ساتھ اپنا سلام نیاز کہلایا۔ یہیں جمعیۃ علما کے ناظم مولانا محمد میاں سے ملاقات ہوئی اور جامعہ کے استاد مولانا زین العابدین سے بھی دوبارہ جمعیۃ علما کے ذکر پر نام صاحب الجمعیۃ مولانا فارقلیط کا یاد پڑ جانا قدرتی ہے ان سے لطف مکالمت و مجالست دوبار رہا۔ ایڈیٹروں کی صف میں دل دردمند کے ساتھ ایسا مسکین و بے زبان بلکہ بے نفس کم ہی دیکھنے میں آیا عمر کے لحاظ سے شاید دیرینہ سال لیکن قلم کے لحاظ سے

ماشاء اللہ ہر طرح جوان تومند۔ اللہ ان کے اخلاص اور ان کے قلم کی روانی دونوں میں مزید برکت عطا فرمائے۔

جماعت اسلامی ہند کے نام اور اس کی فعالیت سے ملک کے طول و عرض میں کون ناواقف ہے۔ اس کے امیر مولانا ابواللیث ندوی اپنے اخلاص ہی نہیں بلکہ اپنی آدمیت مصالحت پسندی، سنجیدہ مزاجی و متانت فکری کے لحاظ سے بھی ہر طرح اس منصب کے اہل ہیں۔ اور رزم سے کہیں زیادہ بزم کے آدمی ہیں۔ فرط محبت انھیں اسٹیشن بھی کھینچ لائی۔ اور پھر ایک دن اپنے دفتر میں دھوم دھام سے کھانا کھلایا (یہ دھوم دھام تکلف کے مرادف ہے اور نہ اخلاص و سادگی کے منافی) یہیں روزنامہ دعوت کے کارکنوں سے ملاقات رہی اور نئے انگریزی ہفتہ وار RADIANCE کے ایڈیٹر عبدالرؤف (مدراسی) سے تعارف ہوا، دوسروں کے درجنوں انگریزی روزناموں اور ہفتہ داروں کے سامنے انگریزی کے اس ایک مسلم ہفتہ وار کی بساط ہی کیا ہے۔ لیکن اپنی ملت کی قسمت کو کیا کہہ کر رو دیئے کہ اتنا کام بھی کسی دوسرے سے نہ بن پڑا۔ توفیق ہوئی تو اسی جماعت کو ہوئی اور پرچہ نکالا بھی تو اپنی مخصوص جماعت کا نقیب بنا کر نہیں، بلکہ ساری امت اسلامی کی آواز کی حیثیت سے ـــ لوگ کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی والے تقریر تحریر

تنظیم میں خوب برق ہیں، لیکن خشیت قلب کی دولت ان کے حصہ میں کچھ واجبی ہی آئی ہے۔ یہ اعتراض اگر صحیح ہو بھی تو اس میں شرمانے، جھجکنے کی کیابات ہے کلمۂ ایمان میں اقرار لسانی کو تصدیق قلبی کے ساتھ جمع نہیں کیا گیا ہے بلکہ ذکر میں مقدم رکھا گیا ہے۔ اسلام کی تنظیمی پہلو کو نمایاں کرنا بھی دین کی خدمت اور حق ہی کی ایک شکل ہے۔

دہلی میں چاندنی چوک سے اگر گزرنا ہوا ہو تو عجب نہیں کہ نظر گھڑیوں کی ایک بڑی اور شاندار دوکان پر پڑی ہو یکارڈ واچ کمپنی کے نام سے اس کے مالک الحاج محمد شفیع صدق و مدیر صدق کے قدیم مخلص ہیں اور ان کے چچا پریمیر واچ کمپنی کے مالک، گویا پیشہ ان کا خاندانی اور اس اعتبار سے انھیں "ابوالوقت" اگر قرار دے دیا جائے تو کیا بیجا ہے۔ دن میں کامیاب تاجر اور رات میں عبادت گزار جماعت تبلیغی کے خصوصی خادم و کارکن۔ دین و دنیا کی یہ جامعیت خوش نصیبوں ہی کے حصہ میں آتی ہے۔ اپنے گھر جا کر کھلایا پلایا بعض مزارات پر ساتھ لے گئے اور طرح بھی خاطر مدارت میں لگے رہے۔ اور جب میں دہلی سے رخصت ہو رہا ہوں تو تحفہ تحائف کا ایک بنڈل لیے ہوئے اسٹیشن پر موجود! ناشتہ کی لطافت و شیرینی یوں ہی کیا کم تھی اس پر ان کے اخلاص کی حلاوت کا اضافہ!

دلی بے شمار قابل دید چیزوں کا شہر ہے۔ لیکن یہاں پہونچ کر اگر اپنے

دواخانہ ہمدرد اور اس کے متعلقات کو نہ دیکھا تو کچھ نہ دیکھا، یونانی دواخانے بڑے بڑے اور شہرت و نیک نامی والے پہلے بھی تھے اب بھی ہیں اور کئی تو اسی شہر دہلی میں ہیں، لیکن ہمدرد کی آن ہی دوسری شان ہی نرالی ہے

ـــہ بسیار خوباں دیدہ ام الا تو چیزے دیگری

دواخانہ اول تو خود ہی "ایک بحر ناپیدا کنار"، خدا جانے کتنے شعبوں اور صیغوں میں تقسیم اور ہر شعبہ اپنی وسعت اپنے تنوع اپنے انضباط، اپنے سلیقہ اپنی کارکردگی، اپنی صفائی، غرض اپنے ایک ایک کرشمہ سے دامن دل اور دامان نظر دونوں کو اپنی طرف کھینچ لینے والا۔ شربت سازی کے شعبہ میں قدم رکھیے تو بے پیاس کی پیاس لگ آئے۔ اور خواہ مخواہ اس آب طہور کے گلاس پر گلاس چڑھانے کو جی چاہے۔ سینکڑوں نہیں ہزار ہا بوتلیں خوش رنگ اور جھلکتی ہوئی وردی پوش پلٹنوں کی طرح امراض سے مقابلہ کو صف بستہ اور رہا اللحم کی تو بو چھیئے ہی نہیں۔ حافظ شیرازی اور ریاض خیرآبادی اگر اس کوچہ میں آنکلتے تو بادہ گلگوں کے جاموں پر لاحول بھیج کر عجب نہیں اس کے زمزمے سنانے لگتے اور شیخ کے وعظ اور محتسب کے تازیانے کے بغیر ہی رند بلا نوش سے صوفی صفا کوش بن جاتے، جہاں دوائیں کٹتی ہیں وہاں کے کھرل دیکھئے تو دیو پیکر، ظفر علی خانی صحافت کے لفظ "البرزشکن" کی یاد دلانے والے غرض مرکبات، مفردات، تشخیص امراض وغیرہ کے جس حصّہ میں بھی جائیے

قدرتِ حق کے نظارے کا لطف اٹھائیے۔ اور حکیم صاحب کے حسنِ انتظام اور ان کے کاروبار کی وسعت و عظمت پر عش عش کیجئے ــــ جزئیات کی تفصیل اگر بیان ہو تو عجب نہیں کہ پڑھنے والے کو ٹھوس واقعات اور سنجیدہ حقائق پر گمان "فسانۂ عجائب" کا گذرے اور حکیم صاحب کے کتب خانہ کی ماشاء اللہ وسعت و جامعیت تو خود ایک مستقل عنوان کی محتاج ــــ

• اور یہ سارا لق و دق کاروبار اور لکھو کھا کی جائداد بجائے ذاتی ہونے کے اب ایک وقف کے ماتحت اور حکیم صاحب بجائے اس کے مالک بلاشرکت غیرے ہونے کے محض اس کے متولی و منتظم۔ یہ ایثار ہی اپنی مثال بس آپ ہے اور حسنِ انتظام جہاں عالی دماغی کی دلیل ہے وہاں یہ ایثار شہادت دے رہا ہے۔ قلب کی فراخی اور روح کی بیداری کی ــــ اور جیسے کہ یہ سارے فضائل و کمالات ناکافی ہوں۔ اب حکیم صاحب نے کمال عالی ہمتی سے بڑے پیمانہ پر ایک جامعہ طبیہ کا انتظام ہاتھ میں لے لیا ہے اور اس کے لئے چن چن کر ملک کے اطباء حاذقین کو جمع کر لیا ہے۔ چنانچہ ہمارے لکھنؤ کے بھی نامور طبیب شفاء الملک حکیم عبد اللطیف فلسفی کو بھی لکھنؤ سے کھینچ بلایا اور شیخ الجامعہ انھیں کو بنایا ہے ــــ

دہلی کی لکھنؤ پر ایک اور تازہ ترین فتح! چنانچہ یہ راز و ہیں شب کے کھانے

کی دعوت میں حکیم صاحب سے مل کر کھلا۔ اور جہاں دلّی کے نصیبے پر رشک ہی آیا کہ انھیں لکھنؤ سے چھین لیا۔ وہیں لکھنؤ کی محرومی پر دل میں کچھ کُڑھن بھی محسوس کی "باسایہ ترانمی پسندم"، کی بات کچھ غلط تھوڑے ہی ہے۔ عین فطرت بشری کا اقتضا ہے۔

دلی کے دو ہی دیسی ادارے ایسے ہیں جنھوں نے ملک گیر شہرت حاصل کرلی ہے۔ شہر شہر بلکہ قصبہ قصبہ ان کا نام پھیل گیا ہے۔ بلکہ بیرون ہند بھی ان کے چرچے تذکرے ہو رہے ہیں۔ ان میں سے ایک نیک نام اور تقریباً بین الاقوامی سا ادارہ یہی ہمدرد کا ہے۔

حکیم صاحب اس سے بہ یک وقت نام ہندوستان کا بھی اونچا کر رہے ہیں اور مسلمانوں کا بھی۔ وطن و ملت دونوں کی خدمت ساتھ ساتھ ذَالِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ ـــــ رہا دوسرا ادارہ اسی زور شور کے ساتھ قریہ قریہ اپنا نام پہنچانے والا تو اب اسی کا نام کیا لیا جائے اور اس نشاندھی کن لفظوں میں کی جائے۔ مسلمانوں کی گردنیں شرم سے جھکا دینے کے لئے کافی ہے۔

روئداد سفر کا آخری نمبر بھی ادھیا گیا اور میزبان محترم کا ذکر اب تک نہ ہونے کے برابر رہا گو ان کا مرتبہ اخلاص اس سے برتر ہے کہ وہ اپنی مدح

سننے کے منتظر یا اپنے ذکر خیر کے مشتاق رہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کوئی بڑی لمبی چوڑی عبارت ان کے تعارف کے لئے ضروری بھی نہیں جامعہ ملیہ سے بعد نماز مغرب جب میں رخصت ہونے لگا تو میرے قدیم و بےتکلف دوست ڈاکٹر سعید انصاری نے بھرے مجمع میں مجھ سے سوال کر دیا کہ کہئیے گورنر بہار اور نائب صدر جمہوریہ میں آپ نے کچھ فرق پایا ہے، جواب اس طرح بے تکلف چٹ پٹ یہ عرض کر دیا گیا کہ گورنر بہار! میں نے تو پرنسپل جامعہ اور نائب صدر جمہوریہ میں کوئی فرق نہ پایا اور لوگ یہ جواب سُن کر ہنس پڑے ــــ ہنسی تائید و تحسین کی تھی انکار یا استعجاب کی نہ تھی ــ

لطیفہ نہیں واقعہ یہ ہے کہ مجھے تو سوا داڑھی میں قصر ہو جانے اور اس قصر کو بھی اب مدت ہو چکی ہے) اور عمر کے طبعی تقاضوں کے اور کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ نہ ظاہر میں اور نہ باطن میں۔ وہی سادگی، وہی قناعت وہی صفائی وہی میٹھی زبان وہی ہر ایک سے تواضع وہی تصنع و تکلف سے اجتناب وہی تعیشات سے احتیاط وہی فرض شناسی، وہی اسلام دوستی، وہی بے تعصبی وہی ذوق مطالعہ ــــــ وہی گھریلوپن اور وہی شیروانی، پاجامہ تین دن کے قیام میں میں نے یہ دیکھا کہ چائے لانے کھانا کھلانے وغیرہ کی ساری خدمت اپنے ذاتی ملازم (اور ملازم کیوں انھیں کی زبان میں "رفیق") قدیم سے لیتے رہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ انھیں چپراسی وغیرہ سرکاری ملازموں کی کیا

کمی ہوسکتی تھی۔ جس کوٹھی میں رہتے ہیں وہ محض منسٹروں کے رہنے کی ہے۔
حالانکہ گورنمنٹ ہاؤس میں رہنے کے عادی ہوچکے ہیں اور گورنر اور منسٹر
کے معیار معیشت کے درمیان فرق ہی نہیں فرق عظیم ہے۔ گورنری سے ترقی پاکر
اس منصب عالی پر آنے کے بعد انھیں حق تھا کہ اپنے لئے کوٹھی بھی ویسی
طلب کریں جو اپنی آرائشوں کے لحاظ سے ایوان صدارت سے کچھ ہی کم ہوتی
لیکن ان کی سادہ مزاجی اور قناعت پسندی نے صدر کیا معنی وزیر اعظم
کی ٹکر کی بھی کوٹھی طلب نہ کی اور جو جگہ بھی رہنے کو مل گئی۔ بس اسی پر ہنسی
خوشی گزر شروع کردیا ـــــ شرافت اور وضعداری ان کا امتیازی جوہر ہے
اور اسلام دوستوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ان کی مذہبیت کا سکہ اونچے حلقوں
میں دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ چنانچہ یہ روایت معتبر ذرائع سے سننے میں آئی کہ کسی
اونچے سرکاری ڈنر کے موقع پر محض اتفاق سے ایک ایسے افسر کے پاس سے
گزرے جو مصروف نائے ونوش تھے تو وہ معًا تعظیم کے لئے کھڑے تو ہوگئے،
مگر جس ہاتھ میں گلاس تھا اسے پیچھے کرکے! ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ ابکی
ملاقات میں ڈاکٹر تاراچند نے اپنی بڑی محنت سے ایڈٹ کی ہوئی ایک
ضخیم فارسی کتاب دکھائی یہ ہندوؤں کی مشہور مذہبی کتاب اپنشاد کا فارسی ترجمہ
داراشکوہ کا کروایا ہوا ہے کتاب قابل داد ہے اس کی شکل دیکھ کر دل
للچا کر رہ گیا۔ کتاب چھپی ہوئی ایران کی ہے۔ ہندوستان میں اس

کے ملنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی میں نے اس کا ذکر میز بان سے محض ضمناً کر دیا اور اپنے اشتیاق کا قصداً مطلق ذکر نہ کیا یہ بات آئی گئی ہوگئی۔ تیسرے دن جب میں چلنے لگا تو عین رخصت کے وقت موصوف یک بیک بولے کہ "ایک کتاب آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر تارا چند کی اُپنشا دمیرے پاس اس کا ایک نسخہ خالی ہے میں دنگ رہ گیا کہ اپنے اشتیاق کا تو میں نے ان سے کچھ ذکر بھی نہ کیا تھا انھیں اس کا علم کیسے ہوگیا۔ بس زبان سے صرف اتنا کہہ سکا، کہ اچھا اب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کچھ کشف صدور بھی ہونے لگا ہے۔"

دکھ کی بات ہے کہ آپ کی صحت خراب رہنے لگی ہے۔ ایک میل روزانہ صبح کی مشی جاری ہے اور کھانا بھی بالکل پرہیزی اور نپا تلا کھاتے ہیں پھر بھی دو شکائتیں زبردست عارض ہیں ایک ذیابیطس دوسرے مرض قلب شکائتیں دونوں ہی سخت ہیں۔ لیکن ثانی برحق کے لئے سختیوں کو آسانیوں میں تبدیل کردینا کیا دشوار ہے اور عجب کیا کہ ان کے حق میں لاکھوں کروروں کی دعائیں سن ہی لی جائیں! قلب سے مراد افسوس ہے کہ طبی قلب ہے کاش مراد وہ قلب ہوتا جو صوفیہ کے دماغ میں بسا ہوا اور شاعروں کی زبان پر چڑھا ہوا ہے وہ قلب جس کے آزار کی تمنا اور دعا بڑے بڑے عارفوں نے کی ہے۔

عاشقی پیدا است از زاریٔ دل
نیست بیاری چو بیماری دل

عشق اگر اپنے جائز محل میں مجازی ہو جب بھی رہبر حقیقت بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

عاشقی گرزیں سرد گرزان سرست
عاقبت مارا بدان شے رہبرست

اگر شروع ہی سے حقیقی ہے جب تو بندے کے حق میں ایک بڑا انعام الٰہی ہے۔

(صدق جدید ۶ ستمبر ۱۹۶۳ء)

چند گھنٹے دہلی میں (۱۹ر اپریل ۱۹۶۵ء)

یوپی سرکار کی قائم کی ہوئی ایک مجلس ہندی سنسکرت اور اردو کتابوں سے متعلق ہے۔ مستقل صدر اس وقت راجستھان کے گورنر ہیں۔ اس تقریب سے کمیٹی کے اجلاس جے پور میں طلب ہوتے ہیں۔ ۱۴ر مارچ کے اجلاس کے لیے ۱۳ر مارچ کی شب میں براہ دہلی جے پور جانا تھا۔ کالکا میل تین گھنٹے لیٹ ہو کر دہلی ۱۲ بجے شب کے بعد پہنچا۔ جس سے ادھر کی گاڑی نہ مل سکی، مجبوراً اور ارادہ کے خلاف کچھ گھنٹے دہلی میں گزارنے پڑے اس تھوڑی سی مدت میں جسم کی آنکھوں کے ساتھ دل کی آنکھوں نے بھی بہت کچھ دیکھ ڈالا۔

دہلی آمد و رفت کا سلسلہ ۱۹۱۳ء سے قائم ہے اس ۵۱، ۵۲ سال کے عرصہ میں کیسے کیسے انقلابات نظر سے گزر گئے۔ دنیا کیا سے کیا ہو کر رہی! کیا زور، کیا طنطنہ کیا ہمہ برطانیہ کا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں دہلی کو دار السلطنت بنے ہوئے دو ہی ایک برس ہوئے تھے۔ در و دیوار تک انگریزی حکومت کا کلمہ پڑھ رہے تھے اور دلوں پر نقش عظمت و احترام سے کہیں بڑھ کر رعب و داب، ہیبت و جلالت اور اقبال مندی کا قائم تھا۔ ہر شمس العلما، چمکا ہوا تھا اور دھوم ہر خان بہادر کی مچی ہوئی تھی۔ پھر وہ دور بھی دیکھا جب دہلی اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور آصف علی کی تھی اور خان بہادر مولوی عبدالاحد (مطبع مجتبائی والے) اور شمس العلماء مولوی سید احمد

(جامع مسجد والوں) کا ستارہ گردش میں آچکا تھا اور دوران پرکسمپرسی کا طاری تھا۔ حسن نظامی اور ان کے رفیقوں ملا واحدی، دیوان سنگھ مفتون اور بھیا احسان کا طوطی بول رہا تھا۔ پادری اینڈریوز انگریز ہو کر ہندوستانیوں سے بڑھ کر ہندوستانی تھے۔ راشد الخیری بھی اپنے محدود حلقہ میں نواسنجی کی داد لے رہے تھے۔ مولانا محمد علی کے ساتھ ساتھ مولانا شوکت علی بھی نیم دہلوی بن چکے تھے سید جالب، میر محفوظ علی، میر باقر علی داستان گو، آصف علی جسٹس عبدالرحمن، خواجہ غلام حسین سب سے ملاقاتیں پہلی بار کامریڈ و ہمدرد کے دفتر ہی میں ہوئیں۔ فاضل جیّد مفتی کفایت اللہ اور واعظ شیوا بیان مولانا احمد سعید کی زیارت بار بار ہوتی رہی۔ ملا واحدی کے ہاں جاڑوں کے موسم میں صبح کی نہاری کا ذائقہ ابتک یاد ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی مہمان داری کا لطف دنوں نہیں ہفتوں اٹھایا اور جی بھر کر قوالی سنی۔ پھر وہ دور بھی نظروں کے سامنے پھر گیا، جب خلافت کمیٹی کے جلسے بار بار ہوا کرتے تھے۔ اور مولانا ثناء اللہ پانی پتی کے نورانی چہرے کے ساتھ عارف ہسوی، مولانا ظفر علی خاں مولانا داؤد غزنوی، مہر صاحب۔ مولانا عبدالقادر قصوری۔ مولانا ابو الکلام مولانا عرفان خاں کی صورتیں لوح حافظہ پر ابھر آئیں۔ ۱۹۲۴ء ۱۹۲۹ء تک روزنامہ ہمدرد کے سلسلے میں خدا جانے کتنی بار دہلی کی حاضری ہوتی رہی اور محمد جعفری سید احمد بریلوی، مولوی احتشام الدین سب ہی سے خلا ملا رہا۔ جامعہ کے

شفیق الرحمٰن قدوائی تو خیر اپنے عزیز ہی تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، مولانا اسلم جیراجپوری، خواجہ عبدالحیٔ فاروقی، ڈاکٹر سعید انصاری بھی رنگ اخلاص میں کچھ کم نہ رہے۔ وقت کا بائسکوپ ذرا اور کھسکا، تو دریا گنج میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں انجمن ترقی اردو کا دفتر یا ڈیرا اور ساتھ ہی بابائے اردو عبدالحق سید ہاشمی فرید آبادی اور پنڈت برج موہن ناتھ کیفی کے ہنستے بولتے چہرے ابھر آئے سید مرتضیٰ علی، حکیم عبدالحمید (ہمدرد دواخانے والے) مفتی عتیق الرحمٰن مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا سعید اکبر آبادی اسی دور کی یادگار ہیں۔ یہاں تک کہ زمانہ طلوع آزادی کا آجاتا ہے۔ اب دور مولانا ابوالکلام، ڈاکٹر تاراچند ڈاکٹر سید محمود اور شیو پرشاد سنہا کا آجاتا ہے۔ رفیع احمد قدوائی اور مجیب صاحب تو برادری اور وطن ہی کے تھے ـــــــ کثرت سے یہ شمعیں اب گل ہو چکی ہیں۔ دو چار جو باقی ہیں وہ چراغ سحر کے حکم میں ہیں۔

قیام جتنی دیر بھی رہا دہلی کے ایک مخلص قدیم حاجی شفیع گھڑی والے (ریکارڈ واچ کمپنی) کے ہاں رہا۔ مولانا محمد میاں (جمعیۃ علما، والے) کی "دید" تو بس برائے نام ہی رہی۔ البتہ ان کے مناقب کی "شنید" اپنے میزبان کی زبانی بڑی خوشس آیند رہی۔ اور یہاں جتنی دیر ملاقات صاحب الجمعیۃ مولانا فارقلیط سے رہی۔ اس نے کلفت سفر کو بھلا دیا ایسی بے زبان اور بے نفس ہستی، صحیح معلومات اور صائب رائے اور درد دل درد مند رکھنے والی وقت کے

صحافتی حلقوں میں کم ہی نظر سے گزری ہے ۔ ان کا ایڈیٹوریل صفحہ معلوم ہوتا ہے
کہ روشنائی سے نہیں خون جگر سے لکھا ہوتا ہے ۔ اس مثنوی کا الہامی مصرعہ ۔

در مینا جام ہیں خون جگر

میں ان کے حق میں ذرا سے لفظی تغیر کے ساتھ یوں پڑھا کرتا ہوں ۔ ع

در مقالاتم ہیں خون جگر

اور اس کمال جذب کے باوجود مجذوب نہیں ۔ سالک ہیں ، واللہ اعلم
کس مجاہدہ سے کام لے کر جوش پر ہوش کو حاکم رکھے ہوئے ہیں ، کسی دوسری
قوم میں ہوتے تو آج ان کی پرستش ہوتی یہاں پُرسش ہی ہو جائے تو بڑی بات
ہے ۔ دوسری ملاقات امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابو اللیث اور ان کے
رفیق ماسٹر افضل حسین سے رہی ، جنھوں نے درسی کتابوں کے ذریعہ سے تعمیری
خدمت کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا ہے ۔ ان دونوں کی شرافت کو دیکھ قدرتاً خدا
یاد آئی کہ انھیں کی جماعت میں کیسے کیسے " ذات شریف ، ، بھی شامل ہو گئے ہیں
مگر پھر اقبال کا قول یاد آگیا کہ اُمتیوں نے تو اپنے پیغمبر تک کو غیروں کی نظر میں
میں بدنام کر کے چھوڑا ہے ــــــــ افسوس ہے کہ ریڈینس RADIANCE والوں
سے بھی ملاقات کی مسرت حاصل نہ کی جاسکی ۔

اسٹیشن سے بلی ماران تک کی مسافت ایک بار پیدل طے کی ، کمپنی باغ
کے اندر سے ہو کر یہ اتفاق سالہا سال کے بعد ہوا اور کیسی کیسی یادیں اس وقت

کی تازہ ہوگئیں! وہ گھنٹہ گھر سرے سے غائب تھا جو چاندنی چوک کی مستقل رونق اور زبردست یادگار رہا تھا، کون تصوّر کرسکتا تھا کہ آزادی کے بعد جہاں ایک طرف کونے کونے پر مورتیاں نصب ہوں گی، گھنٹہ گھر جیسی کارآمد چیزیں وَنًا فَانًا ہست سے نیست ہوجائے گی! مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے! وقت ہی کہاں تھا نہ جامع مسجد کی حاضری ہوسکی اور نہ اس کے سامنے والے اس میدان کی جس کے ایک کونے پر آرامگاہ مولانا شوکت علی کی ہے اور وسط میں مولانا ابو الکلام کی! اور مولانا حفظ الرحمٰن کے مزار تک پہنچنے کے وقت نکالنے کا سوال ہی نہ تھا

(صدق جدید ۱۹ اپریل ۱۹۶۵ء)

کلکتہ

مشاہدات کلکتہ

اپنے قصبہ کے چند جوانمردوں، عالی ہمتوں کے تعلقات کلکتہ سے بہت قدیم چلے آرہے ہیں۔ اور بعض کا تو گویا وطن ہی کلکتہ ہو گیا ہے ان میں سے کچھ محبین، مخلصین کی تمنا عرصہ دراز سے تھی کہ یہ ننگ خلائق بھی وہاں جائے اور گنتی کے چند دن ان کی مہمان نوازیوں سے لطف اٹھائے۔ غرض و غایت اس سے زیادہ کچھ نہیں، نہ وعظ نہ تقریر، نہ جلسہ نہ جلوس، نہ کانفرنس نہ مشاعرہ، نہ لکچر نہ تبلیغ، نہ صدارت نہ خطابت، مقصود محض ملاقات اور دم بھر کا لطف صحبت! — اللہ اللہ! اخلاص میں بھی کیا کشش اور بے تکلف سادگی میں بھی کیسی جاذبیت اُس نے رکھ دی ہے! اپنی کم فرصتی کہیے یا کم آمیزی اور ملاقات چوری، بہرحال اس کا حال اپنے پرائے سب پر روشن ہے۔ اس کے باوجود قلب و دماغ نے اس کے لئے وقت نکالا اور ضمیر نے اس میں کوئی کلفت اور گھٹن نہیں، کچھ فرحت ہی محسوس کی! اپنے قصد سفر کی سبکساری کو کوئی ان پر تکلف احباب اور عقیدت مندوں کے دل میں کوئی کیسے اُتار دے جو دور بیٹھے ہوئے لمبی لمبی رجسٹریاں اور بڑے بڑے تار بھیجتے رہتے ہیں کہ خدا کے لئے فلاں ادبی اور فلاں دینی جلسہ میں ضرور ہی شرکت کیجئے۔ آپ نہ آئے تو جلسہ ہی نہ ہوگا اور اتنے اہم اجتماع کے التواء کا وبال آپ ہی کے سر رہے گا!

کلکتہ کی لائبریریاں، خصوصاً نشنل (سابق امپریل) اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی والی بات دل میں مدت دراز سے گد گدی پیدا کئے ہوئے تھیں کتاب کا کیڑا اپنی غذا کے لئے عرصہ سے بیقرار تھا، طبیعت کو ایک بڑا سہارا مل گیا کہ چلیے اسی بہانہ ان عظیم الشان کتب خانوں کی زیارت نصیب ہوجائے گی ـــ پروگرام ایک سال قبل جون ۱۹۵۴ء ہی میں طے ہوگیا تھا لیکن عین وقت پر ایک خانگی مانع پیش آگیا اور بندہ کو بشری ارادہ کی بےبساطی اور انسانی پروگرام کے ضعف وہن کا تجربہ ایک بار اور کرادیا گیا۔ وقت میں گنجائش اب کی بھی کل آٹھ دن کی نکل سکی، اس میں آنا جانا اور ٹھہرنا ـــ دو دن آنے جانے کے اور چھ دن ٹھہرنے کے ـــ فی ستۃ ایام کی مناسبت بہ طور ایک مبارک تفاؤل کے خوب ہاتھ آگئی!

جون ۱۹۵۵ء کی ۱۷ر تھی کہ صبح ½ ۱۰ بجے دیرہ اکسپریس سے ایک چھوٹا سا قافلہ ہمراہ لئے روانہ ہوگیا۔ اپنے قصبہ سے دو اکسپریس کلکتہ سیدھے جاتے ہیں۔ کہیں ادلنے بدلنے کا جھگڑا ہی نہیں فیض آباد بنارس، مغلسرائے، گیا، شہر در شہر طے کرتا اور یوپی، بہار اور بنگال تین صوبوں کو پار کرتا ۱۸ر کو صبح سویرے کلکتہ پہنچ گیا اور پورے چھ دن سفر میں وطن کا، پردیس میں دیس کا، مسافرت میں اقامت کا لطف

بیتا ہوا ۲۴ رجون کو ½ ۱۰ بجے دن کو واپسی کی ٹرین پر بیٹھا اور راستہ میں ایک بڑے صدق نواز مخلص شیخ عبد الرحمٰن انصاری کی سابقہ دعوت کے مطابق جھاجھا اسٹیشن پر ۵ گھنٹہ کے لئے اترتا ہوا ۲۵ رجون کے سہ پہر کو دیرہ اکسپریس سے مع الخیر اپنے وطن کے اسٹیشن پر واپس پہنچ گیا۔

شہر اپنا دیکھا ہوا تھا، شہر پہلی بار دیکھنے میں آیا، دعوے دونوں متضاد مگر دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ــــ پہلا دعویٰ صحیح یوں کہ یہ دیکھنا ۱۹۱۳ء میں ہوا تھا جب اپنی نوجوانی اور یونیورسٹی کی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ لیکن مولانا ابو الکلام کا "الہلال" ہر ہفتہ طلوع ہو رہا تھا بلکہ اپنے شباب شہرت کے لحاظ سے بدر کامل بنا ہوا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد اللہ عمادی، آغا رفیق بلند شہری، آہ کہ آج سب مرحوم ہیں۔ اس وقت اس کے اسٹاف کی زینت بنے ہوئے تھے۔ اپنا قیام بھی مولانا کی عنایت سے یہیں ہوا تھا۔ آغا صاحب تو اپنے لئے زرا اجنبی سے تھے، باقی ان تینوں یاران باصفا نے تو جیسے وطن کی یاد ہی دل سے بھلا دی تھی ــــ دوسرا دعویٰ صحیح یوں ہے کہ جس نوجوان عبد الماجد نے یہ سفر کیا تھا وہ اب بجز نام کے اس دنیا میں زندہ

ہی کہاں ؟ ۴۰، ۴۴ سال کی مدت کوئی معمولی مدّت ہوئی ؟ دنیا کیا سے کیا ہوگئی اور خیر کلکتہ تو وہ کیا رہتا اُس کا دیکھنے والا ہی وہ نہ رہ گیا، اور نہ اس کے دیکھنے والے کی نظر ہی وہ رہ سکی، تو اگر قلم سے یہ نکل گیا کہ کلکتہ پہلی بار دیکھنے میں آیا تو شاید کوئی ایسی غلط بیانی تو نہ ہوئی!

اتنا بڑا غدّار، لق ودق شہر، جس کا کہنا چاہیئے کوئی اور نہ چھور، رقبہ* میلوں نہیں، منزلوں تک پھیلا ہوا، اور آبادی ہلکے تخمینہ کے مطابق بھی ۳۰ لاکھ! اس کے چھ دن میں دیکھ ڈالنے کا حوصلہ اگر جنون نہیں تو جنون سے کچھ ہی کم تھا۔ لیکن سیاحی کا یہ حوصلہ تھا ہی کب! مقصود تو محض اپنے میزبانوں کا دل خوش کرنا بعض کتب خانوں کی سرسری زیارت کر لینا، اور ایک بہت ہی محدود حلقۂ احباب میں مل ملا لینا تھا خطوط میں تاکید کے ساتھ عرض کر دیا گیا تھا کہ ملاقات کا دائرہ خواص نہیں، صرف اخص خواص تک محدود رہے اور اخبارات تک تو بھنک بھی نہ پہنچنے پائے! ـــ یہ میزبانوں کے اخلاص اور اس سے بھی بڑھ کر فہم سلیم ہمت و مستعدی کا کرشمہ تھا کہ اتنی سی قلیل مدت میں اتنا کچھ دیکھ ڈالا کہ بعد کو سوچنے سے حیرت ہی ہوتی ہے۔

انصاری برادری کو ہمارے بہت سے سید صاحبان اور شیخ

صاحبان خدا معلوم زرا حقارت سے دیکھنے کے کیوں عادی ہو گئے ہیں
اگر مقصود اس سے محض نفس کی "تسلی" اور "شیخی" ہے جب تو اس کا
کوئی علاج ہی نہیں، اور یوں سوچنے بیٹھئے اسلامی نظر سے تو خیر کیا عقلی
پہلو سے اس کا جواز کہیں آس پاس بھی نہ نکلے گا۔ پارچہ بافی، پارچہ سازی
پارچہ فروشی میں آخر عقلی نقلی کسی اعتبار سے بھی قباحت ہی کیا ہے؟
اور کیوں اس پیشہ میں کوئی سُبکی فرض کرلی گئی ہے، زرہ سازی تو
آخر ایک پیمبر جلیل القدر داؤد علیہ السلام نے کی ہے اور ایک دوسرے
پیمبر جلیل نوحؑ کی کشتی سازی کا ذکر خاصی تفصیل سے تو قرآن مجید
نے کیا ہے، گلہ بانی خود ہمارے پیمبر اعظم ہادیٔ کائناتؐ نے اپنی ابتدائی
زندگی میں کی ہے اور تجارت کا مشغلہ تو مدتوں بعد تک جاری رہا۔ ہاتھ
سے کام کرنے کے کسی پیشے میں بھی عیب کا کوئی پہلو آخر کہاں سے نکال
لیا گیا ہے؟ تاریخ اُمّت میں کثرت سے مشاہیر و اکابر ایسے ہی ہوئے
ہیں جو اپنے کو غزال (کاتنے والا) نساج (بُننے والا) حلاج (روئی دھنکنے
والا) حداد (لوہار) خصاف (موچی) خزاز (موچی) بزاز اور حلوائی کہتے ہوئے
شرماتے نہیں فخر محسوس کرتے تھے، اور ماضی قریب اور حال کے بھی
ہندوستان، پاکستان میں امت کے معززین و مشاہیر کی اگر ایک فہرست
تیار کی جائے تو کتنے ہی نام خاص اسی پیشہ اور برادری کے شعر و ادب،

فقہ و کلام، صحافت و طبابت کی مسندوں سے لے کر جاہ و منصب کی اونچی سے اونچی کرسیوں تک نظر آتے چلے جائیں گے! — اپنے بھی دونوں میزبان اسی برادری سے تعلق رکھتے تھے اور دونوں شہر کے اسلامی حلقوں میں نام اور عزت پائے ہوئے ہیں۔

پہنچتے ہی بیقراری امپیریل لائبریری کے لئے تھی جو اب نیشنل لائبریری ہے، اپنی وسعت اور طول و عرض کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں فرد۔ پہنچتے ہی اسے جاکر دیکھا، دیکھا کہاں؟ دیکھنے کے لئے مدت ہفتوں اور مہینوں کی نہیں مدت العمر کی چاہیے۔ ہاں یہ کہیے کہ ایک سرسری نظر کچھ الماریوں پر اچٹتی ہوئی نگاہ ضخیم دفتر در دفتر۔ فہرستوں پر کرلی اور نام کرنے کو دو چار کتابیں ادھر ادھر سے نکلوا کر ریڈنگ روم کی میز پر رکھ لیں۔ اور دل کو دھوکا یہ دے لیا کہ بہرحال ایک سرسری سیر لائبریری کی ہوگئی! — زندگی کی زندگی ہی انھیں تمناؤں، آرزوؤں، حسرتوں کے فریب میں گزرتی رہتی ہے اور یافت کی جگہ حسرت یافت پر قناعت کرنا پڑتی ہے! آہ نایافت کی وہ کثرت جس پر نادان اور پر خود غلط انسان کو اس عالم عنصری میں عمر بھر یافت ہی کا دھوکا ہوتا رہتا ہے! — خیر یہی غنیمت ہوا کہ لائبریری کی ممبری سے متعلق معلومات اچھے خاصے حاصل ہو گئے۔ باہر کے شائقین کے لئے بھی ممبری کا دروازہ ایک

اوسط تعداد کی رقم ادا کرنے پر کھلا ہوا ہے۔ گو عملاً یہ ممبری کچھ آسان نہیں، لائبریری کے کارکنوں میں ایک مسلمان صاحب مل گئے جو نام سے واقف نکلے اور ان کے حسن توجہ سے سہولتیں اور زیادہ حاصل رہیں۔

نیشنل کے مقابلہ نمبر بنگال ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کا ہے۔ یہ پارک لین میں واقع ہے اور قدیم مطبوعات و مخطوطات کے لئے بے نظیر ذخیرہ عظیم کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ بس چلے تو ایک عمر کیا معنی عمریں یہیں گزار دی جائیں۔ یہاں رسائی صاحب "برہان" دہلی مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے پرنسپل کلکتہ مدرسہ کی وساطت سے ہوئی اور مولانا نے یہاں کے خاص کارکنوں سے تعارف بھی کرادیا دو کے نام یاد رہ گئے۔ ایک عربی و فارسی کتابوں کے کیٹلاگر (فہرست نگار) کے ایم میترا۔ یہ ایک مجسمۂ علم و معلومات نظر آئے۔ شریف و شائستہ اور مسلمان اہل قلم سے واقف ہی نہیں، حیرت انگیز حد تک واقف، مدتوں لاہور میں بھی رہے ہیں، ایک زندہ لائبریری تو کہنا چاہیئے کہ یہ خود ہیں، اور دوسرے لکھمن لال چودھری کلکتہ یونیورسٹی میں لکچرر اور شعبۂ اسلامی تاریخ کے غالباً صدر بھی۔ موٹر کے ایک تازہ حادثہ سے آنکھ میں بہت سخت چوٹ آگئی تھی اس کے کرب و تکلیف میں مبتلا تھے، ان کی انگریزی کتاب اکبر کے دین الٰہی پر خود تو نظر سے نہیں گزری، لیکن ایک مسلمان مبصر نے

اس پر جو تبصرہ کیا ہے اس سے تو کچھ اچھی رائے کتاب کے حق میں قائم نہیں ہوتی۔

(۲)

کلکتہ کی شہرت کان میں بچپن سے پڑی ہوئی تھی، سب سے پہلے شاید یوں کہ حبل المتین جو ملک بھر میں اس وقت فارسی کا شاید تنہا ہفتہ وار تھا اور ایک خاص اثر و وقعت بھی رکھتا تھا۔ وہ یہیں کلکتہ سے کسی شیرازی آقا کی ادارت میں نکلتا تھا۔ پھر جب اور سن آیا تو یہیں کے قدیم انگریزی مطبعوں کی ٹائپ میں چھپی ہوئی کتابیں اپنے بزرگوں کے کتب خانوں میں، تفسیر، حدیث، لغت، سیرت وغیرہ پر دیکھیں، کشاف حصہ اول، اتقان فی علوم القرآن، شرح سفرالسعادت، جذب القلوب الیٰ دیارالمحبوب، برہان قاطع، طحطاوی (شرح درمختار) اور خدا جانے اور کون کون سی کتابیں یہیں کی چھپی ہوئی دیکھنا یاد ہیں اسی سن میں یہ بھی سنا کہ اودھ پنچ کے ایک ممتاز نامہ نگار نواب سید محمد خاص کلکتہ ہی کے ہیں، مدرسۂ عالیہ کے مشہور پرنسپل سر ڈینسن راس، اور غالب کے رنگ میں کہنے والے رضا علی وحشتؔ اور ایشیاٹک سوسائٹی کے لائبریرین ڈاکٹر عبداللہ المامون سہروردی اور وقت کے ممتاز ادیب شمس العلماء محمد یوسف ریخور کی علمی و تحقیقی، شعری، ادبی

شہرتوں کی گونج بھی اسی زمانہ میں لکھنؤ اور اس کے اطراف میں سنائی دی، جب اودرسن آیا تو اسٹیٹسمین، انگلش مین، امپائر، بنگالی میں بتریکا کا شوروشغب کانوں تک پہنچنے لگا اور کالج کے زمانہ میں محمد علی جوہر کے کامریڈ، اور ابوالکلام کے الہلال نے قبضہ دل و دماغ دونوں پر جما لیا تھا۔ پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا جب یہاں کے مسلمانوں نے ایک انگریزی اخبار کی بدتمیزی سے مشتعل ہوکر ناموس رسولؐ کی خاطر اپنے کو کٹنے مرنے کے لیے بے تکلف پیش کر دیا۔ یہ وقت وہ تھا (۱۹۱۸ء میں) کہ ابوالکلام اور محمد علی دونوں نظر بند یا قید تھے۔ اور محمد علی نے وہیں بیٹھے بیٹھے اس طرح کے شعر کہہ ڈالے تھے ؎

اللہ نے بڑھائی ہے کیا شان کلکتہ روح رسولؐ آج ہے مہمان کلکتہ
یثرب کی خاک پاک کے ہر ذرہ کے لئے سو جان سے فدا ہیں غلامان کلکتہ
ہر سو ہیں لاشہائے شہیدان سرخوش ہے آج کل بہار پہ ایمان کلکتہ

اور خیر، یہ سب تو داستان پاستان ہے۔ ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ تقسیم ملک سے ذرا پہلے تک یہ شہر ایک مخلص مسلمان عبدالرحمن صدیقی کا معلوم ہو رہا تھا!

چشم تصور کے سامنے یہ خوشگوار، خوش آئند نقشہ پرانے کلکتہ

کا بار بار آرہا تھا، لیکن مادّی آنکھوں سے مشاہدہ ماضی کا نہیں، حال کے جس کلکتہ کا ہورہا تھا وہ بھی ایک یوپی سے آنے والے کے لئے کچھ کم خوش کن نہیں، کم سے کم ایک مقام اور وہ بھی اتنا بڑا مقام اس کے مشاہدہ میں بھارت میں ایسا آیا جہاں "اقلیت" حقیر و خوار نہیں۔ روائتیں بمبئی اور مدراس سے متعلق بھی ایسی ہی سننے میں آئی ہیں، لیکن یہاں ذکر شنید کا نہیں دید کا ہورہا ہے۔ خبر کا نہیں معائنہ کا ہورہا ہے۔ اس سرزمین پر مسلمان آزاد ہیں، جس حد تک کسی اقلیت کا آزاد ہونا ممکن ہے، گھروں میں خودداری کے ساتھ سو سکتے ہیں، سڑکوں پر گردن اٹھاکر، سینہ تان کر چل سکتے ہیں ان کی اپنی دوکانیں ہیں، بڑے بڑے کارخانے ہیں، تجارتی کاروبار ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹل ہیں۔ اپنے اسکول ہیں۔ اسپتال ہیں، یتیم خانے ہیں اور ہاں یہ کیا کہ ان کے ہوٹلوں پر جابجا تختیاں جو انگریزی حروف میں لگی ہیں NO BEEF HERE یعنی یہاں گائے کا گوشت نہیں ہوتا،، اس کے معنی یہ کہ یہاں ان کا حق ذبیحہ بالکل محفوظ ہے، یہ جس جانور کو چاہیں انھیں پوری آزادی ہے کہ اسے ذبح کریں، کھائیں، کھلائیں، یہ اور بات ہے کہ دوسروں کی خاطر یا اپنی کسی اور مصلحت سے خود ہی کسی جانور کو کھانے کی میز پر لانے سے پرہیز کرنے لگیں! — یہ اجازت اور اتنی آزادی آج کی فضا میں معمولی نہیں غیر معمولی ہے۔ تھوڑی نہیں بہت ہے۔ اور جس

سرزمین پر اتنی رواداری، اتنی بے تعصبی، اتنی انسانیت، اتنی انصاف پسندی ابھی باقی ہو، وہاں کی اکثریت اور حکومت دونوں قابلِ مبارک باد ہیں ــــ خیر ایک مسلمان کی حیثیت سے تو ان منظروں سے جی جیسا خوش ہوا ظاہر ہی ہے، لیکن اچھی خاصی خوشی ایک ہندوستانی کی حیثیت سے بھی ہوئی۔ لکھنؤ اور دہلی، پٹنہ اور الہ آباد، حیدرآباد و ناگپور نہ سہی کلکتہ تو بہرحال ایسا ہی نکلا، جس نے "سیکولرزم" کے بلند بانگ دعوے کی لاج رکھ لی۔ اور جہاں اقلیت اکثریت سے دبی ہوئی سہمی ہوئی، دہشت کھائی ہوئی نہیں، اس کے شانہ بشانہ، صف بہ صف کسی حد تک تو نظر آئی ــــ کیا کلکتہ میں ہندو اکثریت اور بڑی اکثریت نہیں؟ یا یہاں کی ہندویت کچھ کمزور ناقص بے دم سی ہے؟

مسلمان کی بڑی پہچان اس کی نماز ہے، اور کہیں کی اسلامی آبادی کی جانچ پڑتال کرنا ہو تو بس یہ دیکھیے کہ وہاں کی مسجدیں کس حد تک آباد اور کس حد تک ویران ہیں ــــــــ کلکتہ کی ایک نہیں مختلف محلوں کی کئی مسجدوں میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، اور انھیں میں ایک مسجد اہلِ حدیث کی تھی، ماشاء اللہ ساری ہی مسجدیں آباد اور پر رونق پائیں اور جامع مسجد یعنی مسجد ناخدا کا تو کہنا ہی کیا! ــــ مسجد کا

ترجمہ خانہ خدا ہے۔ یہ خانہ خدا بھی خوب ہے جو منسوب ایک ناخدا کی جانب ہے! ــــ یہاں نماز پڑھ کر جیسے آنکھیں روشن ہوگئیں۔ وہ اس کا طول وعرض وہ اس کی رونق و آراستگی وہ اس کی خوش تعمیری اور پھر اس کی نمازیوں سے معموری! اس میں داخل ہوتے ہیں دل کی کلیاں کھل جاتی ہیں۔ بے نماز اگر یہاں قدم رکھ لے تو عجب نہیں کہ نمازی ہی بن کر نکلے۔ یہاں کے امام صاحب جو غالباً شامی الاصل یا مدنی الاصل ہیں بجائے خود قابل زیارت ہیں۔ خوش آواز، خوش الحان ہونے کے ساتھ چہرہ پر نورانی داڑھی مُستزاد!

مولانا الیاسؒ کی تبلیغی جماعت کے ناخدا اب لکھنؤ کے مولانا منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی سلمۂ اللہ ہیں ان کا یہاں خاصا اثر دیکھا۔ اور شاید یہ اسی کی برکت ہے جو یہاں اتنی اسلامی بیداری قائم ہے۔ تحریک کے روح رواں یہاں کے ایک تاجر سیٹھ غلام رسول بہاری نظر آئے۔ اسلامیت کے پتلے، نور ایمان کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، دوڑ دوڑ کر دوسروں کی خدمت کرنے والے۔ پیشانی پر سیماھم فی وجوہھم من اثر السجود کا ٹھپا لگا ہوا۔ بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر دل خود اندر سے پکار اٹھتا ہے کہ بے شک یہ جنتی ہیں۔ ایسے ہی گنے چنے خوش نصیبوں میں ایک چلتے پھرتے جنتی یہ نظر آئے۔

—— اور ایک مسلمان کے اخلاص کی داد کے لئے شاید انتہائی اور آخری الفاظ یہی ہو سکتے ہیں۔

اور دینی خدمت گزاریوں میں تقشف و پندارِ زُہد کے قریب گئے بغیر انھیں کے قدم بہ قدم اپنے میزبان حاجی عبدالقیوم انصاری دکھائی دیئے۔ اب تو ماشاء اللہ کشور گنج میں ایک شوگر مِل بھی بڑی کامیابی سے چلا رہے ہیں (اور شیریں زبانی جو پہلے بھی کم نہ تھی، اب شکرسازی کے بعد شاید کچھ اور بڑھ گئی ہے) اس سے پہلے بھی اپنے چھوٹے بھائی محمد امین انصاری کے ساتھ کلکتہ کے مشہور ہوٹل امینیہ ہوٹل (زکریا اسٹریٹ مقابل مسجد ناخدا) کے مالک تھے، اس کا شمار کلکتہ کے ہندوستانی ہوٹلوں میں چوٹی کے ہوٹلوں میں ہے، اور اب نیو مارکٹ میں ایک جدید اور شاندار ریسٹوراں امینیہ ریسٹوراں کے نام سے بھی کھول دیا ہے۔ جو مقبولیت اور مرجعیت میں شاید اپنے ہم نام ہوٹل سے بھی بازی لئے جا رہا ہے۔ انھیں دیکھ کر اور ان سے مل جل کر جہاں یادِ الٰہی کو تحریک ہوتی ہے۔ وہیں ان بھائیوں کا باہمی اتحاد قابلِ رشک نظر آیا، اور یہ سب برکت اسلامی زندگی اختیار کر لینے کی ہے۔ چھوٹے بھائی امین انصاری ایک روز کلکتہ کا مشہور اور انٹرنیشنل ہوائی اڈہ دَم دَم دکھانے لے گئے (لکھنؤ کے چھوٹے سے معمولی ہوائی اڈے کو اس سے

کوئی نسبت ہی نہیں) اتفاق سے ذرا دھوپ کا وقت تھا۔ موٹر سے اُتر کر
کچھ دور تک پیدل چلنا اور ایک جگہ دیر تک کھڑا رہنا پڑا۔ یہ اللہ کا
بندہ ساری مدت پسینہ پسینہ ہونے کی طرف سے بے پروا میرے سر پر
خادموں کی طرح چھتری لگائے یا چلتا رہا یا کھڑا رہا، میں لاکھ ہاں ہاں کرتا رہا
لیکن جس کو اجر حاصل کرتے رہنے کا چسکا پڑ چکا ہو، اور جو خدمت ہی کو
راحت سمجھنے لگا ہو اس پر کیا اثر ہوتا! دونوں بھائی ماشاء اللہ
پورے رئیسانہ ٹھاٹ کے ساتھ چاندنی کی ایک پنج منزلی رفیع الشان
ذاتی کوٹھی رحیم منزل میں رہتے ہیں اور دل میں اس آیت والی ہدایت
کو جمائے ہوئے ہیں۔

وَابتغ فی ما آتاك
الله الدار الآخرة
وَلَا تنس نصيبك من
الدنيا واحسن كما احسن
الله اليك ولا تبغ الفساد
فی الارض۔
(سورۂ قصص ع ٨)

اللہ نے تجھے جو انعام واکرام سے
سرفراز کر رکھا ہے اس سے اپنے آخرت
کے گھر کی فلاح تلاش کر اور ہاں دنیا
سے بھی اپنا حصہ نہ بھلا اللہ نے جس طرح
تیرے ساتھ سلوک کیا تو بھی دوسروں کے
ساتھ حسن سلوک سے کام لیتا رہ، اور روئے
زمین پر فساد نہ برپا کر (ترجمہ مع تشریح)

یہ لوگ تو ابھی سب جوان عمر ہیں اور اسی لئے زیادہ قابل داد

باقی پرانے قسم کے دینداروں میں دوسرے میزبان حاجی عبد الجبار انصاری کا قدم کچھ پیچھے نہیں آگے ہی ہے۔ کوتوٹولہ میں دو دو ہوٹلوں اسلامیہ اور جدید اسلامیہ کے مالک ہیں اور اپنے دو جواں لڑکوں احمد زماں و محمد زماں کے ساتھ بہ فراغت بسر کر رہے ہیں۔ صدق کے ساتھ شیفتگی کا یہ عالم ہے کہ گو اب پڑھنے لکھنے سے تقریباً معذور ہو چکے ہیں۔ اور سامعہ بڑی حد تک جواب دے چکا ہے اور خود صدق بھی ان کے مذاق قدیم سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں رکھتا، پھر بھی پرچہ اوپر کی جیب میں اپنے سینہ سے چپٹائے رہتے ہیں اور جب تک کسی سے پڑھوا کر سُن نہیں لیتے دم نہیں لیتے، ایسے اخلاص کی مثالیں اب شاذ ہی رہ گئی ہیں ـــــ چھ دن کے قیام میں اپنے پہلے تین دن انھیں کے ہاں گزرے اور چوتھی صبح جب ان کے ہاں سے رخصتی ہوئی تو ان کی محبت وخلوص کی نہ مٹنے والی یاد کا نقش دل پر لئے ہوئے!

ـــــــ(۳)ـــــــ

کلکتہ صدق نوازوں سے خالی نہیں۔ ایک بڑے پرانے صدق نواز اطراف سورت کے اور احمد دادا بھائی داؤجی کے خاندان کے سیٹھ سلیمان داؤڈالے۔ ذاتی نیاز ان سے پہلی بار حاصل ہوا ملنے آئے اور بار بار ملے، اپنے ہاں لے گئے، خوب کھلایا پلایا، اور اپنے ہمراہ یہاں

کے دو مُسلم اداروں کی سیر کرائی ۔ ایک یتیم خانہ اسلامیہ ، دوسرے اسلامیہ ہسپتال ـــــ اپنا دل مسلم اداروں کی طرف سے کچھ ایسا کھٹا سا ہوگیا ہے کہ کسی ادارہ کو دیکھنے کے لئے اب شوق سے قدم نہیں اٹھتا لیکن کچھ اپنے میزبانوں کی اور کچھ انھیں سیٹھ سلیمان داؤد کی خاطر سے اس یتیم خانہ کو جاکر دیکھا ۔ یہ ۲۰ سید صالح لین پر واقع ہے ، اوپر نیچے سب گھوم پھر کر دیکھا ، باورچی خانہ ، دفتر طعام خانہ ، لڑکوں کے رہنے کے کمرے وغیرہا ۔ عمارت خاصی ہے ۔ صفائی وغیرہ کا انتظام اوسط درجہ کا نظر آیا ۔ زیادہ قابل داد نہیں ، تو کچھ قابل ہجو و لائق ملامت بھی نہیں ۔ متعدد مسلمان تاجر تو اس کے چلانے میں دل کھول کر حصہ لے ہی رہے ہیں ، ان کے علاوہ یتیم خانہ کی مستقل املاک ہے ۔ مکانات کے کرائے وغیرہ سے معقول آمدنی ہوجاتی ہے ۔ بڑی خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ کارپوریشن بھی ۵،۶ ہزار سالانہ کی گرانٹ اس " فرقہ دار " ادارہ کو دے رہی ہے ۔ دینی تعلیم پر سُنا ہے کہ خاص توجہ کی جاتی ہے ۔ ایک شعبہ صنعت و حرفت کا بھی قائم ہے ۔ انتظامی کمیٹی کے سرپرست صوبہ کے گورنر ہز اکسلینسی ڈاکٹر ایچ ، سی کرجی ہیں جو مذہبًا مسیحی ہیں اور یہ کلکتہ کے مسلمانوں کی خوش نصیبی ہے کہ انھیں گورنر ایسا ہمدرد اور درویش صفت ملا ہے ۔ ان کی سادہ زندگی انصاف پسندی اور درویش منشی کے تذکرے پوری مداحی کے ساتھ مسلمانوں

ہی کی زبان سے بار بار سننے میں آئے اور چند سال قبل کا زمانہ اپنے صوبہ کا یاد آگیا جب یوپی کی گورنر مسز نائیڈو جیسی نیک دل شریف مسلم نواز خاتون تھیں، اس وقت حالانکہ وہ عین مارکاٹ کا زمانہ تھا، اس وقت یوپی ہی اپنے گورنر کو دوسروں کے سامنے فخریہ اوربطور مثال کے پیش کرسکتا تھا ؎

یاد آں روزے کہ دست افشاں گزشتم از حرم
از غرور آں کہ من ہم آستانے داشتم!
یاد آں روزے کہ دور از ماجرائے جہاں
ماجرائے با نگارے نکتہ دانے داشتم!

—— یتیموں کی خدمت تو اسلام کے اہم ترین احکام میں سے ہے۔ قرآن مجید اور اُسوہ رسولؐ دونوں اس پر شاہد ہیں ناطق ہیں۔ مبارک ہیں کلکتہ کے وہ مسلمان جنہیں اس حکم پر عمل کرنے کی سعادت نصیب ہورہی ہے۔

یتیم خانہ سے بھی کہیں بڑھ کر خوشی اسلامیہ اسپتال کو دیکھ کر ہوئی۔ انھیں سلیمان داؤد صاحب کی رہنمائی میں اسے بھی دیکھا اور ہر منزل کے بکثرت کمروں کو خوب گھوم پھر کر دیکھا۔ موجودہ معیار کے

مطابق اسپتال کو چلانا کوئی آسان کام نہیں۔ صفائی، کارکردگی وغیرہ کا
اب جو معیار ہے اس پر کسی اسپتال کو قائم رکھنے کے لئے یہی نہیں کہ بہت
بڑا سرمایہ درکار ہے، بلکہ تنظیم اور اعلا فنی مہارت کی ضرورت قدم قدم
پر ہے۔ اسپتال کو دیکھ بھال کر خوشی کے ساتھ قائل ہونا پڑا کہ کلکتہ
کے مسلمان ماشاء اللہ ان اوصاف سے بالکل کورے نہیں اور کم سے کم
اپنے اس ادارہ کو بغیر زیادہ شرمائے ہوئے دوسری قوموں کو دکھا سکتے
ہیں۔ عمارت اچھی خاصی وسیع اور گنجائش والی ابھی ہے اور اب اس میں مزید
اضافہ ہو رہا ہے۔ اندرونی اور بیرونی مریضوں کی عام تقسیم کے علاوہ بھی
خدا معلوم کتنی ضرورتوں کے لئے مختلف اور بہ کثرت کمرے بنے ہوئے
ہیں۔ یہ سرجری کا کمرہ ہے۔ اس میں آپریشن ہوتے ہیں۔ یہ ریڈیالوجی کا
کمرہ ہے اس میں اکسرے وغیرہ کے آلات قرینہ سے لگے ہوئے ہیں۔
یہ زچہ خانہ ہے اس میں مائیں لیٹی ہوئی ہیں۔ یہ ننھے بچوں کا کمرہ ہے اس
میں ہفتوں اور مہینوں کی عمر کے بچے سو رہے ہیں یہ کمرہ دندان سازی کا
ہے۔ یہ کمرہ آنکھ کے مریضوں کا ہے۔ یہ کمرہ نرسوں کا ہے اور خدا جانے
کتنے اور کمرے اور وارڈ۔ مریضوں کے ہجوم، ڈاکٹروں کی توجہ، مشغول نرسوں
کی تیمارداری، کمپاونڈروں کی چلت پھرت سب کے نظارے گھنٹہ بھر
کی سیر میں ہو گئے۔ اوپر کے درجوں میں آمد و رفت لفٹ کے ذریعہ ہوتی ہے

اسٹاف مختصر نہ ٹٹ پونجیا، ڈاکٹر اچھے اچھے سند یافتہ اور خاصی بڑی تعداد میں موجود، موٹے اور سرسری اندازہ میں پچاس سے کیا کم ہونگے ایک بڑی بات اور موجودہ فضا میں بہت بڑی بات یہ کہ اسٹاف میں مسلمانوں کے علاوہ کثرت سے بنرجی اور چٹرجی اور داس اور پال، بوس اور سین اور سنہا اور گھوش اور گپتا بھی شامل! یوپی والا یقیناً حیرت زدہ کہ یہاں کے ہندو کیسے ہیں جو بے تکلف ایک " اسلامیہ " ادارہ کا جزو بنے ہوئے ہیں اور کیسے یہاں کے مسلمان ہیں کہ ہنسی خوشی اتنے ہندوؤں کو اپنے ادارہ میں لئے ہوئے ہیں! اور عجب بالائے عجب یہ کہ ان غیر مسلموں میں بہت سے محض آنریری ہیں! خادم بلا مزد، کارکن بلا تنخواہ! ـــــ اور ایک لطیفہ عجب ہوا، جو نہی میں داؤدا صاحب کے ساتھ اسپتال کے صدر دروازہ میں داخل ہوا، پیشوائی کے لئے ایک سینیر ڈاکٹر ملے عجب نہیں کہ آنریری سپرنٹنڈنٹ ہوں۔ بڑھ کر ہاتھ ملایا اور گشت کے بیشتر حصہ میں وہی ساتھ رہے۔ قدرۃً خیال یہی قائم رہا کہ یہ تو بہرحال مسلمان ہی ہوں گے۔ داؤدا صاحب نے ملاتے وقت ان کا نام لیا بھی، لیکن بےخیالی میں پوری طرح سمجھ نہ سکا اور دوبارہ سوچنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ گشت کے خاتمہ پر اور رخصت کے وقت جب میں ان کی زحمت کا شکریہ ادا کر رہا تھا تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی ہندو صاحب ڈاکٹر بوس یا ایسے ہی

کچھ اور ہیں! ــــ چشم تصور کے سامنے اس یوپی مرحوم کا نقشہ پھر گیا
جس میں پنڈت موتی لال، مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ساتھ، پنڈت جواہر
لال، چودھری خلیق الزماں کے ساتھ، سر تیج بہادر سپرد، بابائے اردو
مولوی عبدالحق کے ساتھ اور پنڈت جگت نرائن راجہ صاحب محمود آباد
کے ساتھ شیر و شکر نظر آتے تھے۔

دو اور صدق نوازوں سے بھی اب کی پہلی بار ملاقات ہوئی۔
ایک صاحب حکیم محمد زماں حسینی بلیادی مالک دواخانہ قاسمی ہیں بزرگان
دیوبند سے متوسل۔ بیعت و تلمذ دونوں کا سلسلہ وہیں سے قائم۔ اور سیاسی
مسلک و مذاق بھی شاید کچھ اہل جمعیۃ ہی کا سا ہے، لیکن صدق و صدقیات کو
از راہ محبت آنکھوں پر جگہ دینے والے۔ تفسیر ماجدی کی قدر کرنے والے
ہیں، قدر بڑھانے والے اسٹیشن ہی سے مل گئے، اور پھر بار بار اپنے
مطب دواخانہ کا ہرج کرکے اخلاص کی گرمجوشی سے ملتے رہے ــــ
اور دوسرے صاحب ایک عالم دین مولانا قریشی نکلے۔ اچھے خاصے صاحب علم
و نظر یہاں کسی درسگاہ میں ہیڈ مولوی ہیں اور شہر میں بڑی عزت کی نظر
سے دیکھے جاتے ہیں، سنا ہے کہ بیان بھی خوب کرتے ہیں اور نماز عید کی
امامت بھی خلافت کمیٹی کی طرف سے کرتے ہیں (خلافت کمیٹی کے نام کو طبع

دکتابت کی غلطی نہ سمجھئے بمبئی کی طرح کلکتہ میں بھی خلافت کمیٹی کا وجود
اب تک قائم ہے ۔ دینی مسائل میں مدیر صدق اپنے بعض تفردات کے لئے
بدنام ہے اور جب کبھی ٹھیٹھ علمائے کرام کے طبقہ سے اپنے ان تفردات
یا آزادخیالیوں کی تھوڑی بہت تائید مل جاتی ہے تو مسرت کے ساتھ ساتھ
حیرت بھی ہوتی ہے اور تائید کا درجہ بعد کا ہے ۔ مولوی صاحبان کی طرف
سے رواداری ہی کا ثبوت غنیمت بلکہ ایک نعمت معلوم ہوتا ہے مولانا ترین
اسی قسم کے چند گنے چنے علماء میں سے ملے ، جن کے ہاں تحقیق کے معنی تحقیق
ہی ہیں ، علما رمتقدمین کی چھوٹے بڑے ہر معاملہ میں سو فیصدی تقلید کے
نہیں ملے تو پھر اسٹیشن تک ساتھ نہ چھوڑا ، اور اسٹیشن پر ان آنکھوں
نے یہ نظارہ بھی کیا کہ میرے سامان کا کچھ حصہ قلیوں کے ساتھ یہ بھی اٹھائے
ہوئے ہیں اور دن دوپہر کی روشنی میں بے تکلف ایک پلیٹ فارم سے
دوسرے پلیٹ فارم پر اسے لئے ہوئے چل رہے ہیں ! ـــــ اخلاص کی
دولت بڑی دولت ہے اور اپنے کو بڑا کر کے دکھانے کے بجائے خلق کی
نظریں اپنے کو پست وحقیر دکھانا ایک مرد مومن ومجاہد ہی کا کام ہو سکتا
ہے ۔ کما قال العارف الرومی ؎

اشتہار خلق بند محکم است ۔۔ در رہ ایں از بند آہن کے کم است
خویش را رنجور سازی زار زار ۔۔ تا ترا بیرون کنند از اشتہار

انھیں نے بڑے کام کا مشورہ یہ دیا کہ "صدق" میں آئندہ تفسیر پارۂ عم کی مسلسل و باترتیب چھپتے رہنا چاہئیے۔ یہ نہیں کہ کبھی کسی سورت کی نکل آئی اور کبھی کسی کی۔ ان کا یہ مشورہ بہت معقول نظر آیا اور دو ہی چار ہفتہ سے انشاءاللہ اس پر عمل شروع ہو جائے گا۔

کلکتہ جاکر اگر ان سب مخلصوں کی زیارت نہ ہو جاتی تو یقیناً اس کا شمار اپنی محرومیوں میں ہوتا اور اپنی خوش بختی میں کسی عنوان کی کمی رہ جاتی۔

اردو اخبارات یہاں سے ایک نہیں متعدد نکلتے ہیں، لیکن زیادہ مشہور و مقبول جیسا کہ ایک سرسری مسافرانہ عاجلانہ اندازے میں نظر آیا دو ہیں ایک آزاد ہند، دوسرے عصر جدید۔ آزاد ہند غالباً نیشلسٹ مسلمانوں کا ترجمان ہے۔ لیکن اس کی اسلامیت اس کی نیشلزم سے مغلوب اور نمبر دوم پر نہیں، بلکہ اس پر غالب اور نمبر اول پر ہے۔ اس کے ایڈیٹر میرے ایک سابق دوست مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے فرزند ارجمند ہیں اور اس رشتہ سے اور دوسرے رشتوں سے بھی میرے ہر طرح چھوٹے ہیں، خیال نہ تھا کہ ملاقات ہوگی، مگر خبر سن کر ملنے آئے اور اس کے بعد بھی ملے، ملے تو اس طرح کہ جیسے ہمارے مشرقی اسلامی معاشرہ میں ایک "عزیز وا قربیز" اپنے کسی بڑے سے ملتا ہے، مل کر جی خوش ہوا

الحمد للہ آثار رُشد و سعادت پائے گئے، اللہ انھیں ہر طرح فخر خاندان فخر وطن، فخر ملت بنائے ـــــ دوسرے روز نامہ کے ایڈیٹر سید محمد مصطفیٰ صابری شروع ہی میں ایک روز مغرب کے وقت ایک مسجد میں مل گئے اور پھر گھر تک ساتھ آکر بہت دیر تک بیٹھے، اطراف سہارن پور کے رہنے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ صدق بلکہ سچ کے پڑھنے والوں میں سے ہیں۔ عصر جدید کلکتہ کا ایک بہت پرانا روزنامہ ہے۔ مولانا شائق احمد عثمانی بہاری (شاگرد حضرت شیخ الہند) کا پرچہ تھا اور مسلم لیگ کی ترجمانی کرتا تھا۔ اس کے نام سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں، خدا کرے یہ صاحب اس کی نیک نامی میں اضافہ کرنے والے ہوں ـــــ بہرحال اخباری پالیسیاں جو کچھ بھی ہوں، دونوں کی شخصیت کا جہاں تک تعلق ہے مل کر مسرت ہی ہوئی اور دونوں کی ملاقات کی خوشگوار یاد دل میں قائم ہے۔

(۴)

برطانوی دور کی یادگاریں کلکتہ میں دو چار دس بیس نہیں بیشمار ہیں۔ انگریزوں نے اپنے عروج کی سب سے لمبی مدت اور مہلت ہندوستان میں کلکتہ میں پائی بھی تو اس لئے ان کی بڑی سے بڑی اور بہترین یادگاروں کا یہاں قائم رہ جانا بالکل قدرتی ہے۔ وکٹوریہ میموریل کا نام مدت سے سننے میں آرہا تھا، تصویریں بھی بار بار دیکھنے میں آچکی تھیں، اصل عمارت

کے دیکھنے کا اتفاق اب کی ہوا، ایک نہایت وسیع حلقہ سرسبز وشاداب ہرطرف چمن ہی چمن، اندر ایک چھوٹی سی خوبصورت نہر گزرتی ہوئی وسط میں ملکہ وکٹوریہ کا عظیم الشان پُر اجلال سنگین بت۔ اس کے بعد بڑی اونچی کرسی پر ایک عظیم الشان حسین عمارت، بالائی اور زیرین حصہ ملاکر بیسیوں درجے گویا ملکہ وکٹوریہ سے متعلق ایک پورا میوزیم ملکہ کے فوٹو ہرسن وسال کے۔ اور مختلف موقعوں اور تقریبوں کے وقت کے لگے ہوئے، تصویریں صرف ملکہ کی نہیں، ان کے شوہر اور پہلی اولاد اور متعلقین کی بھی۔ اور پتھر کے بُت جو نصب ہیں وہ ان کے علاوہ۔ مختلف کمروں میں اس وقت کے ہتھیار کسی میں لباس، کسی میں فرنیچر وغیرہا۔ ہشت پہل درمیانی ہال میں ملکہ کے فرمان ہندوستان کی حکومت ۱۸۵۸ء میں سنبھالتے ہوئے اور پھر ۱۸۷۵ء میں شہنشاہیِ ہند کا لقب اختیار کرتے ہوئے وقتوں کے یہ شاہی فرمان دیواروں اور پتھروں پر کندہ ہیں اور علاوہ انگریزی، ہندی بنگلہ کے اردو زبان میں بھی ہیں، اردو کے دونوں فرمان پڑھ کر دل نے بڑا اثر قبول کیا۔ ایک صدی قبل کی اردو آج سے کتنی مختلف تھی اور اس وقت اس کی کتنی عظمت وقعت واہمیت رعایا اور بادشاہ دونوں کی نظر میں تھی! اور اب کوئی شاہی فرمان کیوں کبھی اس سرزمین پر اُردو میں جاری ہونے لگا!۔۔۔ صاحب "برہان" مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا بس اگر چلتا

تو شاید چو بیسوں گھنٹہ ساتھ رہتے، تعطیلات گرما کا زمانہ ختم ہو کر ان کا مدرسہ عالیہ اب کھل رہا تھا اور شروع سال میں پرنسپل کو جیسی مشغولیت ہوتی ہے ظاہر ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کے گھر میں کئی کئی بیمار تھے، اور شدید خانگی پریشانیوں میں مبتلا۔ اس پر بھی وقت برابر نکالتے رہتے۔ چنانچہ آج کے پروگرام میں بھی وہ برابر ساتھ رہے اور رفاقت و رہنمائی دونوں کا حق ادا کرتے رہے۔

کلکتہ میں دیکھنے کے قابل یہاں کا "زولاجیکل گارڈن"، باغ حیوانات یا عوامی زبان میں چڑیا گھر بھی ہے۔ بڑا لق و دق فرلانگوں کا نہیں، کئی میل مربع کا رقبہ گھیرے ہوئے، کوئی ایک وقت میں سارا دیکھ ڈالنا چاہے تو پیر تھک جائیں گے اور سیر ختم نہ ہوگی۔ کوئی دو چار خانے یا پنجرے میں رہتے ہوں تو بیان کیا جائے، شیر، چیتا، تیندوا، لکڑبگھا، ہاتھی، گینڈا بندر، لنگور، بن مانس، سانپ، چیتا، شتر مرغ، ریچھ، بھیڑیا، گیدڑ لومڑی، بلی، کتا، مچھلی، گلہری، مرغی، طوطا، وغیرہ آبی، صحرائی، پالتو، ہوائی ہر قسم کے چھوٹے بڑے، دیسی، ولایتی، ہیبتناک و خوشنما جانور، اور پھر ایک ایک جانور کی درجنوں بیسوں قسمیں اور سب کے لئے ان کے مناسب حال الگ الگ تالاب اور درخت اور جھیلیں اور رہنے بنے ہوئے کوئی

کہاں تک گن سکتا ہے اور کس کس کو دیکھ سکتا۔ بار بار قرآن مجید کی آیت دماغ میں گشت کر رہی تھی کہ

وان من شی الا عندنا خزاینہ وماننزلہ الا بقدر معلوم۔ (سورہ الحجر رکوع ۲)	کوئی بھی چیز ایسی ہے جس کے ڈھیر کے ڈھیر ہمارے پاس موجود نہیں اور ہم ان میں سے ایک اندازہ مقررہی کی تعداد میں دنیا میں نازل کرتے ہیں۔

جب انسانی دماغ اتنے ہی سے محدود، خزانہ کو دیکھ کر چکرا جاتا ہے تو خزانہ قدرت کی وسعتوں کو کس بندہ کی مجال ہے کہ اپنے تصور کی گرفت میں بھی لا سکے؟ ــــ لکھنؤ کا چڑیا گھر (زو) بھی اس میں شبہ نہیں کہ بہت بڑا اور قابل دید ہے لیکن بقول شخصے

آم کے آگے نیشکر کیا ہے؟

کلکتہ کے چڑیا گھر سے اسے بھی وہی نسبت ہے جو خود لکھنؤ کو شہر کلکتہ سے ہے ــــ مولانا سعید اکبرآبادی اپنے مشاغل کو چھوڑ اس سیر سپاٹے میں بھی ساتھ ساتھ۔

کلکتہ بمبئی کی طرح بالکل لب سمندر نہیں، سمندر یہاں سے ۶۰،۵۰ میل کے فاصلہ پر ہے، لیکن دریائے ہوگلی جو عین ہوڑہ اسٹیشن کے پاس سے گزرا ہے اور شہر کے ایک بڑے حصہ کا حصار کئے ہوئے ہے اپنی

وسعت و پہنائی میں سمندر کی قائم مقامی کئے ہوئے ہے اور اول نظر میں اس پر سمندر ہی کا دھوکا ہوتا ہے۔ کشتیاں، اسٹیمر، جہاز سب اس کی سطح پر رواں۔ تفریح کا بہترین منظر ہر وقت پیش کئے ہوئے اور شام کے وقت تو علی الخصوص ــــ میزبان حاجی عبدالقیوم انصاری کی دینداری کا یہ عالم کہ بڑی سی جانماز موٹر پر مستقلاً رکھی ہوئی، شام کو دریا کے کنارے سے گزرے کہ ایک بڑا میدان دیکھ کر رک گئے۔ سواریاں جو دونوں موٹروں میں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں اتریں، باقاعدہ اذان ہوئی۔ پڑوس کے قلی خلاصی بھی دوڑ دوڑ کر شریک جماعت ہو گئے، اور نماز مغرب دھوم دھام کے ساتھ ادا ہو گئی۔ راستہ چلتا رہا، موٹروں پر موٹریں گزرتی رہیں اور ہندو اور پارسی، عیسائی اور یہودی سب نے نظارہ کر لیا کہ مسلمان کا دین مندر و کلیسا کا پابند نہیں۔ رب السمٰوات والارض کی بنائی ہوئی ساری ہی زمین مومن کے لئے سجدہ گاہ ہے۔ وہ سفر میں ہو کہ حضر میں وقت نماز اس کے لئے یکساں!

کلکتہ کی لکھوکھا کی خلقت میں ہر ملت و مذہب اور ہر ملک و قوم کا آدمی آباد ہے۔ ایک دریاباد کی مخلص ڈیمزن لین میں رہتے ہیں۔ ایک دن ان کے ہاں جاتے ہوئے گزر چینیوں کی آبادی سے ہوا، رہنے والے سب کے سب چینی، چینی لڑکے کھیلتے ہوئے چینی عورتیں گزرتی ہوئی چینیوں کے ہوٹل

چینیوں کے مسلک و مذاق کے سارے ساز و سامان۔ واپسی میں نماز عصر اسی چینی محلہ میں۔ ایک چھوٹی سی مسجد میں پڑھی اس سے متصل دیکھا کہ ایک یہودی معبد کا سائن بورڈ لگا ہوا، بس دیوار بیچ ادھر مسلمانوں کی مسجد، ادھر یہودی کی ہیکل۔ کتابوں میں ذکر پڑھ لینا اور چیز ہے اور خود مشاہدہ کرنا اور۔ کسی ہیکل یہود کو آج تک دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا پہلی بار اسے دیکھا مگر یہ بہت ردی حالت میں تھی۔ دو بوڑھی غریب سی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں بجھی ہوئی لکڑی کی بنچیں الماریاں وغیرہ سب شکستہ اور بہت بوسیدہ۔ دیکھ کر کچھ جی خوش نہ ہوا اور معلومات بہت ہی کم حاصل ہو سکے۔ سوالات جتنے کئے گئے ان کے جواب میں تقریریں تو بڑی لمبی سننے میں آتی تھیں لیکن ۹۰ فیصدی غیر متعلق کبھی آپس کے جھگڑے، قضیے، کبھی مقامی اکابر یہود کی شکوہ و شکایت۔ ہاں الماریوں میں رکھے ہوئے کچھ تبرکات کی زیارت البتہ ہو گئی۔ اور ہاں گفتگو عموماً اردو ہی میں ہوتی رہی، اور یہ دیکھ کر دل کی کلیاں مسرت سے کھلتی رہیں کہ لکھنؤ اور دہلی کی رہنے والیاں نہیں، کلکتہ کی عورتیں اور وہ بھی مسلمان نہیں، یہودنیں، اردو ایسی صاف، رواں اور بے تکلف بول رہی ہیں کہ جیسے وہ ان کی مادری زبان ہے! ــــ خیر دیر کے بعد کام کی بات صرف اتنی مل سکی کہ یہاں نہیں بلکہ ایک دوسرے محلہ میں عزرا اسٹریٹ پر ان کے بڑے معبد میں عین اسی وقت یعنی ۷ بجے شام کو نماز

ہو رہی ہوگی۔ سرڈیوڈ عزرا، ابھی حال ہی میں یہود کے ایک ممتاز لیڈر کلکتہ میں گزرے ہیں، یہ سڑک انھیں کے نام پر ہے، عجب نہیں کہ اردگرد اور بھی یہود آباد ہوں۔ شوق نے چند منٹ میں یہاں پہونچا دیا۔ یہ معبد واقعی عالی شان تھا۔ یہود جیسی ممتاز قوم کے شایان شان، اونچی کرسی اور اس پر کلیسا نما ایک بلند عظیم عمارت۔ نماز جاری تھی ہال بہت بڑا تھا، اچھے قسم کے فرنیچر سے مزین، لیکن نماز اس عبادت کو صرف اس معنی میں کہا جا سکتا ہے تھا کہ خطیب قبلہ (بیت المقدس) کی طرف رخ اور حاضرین کی طرف پشت کئے ہوئے توریت عبرانی سے عبارتیں سنا رہا، اور حاضرین کبھی آمین اور کبھی کچھ اور مناسب حال فقرے کبھی بیٹھے بیٹھے اور کبھی کھڑے ہو کر کہتے جاتے تھے، باقی اور کوئی بات مسلمانوں سے ملتی جلتی اس آدھ گھنٹے کے اندر دیکھنے میں نہ آئی، اور سجدہ تو خیر کیا ہوتا، رکوع یا مقتدیوں کی صف بندی یا نمازیوں کی تمام تر قبلہ رخی وغیرہ کوئی شئے مسلمانوں کی نماز کی سی نظر نہ آئی اور اس سے زیادہ ٹھہرنے کا وقت نہ تھا ــــ یہود کی تاریخ جو کچھ بھی شہادت دیتی ہو، اور آج بھی اس قوم کی عملی حالت جو کچھ بھی ہو، تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ دنیا میں آج توحید و نبوت کی نام لیوا اگر روئے زمین پر کوئی قوم مسلمانوں کے بعد ہے تو وہ یہی قوم یہود ہے، ورنہ شرک نے تو ہر ہر مذہب کے اندر اپنے قدم جمائے ہیں اور عقیدہ وحی و نبوت سے

دنیا کے بیشتر مذاہب اس وقت بیگانہ ہو چکے ہیں، خود قرآن مجید ایک طرف یہود پر سخت سے سخت گرفت کرتا ہے، ان کی تاریخ سے نافرمانی سرکشی، شوخ چشمی کی ان گنت مثالیں پیش کرتا ہے، لیکن دوسری طرف قرآن ہی کو اگر ذرا غور سے پڑھئے اور الفاظ کے ساتھ ساتھ بین السطور کو بھی ذہن میں رکھئے تو جا بجا اسی قوم پر انعامات الٰہی اور خصوصی سرفرازیوں کی بارش کا ذکر بھی ملے گا۔ اور اسی قوم سے تخاطب میں بار بار، اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ کی تکرار بھی موجود ہوگی، لب و لہجہ کہیں بھی ایسا نہیں جیسا کہ توحید دشمن و توحید بیزار مشرکوں کے مقابلہ میں ہے۔ بلکہ صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شفیق باپ اپنے نالائق بیٹے کو خطاب کر رہا ہے کہ "اے بدبخت، میں نے تو تیرے ساتھ یہ یہ احسانات کئے لطف و کرم خصوصی سے تجھے سرفراز رکھا۔ تیرے تمام ہمجولیوں میں تیری عزت بڑھائی اور تو نے اس سب کے معاوضہ میں اس درجہ ناشکری دکھائی، شروع سے اب تک برابر نافرمانی ہی کرتا چلا آرہا ہے"۔۔۔۔مسلمان کو ان ابراہیم زادوں، اسحٰق زادوں، اسرائیل زادوں کے کیش و ملت سے لگاؤ ہونا ایک حد تک بالکل قدرتی ہے۔

(۵)

کلکتہ آکر مسلمانوں کے مشہور مایہ ناز۔ مدرسہ عالیہ، (جواب جزء عالیہ"

حذف کرکے صرف "مدرسہ" رہ گیا ہے) کی شکل نہ دیکھنا خود اپنے اوپر
ظلم کرنے کے مترادف تھا، عین وہی زمانہ تعطیل کلاں کے بعد مدرسہ کے کھلنے
کا تھا، صدر مدرسہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی محض اعزازی مولانا نہیں
دیوبند کے باضابطہ فارغ و فاضل ہیں اور اس کے بعد انگریزی امتحانات
کی طرف توجہ کی یہاں تک کہ ایم اے ہو گئے، ایسی مثالیں ندویوں
میں تو خاصی مل جائیں گی، دیوبندیوں میں شاذ ہی ملیں گی، بہرحال ان
مجمع البحرین پرنسپل کی عنایت مجھے بغیر مدرسہ کا گشت کرائے کیوں
چھوڑتی، افسوس ہے کہ وہ وقت درس کا نہ تھا، ورنہ جی میں تو یہی
تھا کہ استادوں کے درس میں شریک ہوا جائے اور بہ قدر ظرف اس
سے استفادہ کیا جائے۔ بہرحال سہ پہر کے وقت مدرسہ کی شاندار عمارت
اوپر سے نیچے تک تفصیل سے گھوم پھر کر دیکھی، کلاسوں کی وسعت و
تعدد کا اندازہ کیا اور پھر ایک کمرہ میں سارے استادوں سے یکجائی
ملاقات بھی ہوئی ـــــ ان میں مولانا عبدالحلیم صدیقی اپنے قدیم عنایت
فرما نکلے، انھیں دیکھتے ہی دور خلافت کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، جب
جمیعت خلافت اور جمیعت العلماء ایک دوسرے کے دوش بدوش
کام کر رہی تھیں، ان سے اس سے قبل بھی ملاقاتیں ہو چکی تھیں، مدرسہ
میں ظہر ہوئی اور نماز عصر مسجد میں انھیں کے اقتداء میں ادا ہوئی، مولانا

حمید الدین صاحب (عزیز خاص مولانا حسین احمد صاحب) سے بھی عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی۔ مولانا حفظ الکریم معصومی، مولانا ابو سلمہ محمد شفیع (جن کے مقالے برہان کے اوراق میں اکثر نظر سے گزرتے رہے) کاظمی صاحب ہیڈ ماسٹر اور دوسرے محترم اساتذہ کی بھی زیارت ہوئی ـــــ یہیں ایک صاحب نے مدرسہ کے اسکول میگزین "صبح نو" کے کچھ پرچے پیش کئے۔ رسالہ انگریزی، بنگلہ، اردو کا مجموعہ ہے جس میں ۳۲ صفحہ اردو کے حصہ میں آئے اور نام تو تمامتر اردو ہی ہے۔

اتنے قریب پہنچ کر مولانا صدیق کے مسکن پر حاضری کیوں رہ جاتی بچارہ اپنی بے سروسامانی اور ہم لوگوں کے اعتذار کے باوجود چائے تیار کرانے میں لگے رہے، ادھر میں ان کے ہاں دیوار سے لگی ہوئی کتابوں کا جائزہ لینے میں مصروف رہا، اچھا خاصا ذخیرہ جمع تھا، تفسیر، فقہ، ادب دلچسپ ہر قسم کا، سیاست کا چسکا بُرا ہوتا ہے، اگر مولانا اپنے وقت کو علمی خدمات کے لئے مخصوص کر دیتے تو قرآنی صرف و نحو یعنی اعراب القرآن پر ایک اچھی کتاب کی بڑی ضرورت ہے، ضرورت کے پورا کرنے کی سعادت وہ اپنے نام آسانی سے آلاٹ کرا سکتے ہیں۔

اپنے دور کے عزیزوں میں ایک رامپوری الاصل بیرسٹر حیدر آباد دکن

میں ہائی کورٹ کے جج تھے، خلیق الزماں صدیقی، ریٹائر ہوتے وقت غالبًا چیف جسٹس تھے، کلکتہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہیں ہیں اور ریٹائر ہونے کے بعد پھر ایک بڑے سرکاری عہدہ پر لے لئے گئے ہیں۔ بھارت راج میں اب سرکاری منصبوں اور عہدوں کے انتخاب میں کسی مسلمان کے آجانے پر حیرت ہی ہوتی ہے، لیکن زیادہ حیرت اس لئے نہیں ہوئی کہ مسلم بیزاری کی یہ رو عمومًا نیچے اور متوسط درجہ کے عہدوں تک محدود ہے۔ ورنہ جو بہت اعلا قسم کے عہدہ ہیں اور جو عمومًا صوبہ سرکار کے اختیار میں نہیں بلکہ براہ راست مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہیں ان میں تو مسلمانوں کا قحط بحمداللہ اب بھی نہیں۔ بہرحال ان کے بعد پنشن پھر از سرنو منتخب ہوجانے پر مسرت کے ساتھ تھوڑی سی حیرت بھی ضرور ہوئی خصوصًا اس لئے کہ یہ بچارہ سیدھے سادہ، نیم درویش اور متوکلانہ طبیعت کے آدمی ہیں۔ دوڑ دھوپ اور رسوخ واثر پیدا کرنے کے موجودہ طریقوں سے ناآشنا، تلاش کے بعد ان کا پتہ لگا اور ان تک رسائی ہوئی، کچھ عرصہ سے بعض بڑے شہروں میں سرکار نے ایک عدالت عالیہ لیبر ٹریبونل کے نام سے قائم کی ہے (کارخانہ داروں اور اہل حرفہ کی نزاعات کا فیصلہ کرنے کے لئے) اور اس کا درجہ ہائی کورٹ کے برابر ہی رکھا ہے۔ یہ جسٹس صدیقی یہاں اس عہدہ پر ہیں اور عدالت کے محض ممبر یا رکن ہی

نہیں، بلکہ چیف جج (رکن اعلا) دو اور جج دونوں غیرمسلم ان کے ماتحت ہیں، اس پر حیرت اور زیادہ رہی۔ یہ جب ملے تو پھر اسی طرح گھل مل کر ملے جس طرح ایک عزیز اپنے سے سن میں بڑے عزیز سے ایک عرصہ کی جدائی کے بعد ملتا ہے۔ دلی مسرت یہ دیکھ کر ہوئی کہ ان کی مذہبیت اور سادگی میں ماشاءاللہ کچھ اضافہ و ترقی ہی ہے۔ نماز کے پابند شروع سے تھے۔ اب لباس و عام معاشرت میں سادگی اور بڑھ گئی ہے۔ محض کرتا پاجامہ پہنے لوگوں سے ملنے ملانے بے تکلف باہر نکل پڑتے اور بیٹھتے اٹھتے سادگی و بے تکلفی اس درجہ کی کہ اتنے بڑے عہدہ دار تو کیا معمولی عہدہ دار بھی معلوم نہیں ہوتے! ــــ ان کی والدہ ماجدہ کو دیکھا، تو دل نے خاموش پند و موعظت کے بہت سے سبق حاصل کر لئے۔ ۲۰، ۲۵ سال قبل حیدرآباد میں دیکھا تھا تو گو جوان اس وقت بھی نہیں رہی تھیں۔ پھر بھی خوش جمالی، خوش لباسی، خوش دماغی، خوش تدبیری میں اپنی نظیر آپ تھیں۔ اب جو دیکھا تو محض ایک مجموعہ پوست و استخوان مسلسل مبتلائے کرب و فغاں، لیکن زبان پر برابر انابت و استغفار کے کلمات جاری۔ یہی رٹ کہ میں بڑی گنہگار ہوں، بد اعمال ہوں، فرائض کی تارک رہی، وغیرہا۔ عموماً تیماردار اور عزیز قریب اس یاد کو بھلانے اس احساس کو مٹانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، حالانکہ ہر مومن ومومنہ کے لئے یہ بہترین

علامتوں میں ہے۔ اور مبارک ہے وہ کلمہ گو جسے اپنی عمر کے اخیر حصہ میں انفعال و استغفار کی پوری توفیق ہوجائے۔ ہر ہر آنسو موتی کا قطرہ ہوتا ہے، نفس کو آلائشوں سے دھونے والا، روح کو پاک وصاف کرنے والا جان کو جنت کے قابل زیادہ سے زیادہ بنا دینے والا! عارف رومی نے کچھ دیکھ کر کہا ہے ؎

خوش نماید نالۂ شبہائے تو
ذوقہا دادم بہ یارب ہائے تو

اے ہمارے بندہ یہ تیرا رات رات بھر کراہنا آہ وزاری کرتے رہنا بیکار نہیں جاسکتا، یہ تو عین قدر کا باعث اور مقبولیت کی علامت ہے یہ تیرا "یارب، یارب" رٹتے رہنا تو ہمارے دل میں تیرے لئے اور جگہ پیدا کرنے والا ہے۔

کلکتہ مادی آنکھوں میں شہر کا شہر پورا دلھن کی طرح بناؤ سنگار سے آراستہ گل وگلزار بنا ہوا ہے۔ دن تو دن رات کا بھی بڑا حصہ دن ہی بنا ہوا۔ ملوں، مشینوں، انجنوں، کارخانوں کی ہر وقت چیخ دپکار باشندوں کی بھاگ دوڑ کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس شہر کو سکون کبھی بھی نصیب ہوتا ہے۔ مادی رونق اور چہل پہل کے اعتبار

سے کم کس حصہ کو کہیئے اور زیادہ کس کو۔ اور رعنائی کا تو خیر پوچھنا ہی کیا
معلوم ہوتا ہے کہ تمدن جدید کی ساری بہار اور مزہ داری کا عطر کھنچ کر
اتنے سے خطۂ زمین میں آگیا ہے! ـــــ خیال پھرتے پھراتے بار بار یہ
آتا تھا کہ زندگی کے اتنے شدید ہیجان میں کبھی موت کا بھی گزر ہوتا ہے۔
بیشمار موٹروں، بسوں، ٹرامکاروں کے درمیان کبھی کوئی جنازہ گزرتے
نہ دیکھا، اتفاق سے ایک شام کو بعد مغرب ایسے حصہ سے گزر ہوا، جہاں
مسلمانوں کا قبرستان تھا، موٹر کسی اور ضرورت سے رکا، دل بے اختیار
چاہا کہ اُتر کر قبرستان کے اندر چلیے اور فانی زندگی کی جلوہ آرائیوں سے
کچھ دیر کے لئے توصرف نظر کرکے ان مستقل شہر خموشاں والوں کی خدمت
میں حاضری دیجئے ـــــ "زندہ" کو "مردہ" ہوتے چلتے پھرتے جسم کو
سطح زمین سے زیر زمین منتقل ہوجاتے، ناسوت سے عالم برزخ میں
قدم رکھتے کچھ بھی دیر لگتی ہے؟ اور کسی کو کیا خبر کہ فاتحہ پڑھنے والا کس
گھڑی، کس لمحہ، خود ہی فاتحہ کا محتاج ہوجائے ـــــ وقت میں اتنی
گنجائش تو نہ نکل سکی۔ احاطۂ گورستان سے باہر ہی بیٹھے بیٹھے سب کے
لئے دعائے مغفرت کردی۔ اور دیر تک تصور یہ بندھا رہا کہ اس ڈھیر میں
کیسے کیسے خاصان خدا کیسے کیسے مقبولین و مجاہدین بھی ہوں گے، دنیا میں
کس طرح بسر کی ہوگی، یوں رہے ہوں گے دوں رہے ہوں گے اور آج

پیمبروں کے وعدوں کی تصدیق کان سے نہیں۔ آنکھ سے کر رہے ہونگے!
دم دم کے ہوائی اڈے کو جاتے ہوئے شہر سے میلوں باہر جانا ہوتا ہے
اور راستہ میں مضافات شہر یا دیہات کا بھی کچھ حصہ پڑتا ہے یہ علاقہ
بھی شہر کی جگمگاہٹ کے مقابلہ قابل دید ہوتا ہے۔ راستہ میں وہ ریل
بھی پڑی جو پہلے کلکتہ کو مشرقی بنگال سے ملائے ہوئے تھی اور آج بھی
پاکستان کو جاتی ہے! ڈھاکہ، کشور گنج، نرائن گنج کے مسافر اسی لائن سے
آجارہے تھے۔ لائن کے مشاہدہ نے خیال کو کہاں سے پہنچا دیا۔ کل تک ڈھاکہ
اور کلکتہ ایک تھے، بھائی بھائی تھے، ملے ہوئے تھے، جُڑے ہوئے تھے
آج کتنے ایک دوسرے سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔! دوئی اور تفریق اپنی انتہا کو
پہنچی ہوئی، جغرافیہ اب بھی وہی طبعی حدود کے نقشہ میں اب بھی کوئی فرق
نہیں، لیکن سرحد پار کرنا اب کس درجہ دشوار ہوگیا ہے اور قدرتی
میل ملاپ میں یہ مخاصمانہ جدائی تمامتر انسان کے اپنے ہاتھ کی پیدا کی
ہوئی۔! مسلمانوں کو اپنا حق حکومت خود اختیاری ملنا بالکل واجبی، لیکن
اس کے معنی اس شدید تفریق کے کہاں سے لازم آگئے تھے؟ پاکستان کے
حدود کچھ ہی دور بعد شروع ہو جاتے ہیں۔ چند قدم اٹھاکر اپنے ان بھائیوں
سے جاکر ملنے ان کے دیکھ آنے کی صورت اب ممکن ہے۔ تاوقتیکہ فلاں فلاں
فارموں کی خانہ پری نہ کی جائے، فلاں فلاں محکمہ سے درخواست کی منظوری

نہ عطا ہوں۔ فلاں فلاں دفتر کے چکر نہ کاٹے جائیں، اور کتنا وقت کتنا روپیہ اس "پیروی" میں نہ برباد کرلیا جائے۔

(۶)

نامہ لکھا لکھے گئے دفتر
شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

حکایت سفر ختم ہونے کو آئی ہے اور کلکتہ میوزیم کا ذکر اب تک نہ آیا خیال کئی بار آیا، ہر دفعہ قلم پر آتے آتے رہ گیا، کلکتہ خود ایک دارالعجائب ہے، یہاں آکر اس کے میوزیم (عجائب خانہ) کو نہ دیکھنا اپنے کو معلومات واقفیت عامہ کے ایک بڑے خزانہ کی دید سے محروم رکھنا ہے، میوزیم ہندوستان کے اور بھی بڑے بڑے شہروں میں ہیں، کلکتہ میوزیم سے انھیں وہی نسبت ہے۔ جو خود ان شہروں کو کلکتہ سے ہے۔ یہاں کا میوزیم متعدد منزلوں اور بیسوں درجوں پر شامل خدا معلوم کتنے وسیع رقبہ کے طول وعرض میں ہے۔ پہلی بار تو اس کا اندازہ ہونا مشکل ہے۔ ایک مہربان میزبان جب اپنے ہمراہ دکھانے لائے تو پہلی بار دیکھ کر جیسے آنکھیں کھل گئیں، یہ اندازہ ہوتا تو شاید پورا ایک دن اس کے لئے رکھ لیا جاتا، اتنے سکشن تھے، اور ان میں گھومنے کے لئے اتنا فاصلہ طے کرنا تھا کہ سب سکشنوں کا سرسری گشت بھی دو گھنٹہ میں ناممکن تھا، مجبوراً کئی کئی سکشنوں کو چھوڑنا پڑا اور جنھیں دیکھا بھی انھیں

کیا دیکھا! بس دیکھنے کے نام کی ایک ہوس پوری کرلی ـــــ یہاں تھا وہی جو ہر میوزیم میں ہوا کرتا ہے، البتہ کمیت میں اس کہیں زائد اور بہ اعتبار کیفیت بھی کہیں نادر و اعلا، عجیب و غریب جانوروں کے ڈھانچے دیکھ کر قدرت خدا یاد آتی تھی اور آیۂ کریمہ وما یعلم جنود ربک الا ہو کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ ایک مصری ممی لیٹی ہوئی رکھی تھی اس کا نظارہ خاص طور سے موثر تھا۔ مصر والے اپنے معززین و اکابر کے لاشے ان کے پیٹ کے اندر کی آلائش صاف کر کے طرح طرح کے مسالے لگا کر اس طرح محفوظ کر دیتے تھے کہ سیکڑوں کیا ہزاروں برس گزر جانے پر بھی وہ جوں کی توں موجود ہیں، تابوت کے اوپر تصویر اصل زندگی کے زمانہ کی موجود رہتی ہے۔ کہاں زندگی کے زمانہ کی تازگی و شادابی اور کہاں مرض الموت کے بعد کی لاغری و پژمردگی! دونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں معلوم ہوتی اور حالانکہ یہ مشاہدہ روزمرہ کا ہے۔ اپنے گزرے ہوئے عزیزوں، دوستوں، شناساؤں سب ہی سے متعلق پھر بھی اس کا مشاہدہ تین چار ہزار سال قبل کی میت پر کر کے دل پر اثر ہی کچھ اور ہوتا ہے! اسی میوزیم میں ایک ممی (ممکن ہے کہ یہی ہو) ۱۹۱۳ء میں بھی دیکھی تھی، اس وقت اس کی حیثیت محض ایک تماشہ کی تھی، اب کی یہ نظارہ ایک منظر عبرت تھا ـــــ انسان اپنی بقا کا کس درجہ حریص ہے! اور کیسی کیسی تدبیریں اس کے لئے سوچتا رہتا ہے۔ روح کا تعلق جب

جسم سے باقی رہنا ناممکن ہوجائے تو خود جسم ہی باقی رہ جائے اس کا ڈھانچہ ہی سلامت رہ جائے طرح طرح کے مسالہ دے کر!

بمبئی کی طرح کلکتہ بھی ہوٹلوں کا شہر ہے۔ قدم قدم پر موٹل اور ریسٹوراں، دلی خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ اس بڑے کاروبار میں مسلمانوں کا خاصا بڑا حصہ ہے اور پھر اس عموم میں خصوص یہ کہ اس میں اپنے وطن والوں کو امتیاز خاص حاصل ہے۔ رزاق مطلق کی کیا شان رزاقی ہے کہ کلکتہ جیسے عظیم الشان شہر میں رزق رسانی اور حضرت میکائیل کی میکائیلیت کی نیابت کے فرائض ایک بڑی حد تک سپرد کئے بھی تو دریاباد جیسے حقیر وصغیر قصبہ والوں کے! رزق رسانی صرف مسلمانوں ہی کی نہیں عامہ خلائق کی۔ ان مسلم ہوٹلوں میں یہ نظارہ دل کو بہت سرور بخشنے والا تھا کہ مسلمانوں کی بغل میں انھیں میزوں پر غیر مسلم بھی بیٹھے ہوئے ہیں اور بے تکلف قورمہ کباب، وغیرہ تناول فرمارہے ہیں، اور ان کے اطمینان کیلئے نمایاں تختیاں NO BEEF HERE (یہاں بڑا گوشت نہیں ہوتا) کی لگی ہوئی ہیں۔ کھانے پینے کی چھوٹی چھوٹی دکانوں کا تو ذکر ہی نہیں جو دریاباد والوں کی ہیں اور کلکتہ بھر میں پھیلی ہوئی ہیں صرف اچھے بڑے اور اوسط درجے کے ہوٹلوں کو نظر میں رکھئے تو ان کی تعداد بھی ایک پر ختم نہیں ہوجاتی۔ سب سے پہلے تو

زکریا اسٹریٹ کا عین مسجد ناخدا کے سامنے امینیہ ہوٹل ہے، جسے یہاں کے مسلم ہوٹلوں کا سرتاج کہنا چاہیئے اور جب اس کے مالک محمد امین کے بڑے بھائی حاجی عبدالقیوم نے امینیہ ریسٹوران نیو مارکٹ میں کھول دیا ہے تو وہ کچھ اس سے بھی بازی لیے جا رہا ہے۔ بڑے بھائی پھر آخر بڑے ہی بھائی ہیں۔ ایک روز شام کو دیکھا تو کھانے والوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا! یہ دونوں بھائی اپنے دعوت نامہ کے تقدم کے لحاظ سے میزبان اول تھے، پھر کولو ٹولہ کے دو ہوٹل ایک اسلامیہ دوسرا جدید اسلامیہ، ان کے مالک حاجی عبدالجبار اپنے سن کی بزرگی اور اپنی ذاتی دینداری کے لحاظ سے میزبان نمبر دوم نہیں بلکہ میزبان نمبر اول ہی کہلانے کے مستحق، وہ خود اور ان کے دونوں لڑکے احمد زماں و محمد زماں جو دینداری میں اپنے والد ماجد سے کتنے ہی پیچھے ہوں لیکن مہمان نوازی میں تو ان سے کم نہیں اور پھر ان چاروں کے بعد چترنجن ایونیو کا عالمگیر ہوٹل جو اپنے قد و قامت کے لحاظ سے پست ہو تو ہو، لیکن اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے گھٹیا نہیں ـــــ اور یہ سارے ہوٹل تو ایک ہی برادری والوں کے ہوئے، اس انصاری برادری کے علاوہ قصبہ کے خاندان سادات کا کاروبار بھی یہاں ماشاء اللہ فروغ پر ہے، ان کا ایک ہوٹل چاندنی میں صابرس SABIRS کے نام سے خاص شہرت و مرجعیت حاصل کیے ہوئے ہے اور جس کی چائے اور بریانی اور شاہی ٹکڑے، کھانے

والوں کا بیان ہے کہ ایک حیثیت امتیازی حاصل کئے ہوئے ہے، اس کے مالک حاجی حافظ سید صابر علی دہی ہیں جنھوں نے کچھ روز سے لکھنؤ ہی میں ایک اونچا ہوٹل ری پبلک ہوٹل کے نام سے اسٹیشن سے دو ہی تین فرلانگ کے فاصلہ پر لاٹوش روڈ کے ایک چوراہے پر (گورنمنٹ انڈسٹریل اسکول کے مقابل) کھول رکھا ہے۔

بمبئی کے بعد کلکتہ بھی انگریزی کتابوں کی ایک بڑی منڈی ہے۔ متعدد قدیم ولایتی کمپنیوں کی شاخیں یہاں موجود ہیں، میکملن، لانگ مینس وغیرہ اور بعض یہیں کے قدیم و جدید پبلشر خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ ٹھیکر اسپنک، نیومینس اسٹینڈرڈ لٹریچر وغیرہ اپنی پہنچ سب کہیں تو کیا ہو سکتی تھی۔ ایک میزبان صاحب کی مہربانی سے البتہ نیومینس (NEWMANS) کے ہاں ہو گئی کتابوں کا ایک جنگل لگا ہوا، گو زیادہ تر کتابیں اپنے مذاق کی نہ تھیں، پھر بھی گھوم پھر کر دو ایک کتابوں پر نظر کی اور قیمت کے دریافت کرنے کی نوبت آئی۔ گھر واپس پہونچا تو کچھ دیر کے بعد دیکھنے میں کیا آتا ہے کہ انتخاب کی ہوئی تینوں کتابیں اپنی میز پر لگی ہوئی! بغیر مجھ سے کچھ دریافت کئے ہوئے وہاں سے خرید کر آ گئی تھیں! ـــــ ایسے مزاج شناس، خدمتگزار قسم کے میزبان ہر مہمان کو نصیب کہاں ہوتے ہیں۔ میزبانی کو اگر ایک فن قرار دیا جائے تو

اس فن کی ٹرینگ (تحصیل وتکمیل) کے لئے ایک بہترین مدرسہ شاید یہی ہوٹل والے چلا سکتے ہیں۔

داستان سفر ختم اور اتنے لوگوں کے ہجوم میں ایک صاحب کا ذکر ہی اب تک نہ آیا، جو کوچ و مقام میں ہر وقت کے ساتھی، گویا دوسرے ہمزاد بنے ہوئے تھے، اسٹیشن پر استقبال کے وقت جو سب سے آگے ہو کر ملے تو ساتھ اس وقت بھی نہ چھوڑا جب دوبارہ اسٹیشن پر رخصت کرنے والے وہیں کے وہیں رہ گئے .... اور ڈیڑھ دو سو میل اور مچھا اسٹیشن تک ساتھ ہی ساتھ چلے آئے! یہ اپنے قصبہ ہی کے نہیں عین اپنے پڑوس کے محمد صدیق انصاری تھے ـــــ اس سے زیادہ کچھ ان کے لئے لکھنا شاید ان کے اجر میں کچھ کمی کرا دینا اور انھیں ذرا سا محجوب کرنا ہے۔

۲۴ر جون کو قبل دوپہر ہوڑہ کا پلیٹ فارم چھوٹا اور سہ پہر کو مچھا پر صدق کے ایک علمی ہمدرد عبدالرحمن انصاری نے ہاتھوں ہاتھ اتارا اور چند گھنٹوں کی مسلسل مہمان نوازیوں کے بعد شب کی ٹرین سے رخصت کر دیا۔ راستہ میں دن چڑھے پر اس طرح مغلسرائے اور پھر بنارس پڑے بنارس سے دوسری گاڑی بدلنا تھی، ڈھائی گھنٹے انتظار کرنا پڑا، شہر کے اس حصہ کی صاف شفاف سڑکیں اسٹیشن سے دکھائی دے رہی تھیں

دل میں خیال آتا رہا کہ یہیں ایک پرانے ہندو رشیوں کی زندہ یادگار ڈاکٹر بھگوان داس رہتے تھے، اب شہر سے باہر کسی دیہات چلے گئے ہیں، کلکتہ کے پہلے سفر (۱۹۱۳ء والے) میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس وقت بھی خاصے سن رسیدہ تھے، اور اب تو نوے سال سے کیا کم ہوں گے۔ مغربی فلسفہ کے ساتھ ساتھ قدیم یوگ کی خوب ریاضتیں کئے ہوئے اور اپنے علم وعمل دونوں کے لحاظ سے ایک زندہ رشی، حضرات صوفیہ کے کلام کے عاشق، رسول کریم اور قرآن عظیم دونوں کی اپنے دل میں قدر منزلت رکھنے والے، اور بہت بڑی داڑھی کے لحاظ سے توصورۃً بالکل مسلمان، انھیں نے میرے نام کے خط میں کبھی اپنے کو "عبدالقادر" لکھاہے، جو لفظی ترجمہ ہے "بھگوان داس" کا اور مجھے مسلم "پنڈت" قرار دیا ہے ـــــ کاش ملک میں ایسے "ہندو" لاکھوں اگر نہیں تو ہزاروں کی تعداد میں تو ہوتے (مدراس کے گورنر ہز ایکسیلنسی سری پرکاشس انھیں کے فرزند ہیں)

وطن کے متصل اجودھیا اور فیض آباد اسٹیشنوں پر بندروں کی دست درازیاں مسافروں کے ساتھ ایک بار پھر دیکھنے میں آئیں اور اکبر کا وہ نہ بھولنے والا شعر پھر ذہن کے سامنے آگیا ؎

یا الٰہی یہ کیسے بندر ہیں
ارتقا پر بھی آدمی نہ ہوئے

(صدق جدید ستمبر ۱۹۵۵ء)

لاہور

سفر لاہور

انٹرنیشنل اسلامی کالوکیم (مذاکرہ) کا خدا بھلا کرے کہ اس کی بدولت پاکستان کے ایک بڑے اور مشہور شہر لاہور کی زیارت، بغیر کسی سابق ارادہ و توقع کے زندگی میں ایک بار پھر نصیب ہوگئی ــــــ پاکستان کی زیارت کا شوق اور ارمان کس ہندی مسلمان کے دل میں نہیں؟ مصر، افغانستان، عراق انڈونیشیا، دنیا کا کون سا ملک ہندی مسلمان کی برادری کے حلقہ سے باہر ہے چہ جائیکہ پاکستان، جو اپنے ہی جگر کا ایک ٹکڑا اور ابھی کل تک اپنے ہی ملک کا ایک حصہ تھا اور جس سے دینی رشتے کے علاوہ تہذیبی اور تمدنی واسطے بھی ہمسائیگی، دوستی اور قرابت داری کے خدا معلوم کتنے قائم ہیں! لیکن سارے شوق و اشتیاق کے باوجود دوسری طرف خدا غارت کرے اس بیسویں صدی کی سیاسیات کو کہ اس نے دو ہمسایوں کے درمیان دوری اور بیگانگی کے پہاڑ کے پہاڑ بھی کیسے اُٹھا کھڑے کیے ہیں! اور لکھنؤ سے لاہور تک کے سفر کو جو کل تک ایک معمولی اور سہل سی بات تھی، ایک مستقل ہفتوں کے سر کرنے کے مرادف بنا دیا ہے! سیاسی قانونی جغرافی وفاداری ظاہر ہے کہ ہر ملک والے کی اپنے ہی ملک کے ساتھ ہوتی ہے اور ہندی مسلمانوں کے لیے جب تک کہ وہ یہاں کی سکونت اختیار کیے ہوئے ہے۔ اپنے ہی ملک کے ہر قاعدے قانون کی پابندی لازمی ہے خواہ وہ طبیعت کو کیسا ہی کھلے پاسپورٹ اور ویزا کا

تمام ضمنی سختیوں اور پابندیوں کے ساتھ دوڑ دھوپ جدوجہد کرکے حاصل کرنا حضوصًا مجھ جیسے عافیت پسند گوشہ نشین کے لیے ہرگز نہ آسان ہے نہ خوشگوار لیکن خرجوں توں کرکے وہ بھی زیادہ تر ذاتی اثرات کے باعث یہ مرحلے بھی طے ہوگئے اور دریاباد سے لکھنؤ آکر یہاں سے روانگی ۲۸ دسمبر کے تین بجے سہ پہر کو لاہور کے لیے پنجاب امرتسر میل (سابق پنجاب میل) سے ہوئی۔

اپریل ۵۵ء کے سفر لاہور و کراچی میں قافلہ چار آدمیوں کا تھا اس وقت جانا ملک غلام محمد، دریادل گورنر جنرل پاکستان کی دعوت پر ہوا تھا اور مصارف کی طرف سے اطمینان تھا۔ ابکی دعوت گورنر جنرل یا گورنر کی طرف سے نہیں محض پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے تھی۔ اور صرف ڈیلی گیٹ (مندوب) کی ذات کے لیے تھی اس کے اسٹاف یا خاندان کے لیے نہ تھی اس لیے ابکی ساتھ صرف اپنے بھتیجے اور داماد محمد ہاشم قدوائی (لیکچرر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کو بہ طور سکریٹری کے لیا۔ یہ ناگزیر تھا۔ بغیر سکریٹری کے سفر کرنا اپنے کو سخت صعوبتوں میں ڈالنا تھا۔ اسٹیشن ایک مختصر سی جماعت عزیزوں، مخلصوں کے ساتھ آئی اور گاڑی اپنے وقت پر روانہ ہوگئی ـــــ چند روز بیشتر تک خوشی اس کی تھی کہ ساتھ مولانا ابوالحسن علی ندوی کا رہے گا۔ اور لاہور پہنچ کر ملنا ملانا نومسلم

یورپین فاضل محمد اسد سے رہے گا، مگر اب یہ دریافت ہوکر بڑی مایوسی ہوچکی تھی کہ ندوی سلمہٗ کسی مرکزی تبلیغی اجتماع کے باعث (جو عین اسی زمانہ میں منعقد ہو رہا تھا) اس کانفرنس میں شرکت سے معذور رہیں گے۔ اور امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی بھی کسی معذوری کے باعث نہ جاسکیں گے اور فاضل اسد کو کسی اندرونی اختلاف کی بنا پر (اور یہ "اندرونی اختلاف" ہمارے کسی دینی علمی، سیاسی، ادارہ کے لیے نئی بات کونسی ہے؟) مذاکرہ کی ڈائرکٹری ہی کے عہدہ سے الگ ہوجانا پڑا ہے، دل جو پہلے ہی سے سرد یہ خیال کرکے ہوچکا تھا کہ ملاقات نہ ڈاکٹر حمید اللہ حیدرآبادی ثم فرنساوی سے ہوسکے گی، نہ افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مدراسی سے اور نہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی (پرنسپل مدرسہ کلکتہ) سے اب یہ خبریں سن کر کچھ اور زیادہ ہی سرد ہوگیا پھر بھی جتنوں کے ملنے کی توقع لاہور میں تھی ان کی کشش بھی سفر کی بڑی محرک ہوئی یا تھوڑا بہت خیال یہ بھی تھا کہ ملک ملک کے فاضلوں کی تقریروں اور مقالوں سے کچھ علمی استفادہ بھی ہوجائے گا۔

امرتسر تک کا سفر کوئی ۸ بجے صبح ختم ہوا اور اس درمیان میں کوئی خاص بات پیش نہ آئی، بجز اس کے، کہ لکھنؤ اور کاکوری اور ملیح آباد اور سندیلہ

اور ہردوئی اور شاہجہاں پور اور بریلی، رامپور اور مرادآباد اور سہارنپور اور انبالہ اور جالندھر اور امرتسر چھوٹے بڑے کتنے اسٹیشنوں سے گاڑی کے گزرتے ہوئے وہاں کی پرانی اور اکثر خوشگوار یادوں کا نقشہ ذہن کے سامنے غیر شعوری اور بے ارادی طور پر ابھرتا اور دل پر حسرتوں کے چرکے لگاتا رہا! —— رامپور محمد علیؒ کا وطن تھا اور مسلم اقتدار کا نشان مدتوں رہ چکا ہے۔ یوسف علی خاں ناظم جیسے سخن سنج و ادب نواز، اور کلب علی خاں جیسے دیندار رئیس کہنا چاہیے کہ یہیں کے تخت پر جلوس افروز رہ چکے ہیں اور امیر و داغ کا مسکن یہی سرزمین رہی ہے اس سے دل کو وابستگی کیوں کر نہ ہوتی اور اسی طرح انبالہ سے لے کر امرتسر تک اور اس کے سارے گرد و نواح کی حسرتناک یادوں کو دل کی گہرائیوں سے کیونکر نکال پھینکا جاتا! —— درد حسرت کی یادوں کا مزہ، لطف و مسرت کی یادوں کے مزہ سے کیا کچھ کم ہوتا ہے؟

۲۹ کی صبح کو امرتسر کی واقعیت کا تجربہ ان خیالی اور تصوری تجربوں سے کتنا مختلف پیش آیا! یہ دن کی بیداری تھی، خوابوں والی رات نہ تھی! —— یہ کسٹم کی چوکی تھی اور کسٹم کی تلاشی گویا ناسوت میں عالم برزخ کے احتساب نکیرین کا ہلکا نمونہ! عوام تھرڈ کلاس والوں بیچاروں کی تو خبر کچھ پوچھئے ہی نہیں۔ عورتیں، بوڑھیاں، بچیاں، برقعوں میں لپٹی لپٹائی

جو ہندوستان کے خدا معلوم کن کن گوشوں سے چلی آرہی تھیں۔ اپنا سارا بوریا بدھنا، کھوے بیٹھی کھڑی ہیں۔ لوٹوں، کٹوروں، پتیلیوں، برتنوں کے بھرے بورے کھول کھول کر ایک ایک چیز دکھائی جارہی ہے۔ کسے کسائے بستر، گٹھریاں، پٹاریاں کھل کر کپڑوں کے ایک ایک تار کی جانچ ہورہی ہے! اور کشمکش افراتفری کا عالم بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے! فرسٹ کلاس والے خواص جو اپنی اپنی برتھ زرد کرائے اپنے زعم و پندار میں بڑے آرام و آسایش سے چلے آرہے تھے ساری سٹی بھولے ہوئے اپنے اوپر نفرین کررہے اور اپنے نصیب پر لعنت بھیج رہے ہیں ٹارچ کھول کر دکھلیئے اور ٹفن باسکٹ کا کوئی خانہ بے دکھائی کے جانے نہ پائے میدان حشر کا سا منظر، یہ اسے ڈھکیل رہا ہے وہ اس پر پلا پڑ رہا ہے بچے چیخ رہے ہیں، چلا رہے ہیں۔ بڑے بوڑھے قلیوں کے ہمراہ غل مچا مچا کر آسمان سر پر اٹھائے ہوئے ہیں ——— اعلا و ادنیٰ عوام و خواص، عامی و عالم، راجہ پرجا کے سارے امتیازات اس وقت رخصت۔ سب نفسی نفسی کے عالم میں گرفتار، اقبال کا مشہور شعر، گو ایک بالکل دوسرے سیاق میں حرف حرف مصور و مجسم ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز!

یا یوں سہی ۔
ترے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!

ذرا ان ڈپٹی صاحب کو دیکھیے، کس شوق اور چاؤ، نفاست اور سلیقہ مندی کے ساتھ سوٹ کیس کے اندر اپنے کپڑے مرتب کرکے لیے جارہے تھے کہ کہیں شکن تک نہ پڑنے پائے ۔ ایک ایک چٹ یوں اُدھیڑ پلچ کردیکھی جارہی ہے کہ جیسے پولس مال مسروقہ کا کھوج لگا رہی ہے! اور ان پروفیسر صاحب کو ملاحظہ کیجیے ۔ شدید سردی کے موسم میں جسٹر اور کوٹ اور قمیض اور واسکٹ اور بنیا ئن ایک ایک لتے کی جامہ تلاشی لیجارہی ہے!
——— قصور شخصی طور پر کسٹم اسٹاف کے کسی رکن کا نہیں کام ہی ایسا گندہ ہے نظام کار ہی کچھ اسی طرح کا رکھدیا گیاہے کہ ہر شریف کو شروع سے مجرم ہی فرض کرلیا جائے ——— آخر دنیا میں اور بھی تو سارے ملک ہیں جن کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں، کسٹم وہاں بھی ہوتاہے کہیں بھی انسانیت اتنی پست سطح پر اتری ہوئی دکھائی دیتی ہے! یورپ کے مسافروں کا تو بیان ہے کہ فرانس سے جرمنی میں داخل ہوتے تو گویا پتا بھی نہیں چلنے پاتا۔ گاڑی سے خود اترنا پڑتا ہے، نہ سامان کا اُتارنا وہیں ڈبے میں بیٹھے بیٹھے سامان کی جانچ (چکنگ) ہوجاتی ہے۔ منٹوں بلکہ کبھی کبھی سکنڈوں کے

اندرا یہ بدبختی آخر ہم ہی دونوں ہمایوں پرکیوں مسلط ہے کہ جب ایک بار
ادھر سے ادھر کا سفر کا تجربہ کر لیجیے تو مدتوں کے لیے ہمت جواب دے
جائے اور دہشت دل میں ایسی سما جائے کہ سفر کی حسرت وارمان میں
برسوں گزر جائیں اور دوبارہ تجربہ کرنے کا حوصلہ کسی طرح نہ ہو! ــــــ
ــــــ نجات کی شرط اگر محض مجاہدہ ہی ہے خواہ وہ کسی نیت سے
اور کسی نوعیت کا ہو۔ تو بشارت ہو پاکستان و ہندوستان کی سرحد
کے ہر پار کرنے والے کو کہ وہ بے شک و شبہ جنتی اور نجات یاب ہے!
ــــــ کاش دونوں مملکتوں کے بڑے عہدہ دار ریل ہی سے سفر ایک
دوسرے ملک کا اور عام مسافروں کی حیثیت سے کریں۔ جب شاید انھیں
صحیح اندازہ مسافروں کی مصیبت کا ہو سکے۔

پاسپورٹ حاصل کرنے میں ایک بڑی بیخ نوٹو کی لگی ہوئی ہے
اور تصویر کھنچوانے میں علاوہ شرعی کراہت کے طبعًا بھی کراہت محسوس
ہوتی ہے اور اس کے لیے بڑی مشکل سے اور بڑی حیص وبیص کے بعد ہی
اپنے کو آمادہ کر پاتا ہوں۔ اور پاسپورٹ کے حصول کے بعد دوسری
سنگلاخ منزل اسی کسٹم کی ہوتی ہے ــــــ خیر وہ دقت بھی دنیا کی ہر
مصیبت کی طرح آخر گزر ہی گیا۔ سامان کی "چکنگ" ہو چکی، پاسپورٹ بھی چند

منٹ کے اندر پاس ہوگیا، درجے کے اندر بچے کھچے اسباب کے ساتھ ازسرنو قدم رکھا اور اطمینان کا سانس لیا، کہ ایک بڑے عذاب سے چھٹی پائی۔ لیکن نہیں۔ ابھی چھٹی کہاں ملی۔

سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ابھی ایک منزل لاہور کی چکنگ کی بھی تو ہے۔ وہاں پھر سامنا اسی عذاب کا کرنا ہے۔

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور!

دیکھیے وہاں کیا کیا پیش آئے!۔۔۔۔ گاڑی چلی اور جہاں سے مسجد یں دکھائی پڑیں۔ دل نے کہا اب ہم پاکستان کے حدود میں داخل ہو گئے۔ اور اپنا وطن پیچھے چھوٹ گیا۔۔۔۔ دونوں طرف کے سرحدی اسٹیشنوں پر فوجی پولیس کے مسلح نوجوان بندوقیں لیے ان پر سنگینیں چڑھائے مسافروں کے دلوں پر رعب بٹھانے کے لیے کافی ہی نہیں۔ کافی سے زائد تھے۔ اور اس نہ بھولنے والی تلخ حقیقت کو خواہ مخواہ یاد دلا رہے تھے۔ کہ اب سرحد یں اگر دشمن ملک کی نہیں تو نیم دشمن ملک کی تو ضرور ہی شروع ہو رہی ہیں! تقسیم ملک جس طرح اور جن حالات میں ہوئی وہ عمر بھر خون کے آنسو رلانے کے لیے کافی ہے۔ ہر تازہ سفر اس زخم کو ازسرنو تازہ کر دیتا ہے اور اس دردناک حقیقت کو نئے سرے سے جلا دیتا ہے۔

گاڑی حدودِ پاکستان میں داخل ہو کر خدا معلوم کیوں اب بہت سست چلی۔ لیکن آخر منزل مقصود کو پہنچ ہی گئی۔ واگہہ گزرا، ہربنس پورہ نکلا مغلپورہ گیا، لاہور چھاؤنی آیا اور لیجئے لاہور جنکشن آ گیا۔ نظر اضطراراً پلیٹ فارم کی طرف اٹھی۔ میزبان یعنی یونیورسٹی کی طرف سے تو یقیناً کوئی آیا ہوگا۔ اور ملنے والوں میں سے بھی دو چار تو ضرور ہی موجود ہوں گے —— لیکن یہ کیا! یہاں تو بجز قلیوں کی پلٹن کے بالکل سناٹا! اور ایک میرے ہی لیے کیا معنی کسی کے لیے بھی کوئی دوست عزیز پلیٹ فارم پر موجود نہیں! اسٹیشنوں کے دستور کے بالکل برخلاف! اور پھر وقت بھی رات کا کوئی ناوقت نہیں! جاڑوں کی عین دوپہر! یا الٰہی شہر کی اجنبیت کا کیا علاج ہوگا اور مہمان گاہ تک پہنچائی کی کیا صورت ہوگی! —— لیکن خود یہ پلیٹ فارم بھی تو بہت تنگ سا ہے۔ ایک لمبی چٹ سی لبس چلی گئی ہے۔ طول مع عرض نہیں۔ بلکہ طول بلا عرض! اور عرض کے سارے رقبہ پر جنگلے اور کٹہرے کی عملداری! اور ادھر ادھر مسلح پولیس کا پہرا! ایک عجیب منظر اور توقع اور انداز سے بالکل نیا ہی نقشہ! —— آج عبارت کے لکھنے میں دیر لگ رہی ہے اور قدرۃً اس کے پڑھنے میں بھی اس دقت۔ اتنا وقت۔ کہاں تھا سارا سوچ بچار ایک آدھ سکنڈ میں ختم۔ سامنے نظر اردو کے مشہور انشا پرداز خواجہ محمد شفیع دہلوی ثم پاکستانی اور ان کے ایک رفیق پر پڑی اور ذرا جان

میں جان آئی ـــــ وہ لمحہ اور، اور سارا معمہ حل ہوگیا ـــــ یہ ساری برکت اسی ناسٹ دنی "کسٹم" کی ہے جس سے ابھی ابھی سابقہ امرتسر اسٹیشن پر پڑچکا! اب یہ پلیٹ فارم عام مسافروں کی راحت و آسایش کے لیے نہیں بلکہ کسٹم والوں کا تھانہ ہے، جو اپنے دبدبہ اور جبروت اپنی دہشت انگیزی اور رعب افگنی میں پولیس کے تھانے سے ٹکر لیتا ہے! ـــــ مردہ بدست زندہ۔ اب نجات کی صورت ہی کیا! یونیورسٹی نے اچھی میزبانی اور اپنے مہمان کی اچھی راحت آسانی کی! کاش کوئی صورت الٹے پاؤں واپس چلے جانے کی ہوتی! امرتسر کی ساری زحمتیں ایک ایک کرکے نظر کے سامنے پھر گئیں! ـــــ کیا یہی برتاؤ برطانیہ اور کناڈا، سیلون اور تھائی لینڈ افغانستان اور فرانس سے آنے والوں کے ساتھ بھی ہوا ہوگا؟ انھیں بھی اسی ہفتخواں سے گزرنا پڑا ہوگا! ـــــ جی نہیں یہ لطف خاص تو شامت زدہ ہندوستانیوں ہی کے لیے مقسوم ہے۔ جیسا کہ ادھر سے جانے والے پاکستانی مسافروں کے لئے بھی مقدر ہوچکا ہے! آہ، وہ بدبخت تقسیم ملک!

اردو کا انشاء پرداز پلیٹ فارم پر ادب وانشا کے جوہر دکھانے کے لیے نہ تھا۔ اپنے کمال اخلاص سے اور اجنبی مسافر کی مصیبتوں کا اندازہ

کر کے خالص مسافر نوازی کے جذبہ سے متاثر، اس کی دستگیری کے لیے اسٹیشن آموجود ہوا تھا۔ اور جو کام اصل میزبان یونیورسٹی کے کرنے کا تھا اسے خواہ مخواہ اپنے ذمہ لے لیا۔ اس کے اثرات یہاں محکمہ کسٹم کے کارکنوں پر تھے۔ اس کا وجود اس وقت فرشتۂ رحمت ثابت ہوا اور گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہو گیا۔ چند ہی منٹ کے اندر ہم لوگ جنگلے سے باہر نکل آئے اور اب معلوم ہوا کہ قید میں نہیں آزاد دنیا میں ہیں! —— اب یونیورسٹی کے نمائندے بھی لے جو مجھے لینے کے لیے اسٹیشن آئے تھے۔ اور اپنے دو ایک عزیز مقیم لاہور بھی دکھائی دیے —— موٹر موجود تھی اور چند منٹ بعد ہم لوگ ہوٹل میں اپنے کمرہ کے دروازہ پر موجود تھے۔ یہ لاہور کا مشہور "نیڈوز" ہوٹل تھا۔ نام بارہا کان میں پڑ چکا تھا کیا خبر تھی کہ کچھ دن کا آب و دانہ یہاں لاکر مہمان رکھے گا! پچاسوں بیرونی مہمان میں سے جو بالکل "صاحب" قسم کے لوگ تھے وہ اس سے بھی معزز تر ہوٹل "فلیٹی" میں اتارے گئے اور کچھ اونچے لوگ سرکاری سرکٹ ہاؤس میں، دوسرے درجہ کے لوگوں کے لیے مہمان خانے دو تجویز ہوئے تھے۔ ایک بھاول پور ہاؤس، دوسرا یہی نیڈوز —— "گورے" "اور کالے" یا "صاحب" "اور نیٹو" کا فرق مراتب یہاں بھی قائم! اور یہ ترتیب ہے بھی کچھ فطری ہی سی! ع

چابک سواروں یک طرف مسکین گدایاں یک طرف!

یہ ـــــ ینڈوز اب سرکاری اہتمام میں ہے اور اس میں عموماً سرکاری افسر اور عہدہ دار ہی ٹھہرائے جاتے ہیں۔ ہے بڑا لق ودق دومنزلہ طویل وعریض۔ ایک وقت میں صدہا مہمانوں کو جگہ دینے والا گو انتظام اب انگریزوں کے زمانے کا سا نہیں۔ آکر دیکھا تو اپنے علاوہ اور بھی کئی مہمان اس ہوٹل میں مقیم پائے۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ (سندھ کے سابق ڈائرکٹر تعلیمات اور عربی زبان وادب کے ماہر) ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی (سابق استاد عربی لکھنؤ یونیورسٹی اور اب اُستاد عربی کلکتہ یونیورسٹی) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی دہلوی ثم کراچوی (سابق وزیر مرکزی حکومت) اور سب سے بڑھ کر حیدرآباد دکن کے مشہور فلسفی وصوفی ڈاکٹر میر ولی الدین جن سے مدتوں کے کمال اشتیاق کے بعد پہلی بار ملاقات ہندوستان میں نہیں بلکہ پاکستان میں مقدر تھی، ان کا کمرہ اپنے ہاں سے فاصلہ پر تھا اور ان کے ہمراہ زنانہ بھی تھا۔ تاہم یہی مسرت کیا کم تھی کہ وہ تھے تو اسی ہوٹل میں کھانے کے مشترک کمرے میں اکثر ان کا ساتھ ہو جاتا۔

ہوٹل کی زندگی گھر کی زندگی سے خاصی مختلف ہوتی ہے مدت دراز ہوئی ایک بار بمبئی کے ایک اوسط درجہ کے اور شملہ کے ایک اونچے درجہ ہوٹل اور دہلی اور نینی تال کے معمولی ہوٹلوں میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تھا، اب

ایک عمر گزر جانے اور نوجوان سے بوڑھے ہونے کے بعد پھر ۱۱،۱۰ دن جم کر ہوٹل میں رہنے کا اتفاق ہوا، تو وہ پرانے اور بھولے ہوئے سبق تازہ ہو گئے۔ صبح تڑکے اور سہ پہر کی چائے کو چھوڑ کر باقی تینوں وقت کھانے کے کمرے میں جانا ہوتا تھا جو اپنے کمرے سے اچھے خاصے فاصلہ پر تھا اور یہ جانا آنا کھل جاتا تھا بے ضرورت وقت ضائع ہوتا تھا اور پھر انگریزی طریقہ جو کھانا کھانے کا ہے۔ یعنی سب کھانوں کے ایک ساتھ آجانے کے بجائے ایک ایک کھانے کا، وہ بھی وقت کے فصل سے آنا یہ اور زیادہ کھل کر رہا۔ اور جو کام ۱۵ منٹ میں ہو سکتا تھا بلا وجہ اس کے لیے ۳۵، ۴۰ منٹ ہر مرتبہ نکالنے پڑتے۔ ڈیڑھ ہفتہ کے قیام میں ان گھنٹوں کی میزان کتنی پہنچی! عمر عزیز جس کے کسی ایک لمحہ کی بھی قیمت کے لیے بادشاہ ہفت اقلیم کا خزانہ کفایت نہیں کر سکتا۔ اور جس کی شان میں عارف رومی نے یہ فرمایا ہے۔

داده عمرے کہ ہر روزے ازاں
قیمت آں کس نہ داند در جہاں

وہ یوں بھی کیا کم نذر غفلت ہوتی رہتی ہے۔ اس کا اس بے دردی سے خون ہوتے رہنا طبیعت کو بہت ہی گراں گزرتا رہا۔ انگریزی معاشرت کے بعض پہلو یقیناً اچھے بھی ہیں۔ لیکن ہماری شامت کہ اندھی تقلید میں ہم نے انگریزوں کی الٹی سیدھی ساری ہی عادتیں سیکھ ڈالیں اور انھیں میں سے یہ

اتلاف و اِضاعت وقت بھی ہے، طہارت وغیرہ کے سلسلہ میں ان کی جو بہت ہی گندی عادتیں ہم نے اختیار کرلی ہیں وہ تو سرے سے ناقابلِ ذکر ہیں! ـــــ ہوٹل کے بیرے اور (کھانا کھلانے والے) کئی ایک یوپی (میرٹھ، بریلی وغیرہ) کے نظر آئے۔ بیچارے بھگدڑ میں بے سوچے سمجھے یہاں بھاگ آئے اور نتائج و عواقب پر نظر جب اچھے اچھے پڑھے لکھوں اور عقل و شعور والوں کی نہ گئی تو ان غریبوں کی کہاں سے جاتی۔

بڑے شہروں میں سواری کا مسئلہ ایک ٹیڑھی کھیر ہوتا ہے کلوکیم والوں نے سواری کا انتظام خاطر خواہ تو نہیں البتہ درجۂ غنیمت میں رکھا تھا سوا سو مہمان کے لئے سوا سو موٹریں اور وہ بھی برابر دس دن تک مہیا کیے رہنا آسان تھا بھی نہیں، دو چار ٹیکسیوں کے علاوہ دو بسیں بھی مستقل کرایہ پر لی گئی تھیں۔ ایک بس فرسٹ کلاس مہمانوں یعنی نیلیٹی ہوٹل والوں کے لیے اور دوسری ہم سکنڈ کلاس مہمان یعنی نیڈرز ہوٹل اور بھاولپور ہاؤس والوں کے لیے یہ جلسہ کے وقت آکر مہمانوں کو لے جاتیں اور ختم پر ہوٹل اتار جاتیں یہاں تک تو ٹھیک تھا، لیکن اب اگر کسی مہمان کو اپنی کوئی ذاتی ضرورت پیش آجاتی (اور کیوں نہ پیش آتی) تو مشکل ہی پڑ جاتی اور ٹیکسی کیا معنی بس کے لیے بھی کچھ بے بسی ہی محسوس ہوکر رہتی! اسی پر

مختلف مندوبوں خصوصاً ڈھاکہ، راج شاہی، چاٹگام والوں کی یکجائی نصیب ہوجاتی اور خوب خوب باتیں سننے میں آجاتیں! ـــــ نیڈوز ہوٹل کے کمرے کچھ اس رخ پر واقع ہوئے تھے کہ کمروں میں دھوپ کا گزر ہی نہیں مرطوب ہونے کے علاوہ فجر کے بعد اور مغرب سے قبل بھی روشنی جلایئے جب جاکر لکھنے پڑھنے کا کوئی کام کر سکیے۔

مندوبوں کے کمرے بھی سب متصل نہیں دور دور تھے آپس میں ملنا ملانا یا تو ڈائننگ روم (کھانے کے کمرے) میں ناشتہ اور کھانے کے وقت ہوجاتا یا بس پر آتے جاتے اور پھر جلسہ گاہ میں چائے کی میز پر! مسلمانوں اور یوروپین (یا امریکن) کے ہاں کھانے پینے کی کیا کمی ہر تھوڑی دیر کے بعد چائے یا کافی کا وقت آجانا لازمی تھا! (حالانکہ کھانے پینے کے معاملہ میں بدنامی غریب "مولوی" ہی کے حصہ میں آئی ہے) ـــــ اور گپ شپ کا ہونا تو چائے اور ناشتہ سے بھی بڑھ کر ضروریات میں داخل!

لاہور پہنچنا ۲۹ / دسمبر کی دوپہر کو ہوا تھا، مذاکرہ کا افتتاح آج ہی سہ پہر کو تھا، لاہور کے حساب سے ۲/۱ ۳ پر یعنی لکھنؤ کے حساب سے ۴ پر مغربی پاکستان کی گھڑیاں ہندوستان کی گھڑیوں سے آدھ گھنٹہ پیچھے ہی ہیں) کھانے اور نماز دونوں سے فراغت کر اور جلدی جلدی تیار ہو ہوا

٥ سرکاری بس پر یونیورسٹی ہال پہنچے۔ اجنبی ماحول، اجنبی چہرے، جانی پہچانی صورتوں میں سب سے پہلے جناب سالک نظر آئے ـــــ فال نیک ہوئی پہنچ ہی کر اندازہ ہوا کہ صدر مملکت یا شاہ ذی جاہ کی آمد کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ سامنے لان پر فوجی بینڈ کی مسلسل موسیقی تماشائیوں کی ریل پیل فوٹو گرافروں کا ہجوم برآمدہ میں ملک ملک کے مندوبین سب دو رویہ قطار باندھ کر کھڑے ہوگئے کہ صدر محترم سے ہاتھ ملانے کا شرف حاصل کریں گے خاصہ وقت انھیں تکلفات کی نذر ہو گیا۔ خدا خدا کر کے نزول اجلال ہوا۔ ایک صاحب کو دیکھا کہ صدر مملکت کے جلو میں سب سے پیش پیش ہیں۔ اور وہی ایک ایک کو ملا رہے ہیں۔ سر پر معمولی ترکی ٹوپی، جسم پر سیاہ شیروانی اور چہرہ پر کچھ سفید کچھ سیاہ داڑھی۔ یہ کون ہو سکتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کے مشہور وائس چانسلر میاں افضل حسین یہی ہیں۔ اچھا یہ؟ ان کی "صاحبیت" کے تو اتنے چرچے سننے میں آچکے تھے۔ کہ خیال ہوتا تھا کہ یہ تو سراپا انگریز نکلیں گے خیر باطن کا حال تو سابقہ کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے ـــــ ہال کے اندر فوٹو گرافروں کی یلغار بے پناہ تھی۔ ہر منٹ پر کیمرے کی کھٹ اور فلیش لائٹ کی چمک! گویا تصویریں زیادہ سے زیادہ اور ہر زاویہ اور ہر رخ سے لی جا کر رہیں گی! فوٹو گرافی جائز بھی ہو جب بھی یہ شدت اور یہ کثرت تو شاید کراہت طبعی پیدا کر دینے کے لیے بالکل کافی ہو۔ ایڈریس چار چار ہوئے، ایک صدر کا

دوسرا گورنر صاحب مغربی پاکستان کا تیسرا وائس چانسلر کا۔ چوتھا کلوکیم کے ڈائرکٹر کا۔ کسی میں کوئی بات خاص طور پر قابل اعتراض نظر نہ آئی، سب سے زیادہ ڈر وخوف صدر صاحب کے ایڈریس سے لگا ہوا تھا۔ لیکن خیریت ہی رہی۔ "ملا" پر چوٹیں اور خوب خوب چوٹیں اس میں تھیں ضرور لیکن یہ اپنی طرف سے صفائی بھی موجود تھی کہ اس "ملا" سے مراد کٹھ ملا یا علمائے سوہیں۔ حقیقی اہل علم اور صاحب عمل علماء مراد نہیں ——— اخباری روایتوں سے اندیشہ یہ ہو رہا تھا کہ علماء کی طرف سے پرزور مخالفت کا مظاہرہ ہوگا۔ یہ کچھ نہ ہوا اور نہ اس کے ہونے کی کوئی وجہ تھی۔

ڈائس پر صدر مملکت اور گورنر صاحب زریں کرسیوں پر جلوہ افروز تھے اور آگے پیچھے دائیں بائیں خدم وحشم ڈائس کے سامنے کے رخ پر عام حاضرین تھے۔ بائیں طرف کلوکیم کے نمائندے ملک وار ترتیب کے لحاظ سے اور داہنی طرف ذرا ہٹ کر زنانہ سیکشن لاہور کی آزادیوں اور بیباکیوں کے قصے اخبارات میں پڑھ کر خیال یہ تھا کہ ادھر کا منظر اسلامی غیرت رکھنے والوں کے لیے ذرا صبر آزما ہوگا۔ لیکن الحمد للہ کہ یہ اندازہ غلط نکلا بیبیاں اور لڑکیاں ایک تو زیادہ تر برقع پوش تھیں اور جو یوں نہیں تھیں ان کی بے پردگی بے حیائی کی حد تک نہیں پہنچنے پائی تھی اور یہ رنگ صرف اسی افتتاحی دن تھا۔

بلکہ مذاکرہ کے عام جلسوں میں آخر تک قائم رہا۔ بجز ایک رات کے کہ جب جلسہ گاہ میں ڈنر ہوا تھا تو اس وقت البتہ "بیگمات" کا لباس اسلامیت کیا معنی مشرقیت کا بھی منہ چڑا رہا تھا۔ اور اسی جلسہ میں ڈنر کے بعد فلم کے پردے پر بے حجاب خاتون پاکستان کی خواہ مخواہ نمائش اپنوں اور بیگانوں سب کے سامنے کرائی گئی تھیں۔ اس نسبتہً اور بہ حیثیت مجموعی اعتدال قائم رہ جانے کا باعث شاید یہ ہو کہ انتظامی کمیٹی میں جہاں "ماڈرن" بلکہ "الٹرا ماڈرن" قسم کے متعدد ممبر تھے۔ وہیں کچھ نمایندے قدیم اسلامی اور مسلم تہذیب کے بھی تھے۔

عصر کا وقت اخیر ہو رہا تھا جب جلسہ اس اعلان کے ساتھ برخاست ہوا کہ اب باہر لان پر ایٹ ہوم کے لیے چلیے۔ کاش اعلان یہ ہوا ہوتا کہ اب نماز عصر کے لیے چلیے ——— اپنا معمول اب عرصہ سے بہت سے تلخ تجربوں کے بعد اب ایسے موقع پر نماز عصر بالکل اوّل وقت پر اور نماز ظہر کے بعد ہی پڑھ لینے کا ہے ورنہ اور سارے بڑے چھوٹے پروگرام تو خیر پورے ہو ہی جاتے ہیں۔ آئی گئی بس نماز ہی پر ہوتی ہے۔ اور وقت حنفی کا اگر زیادہ اہتمام رکھیے تو نماز ہی سرے سے خطرے میں پڑ جائے! ——— چنانچہ اس کے دوسرے دن کا ذکر ہے کہ شام کو جب گورنمنٹ ہاؤس میں صدر مملکت کا رسیپشن، (نزول اجلال) پورے شاہانہ کروفر اور شاہان مغلیہ کے درباری جاہ وجلال کے ساتھ ہوا، اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے کے لیے نظر کے سامنے یہ سماں بندھا رہا کہ

جیسے اس دورِ جمہور میں تقریب کسی صدرِ مملکت کی نہیں بلکہ عہدِ ماضی کے کسی جہاں پناہ کسی ظلِ سبحانی، کسی شہنشاہ وقت کی ہو رہی ہے۔ نمازِ مغرب کے ساتھ معاملہ کچھ اسی قسم کا پیش آ کر رہا۔

کلوکیم یا مذاکرہ کا تذکرہ ایک مستقل عنوان سے ان صفحات میں آ چکا ہے۔ یہاں سفرنامہ کے سلسلے میں اس کا ذکر محض ضمناً اور اجمالاً ہی آ سکتا ہے اور اس نمبر کے بعد تو شاید اتنا بھی نہ آئے۔

مسلم ملکوں کے مندوبین میں سب سے زیادہ جاذبیت اور مرکزیت مصر کی معروف و مقبول شخصیت عبدالوہاب عزام پاشا کے حصہ میں آئی جدھر نکل جاتے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے اور وہ بھی اپنی طرف سے شاید ان کے اور ان کے سب کے دلوں کو گویا ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ ایک ہلکی سی جھلک گویا۔

ہم رو سوے تو بود ہمہ سو دے تو بود

کی عزام ایک تو معقول و متوازن خیالات کے ہیں، مغربی علوم و فنون سے نہ تو جاہل نہ اُن کے نام سے چڑھنے والے اور پھر ایک بات یہ بھی کہ اُردو سے خوب واقف اقبال کی بعض نظموں کے مترجم بلکہ اردو بول بھی لیتے ہیں مصر، شام اور دوسرے مسلم ملکوں کے مندوب بھی، کسی کے اندیشے اور کسی

کی امید کے خلاف عموماً اچھے پختہ مسلمان ہی ظاہر ہوئے اور ان میں زیادہ نمایاں شخصیتیں یہ یاد رہ گئیں۔ شیخ الحدیث بہجت البیطار (شام) ڈاکٹر عمر بہاء الدین الامیری (شام) شیخ ابوزہرہ (مصر) شیخ مصطفیٰ زرقاء (مصر) محمد خلفت اللہ (مصر) اور ڈاکٹر عبداللہ المصری۔

غیرمسلموں میں اول نمبر پر قدرۃً مشہور و معروف پروفیسر فلپ ہٹی ہے پھر اٹلی کے پروفیسر الگزنڈر بوسینی جو اردو کے بھی عالم نکلے۔ فرانس کے معمر پروفیسر مسنیان (منصور حلاج کی کتاب الطواسین والے) ہالینڈ کے ڈاکٹر ڈریوز اور برطانیہ کی مس لیمبٹن (لندن یونیورسٹی کی اُستاد فارسی)

مقالے بیشتر اچھے ہی پڑھے گئے۔ دو چار البتہ ایسے تھے جن میں تجدد زدگی نمایاں تھی۔ اس کا توڑ یوں ہوا کہ سہ پہر کے بھرے جلسوں میں ان پر خوب جرح و قدح، لے دے ہوئی اور افسوس ہے کہ ایسے سارے مقالے پاکستانیوں ہی کے نکلے۔ غریب ٹرکی خواہ مخواہ بدنام رہا۔ باہر والے خدا معلوم کیا تاثر پاکستان کی اس "روشن خیالی" اور تجدد نوازی کا لیکر گئے ہوں گے! حیرت کے ساتھ بڑی خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ ایران کے نمایندوں میں اول تو ایک شیخو ڈاکٹر بدیع الزماں فروزاں فر ایسے تھے جو سرخیل صوفیہ حضرت مولانا رومیؒ کے خصوصی پرستاروں میں ہیں۔ اور ان پر ایک سے زیادہ کتابیں شائع کر چکے ہیں بلکہ انھیں نمایندوں میں ایک

ٹھیٹھ سنی بھی تھے یعنی شافعی المذہب شیخ الاسلام کردستان !۔ بڑا سبق اس کے اندر ہندوستان و پاکستان دونوں کے "گرفتاران ابو بکرؓ و علیؓ" کے لیے ہے!

پاکستان کے نمایندوں میں نمایاں شخصیتیں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مولانا امین احسن اصلاحی۔ مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، ڈاکٹر محمود حسین خاں۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور مولانا ظفر احمد انصاری کی ثابت ہوئیں اور اپنے محدود حلقہ کے اندر "ثقافت" والے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور "طلوع اسلام" والے پرویز صاحب کی بھی اور ہندوستان کے مختصر سے وفد کی گو سرداری اس نااہل کے سر زبردستی ٹھونس دی گئی لیکن حقیقۃً اس کے اہل ڈاکٹر میر ولی الدین حیدر آبادی تھے۔ مدعو اشخاص کی اہلیت سے متعلق گفتگو تو ہمیشہ ہی چل سکتی ہے اور چلتی رہتی ہے۔ لیکن اگر کچھ ہی زیادہ سوچ لیا جاتا تو ہندوستان کی حد تک تو بہرحال نمائندگی بہتر اور کامل تر ہو سکتی تھی۔ اور پاکستان سے بھی بعض اہم ناموں (مثلاً اسد صاحب یا ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے رہ جانے پر حیرت ہی ہے۔

عیب جوئی کی آنکھ تو ہر مجمع میں بہت کچھ دیکھ سکتی اور عیب کی زبان ہر مجلس سے متعلق بہ آسانی کھل سکتی ہے لیکن اس کلوکیم سے کوئی اور نفع ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ یہ نفع کیا کچھ تھوڑا ہوا کہ عالم اسلامی کی ایسی ایسی قابل فخر

شخصیتوں کو آپس میں ملنے جلنے اور گفت و شنود کے موقع ملے وہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر سمجھے .... بھائی چارے کے نظارے سے وہ شریف غیر مسلم بھی متاثر ہوئے جنھوں نے اسلامی اخوت کا ذکر، اب تک صرف کتابوں میں پڑھا تھا! ـــــ کاش ابکی تجربہ سے پاکستان پورا فائدہ اٹھائے! اس بار کی غلطیوں اور فروگزاشتوں سے سبق سلے اور آئندہ جب بھی اسے اس اسلامی مذاکرہ کی دعوت دینے کی سعادت نصیب ہو تو وہ اجلاس ابکی سے کہیں بڑھ کر نافع اور جامع ثابت ہو۔

لاہور میں ایک محترم و برگزیدہ شخصیت مولانا مفتی محمد حسن امرتسری ثم لاہوری کی ہے۔ ایک معمر بزرگ اور حضرت تھانویؒ کے خلیفہ اجل وارشد مسجد نیلا گنبد سے ملحق مقیم "ہمسایۂ خدا" کہنے کی جرأت تو بجز غالب کے اور کس کو ہو سکتی ہے، البتہ خانۂ خدا کے ہمسایہ تو بہر حال ۱۹۵۵ء کی طرح ابکی بھی لاہور پہنچتے ہی ان کی زیارت کے لیے "شدِ رحال" کیا اور نمائش وغیرہ جانے کے بجائے ٹیکسی کر۔ ان کے ہاں حاضری دی۔ مولانا اب پیروں سے مستقل معذور ہو گئے ہیں اور یوں بھی صحت خراب ہی رہا کرتی ہے، لیکن چہرہ کی بشاشت اور خندہ جبینی میں ذرا فرق نہیں۔ جتنی دیر بیٹھنا نصیب ہوا

بین طور پر محسوس ہوتا رہا کہ ایک اللہ والے کا قرب نصیب ہے ـــــ
مولانا باوجود اس گوشہ نشینی کے ترک علائق کے ایک عظیم الشان مسجد اور ایک رفیع الشان دینی درسگاہ مع عمارات متعلقہ تعمیر کرا رہے ہیں، ایک دن وہاں بھی جانا ہوا۔ مولانا ہی کے ایک مسترشد موٹر لے کے آئے اور لے گئے۔ بغیر آنکھوں دیکھے یقین کرنا مشکل تھا۔ کئی کئی مربع ایکڑ کا لق ودق میدان۔ مسجد اتنی بڑی اور اس شان کی کہ کوئی رئیس امیر تو کیا کوئی حکومت ہی اس کی ہمت کر سکتی ہے! اور درسگاہ ہوسٹل (اقامت گاہ) وغیرہ کی عمارتیں سب اسی شان وشوکت کی اور اسی شاہانہ پیمانہ پر! مکمل ہو جانے پر ایک چیز دیکھنے کی ہوگی۔ لاکھ دو لاکھ نہیں، ۲۰، ۲۵ لاکھ کے سرمایہ سے کم تو اندازہ کسی طرح نہیں ہوتا۔ عقل دنگ وحیران کہ اتنی بڑی رقم کا انتظام اس درویش گوشہ نشین نے آخر کر کیسے لیا! ـــــ لاہور میں ایک مولانا ہی کی صحبت ایسی ملی جو حکومت پر اور اپنے ہی بھائیوں پر نکتہ چینی سے خالی تھی، ورنہ اور جگہ تو عموماً یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہی اصل موضوع گفتگو ہے!

تقسیم ملک سے جہاں بے شمار نقصانات ہوئے آخر کچھ فائدے بھی تو ہوئے ہیں انھیں میں سے اہل لاہور کے نفع کی چیز یہ ہے کہ انھیں گھر بیٹھے ایسی دولت مل گئی۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ثم کراچوی سے نیاز اب کوئی ۱۸
۔۲۰ سال بعد حاصل ہوا، اور دیوبند اور تھانہ بھون کی صحبتیں یادیں تازہ ہوگئیں
اللہ اللہ! کیا زمانہ تھا اور کیا اس کا انقلاب ہوا! پڑوسی پردیسی بن گئے
جسم پر اثر جو کچھ بھی پڑا ہو، ماشاء اللہ ہمت اب بھی پوری طرح جوان ہے۔
کالوکیم کے جلسوں میں شرکت مستعدی و پابندی سے کرتے رہے۔ بلکہ مباحثہ میں
بھی حصہ خاصا لیتے رہے ـــــ مولانا محمد داؤد غزنوی سے بھی نیاز قدیم
کی تجدید ہوئی۔ اور تحریک خلافت کے جلسوں اور کمیٹیوں کا سماں نظر کے سامنے
پھر گیا اہل حدیث میں مولانا کی ذات پہلے بھی ممتاز تھی اور اب تو شاید چوٹی
کے لیڈر ہیں۔ صحت اب خراب ہوگئی ہے پھر بھی ہمت سے شریک ہوتے رہے
اور اس نیازمند سے گرمجوشی سے ملے ـــــ مولانا محمد یوسف بنوری کی زیارت
پہلی بار ہوئی۔ نام اور کام سے واقفیت مدت سے تھی ملاقات کی نوبت اب
آئی ـــــ ندوی برادری والوں میں مولوی قاضی نور الحق (صدر شعبۂ دینیات
اسلامیہ کالج پشاور) سے ملاقاتیں بار بار رہیں۔ اور یہ دھوکا بھی بار بار ہوتا
رہا کہ جیسے وہ پاکستان اور پشاور کے نہیں ہندوستان کے بلکہ اپنے لکھنؤ ہی کے ہیں
کالوکیم کے حلقہ سے باہر مولوی فضل قدیر صاحب ندوی سے ملاقات گویا ایک بار
ہوئی مگر ہر اعتبار سے اچھی۔ اُن کے سلجھے ہوئے دماغ، توازن و فہم سلیم اور
ان کے اخلاص قلب کا تجربہ پہلے ہی کی طرح ابکی بھی رہا چلتے پھرتے ملاقاتیں

مولانا محمد ناظم ندوی صدر دارالعلوم بھاولپور سے بھی رہیں۔ زیارت کئی سال بعد ہوئی اور یہ دیکھ کر جی خوش ہوا کہ قدیم ندویوں کی جھلک ان میں باقی ہے ایک بڑے پرانے ندوی مولانا محمد طلحہ (سابق اُستاد اورنیٹل کالج لاہور ہیں۔ ان سے بھی جلسہ گاہ کے باہر چلتے پھرتے نیاز حاصل ہوگیا۔ رہے مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی تو ان کا ساتھ کیا جلوت اور کیا خلوت کہنا چاہیے کہ شروع سے آخر تک رہا۔ اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اب ان کا قلم پھر دینی خدمات کی طرف متوجہ ہوا ہے اور آج کل شاید صحیح مسلم کے کسی نئے ترجمہ میں مصروف ہے۔ وہ صاحب دل اس لحاظ سے بھی ہیں کہ "دل" نامے ایک ناول کے مصنف ہیں اور آج کل بیچارے بیمار ہیں اور بیماری بھی اتفاق سے دل ہی کی۔ جس کے لیے صاحب مثنوی فرما گئے ہیں۔ ع

نیست بیماری چو بیماریٔ دل!

ان کا ذکر تو ایک مستقل عنوان چاہتا ہے۔ علماء کے ضمن میں تو خواہ مخواہ ہی آ گیا۔ جی میں آتا ہے ان کے لیے وہی دہرا دیجئے جو حضرت رومی نے مثنوی میں اپنے عزیز و محبوب شاگرد حسام الدین چلپی کے لیے کیا ہے۔ بس فرق فرق اتنا ہے کہ وہاں بزرگی اور خردی کی نسبت مرتبۂ فضل و کمال کے اعتبار سے تھی اور یہاں محض سن و سال کی! ـــــ علماء کا تذکرہ ناتمام رہ جائے گا اگر نام مولانا ظفر اقبال کا بھی نہ لیا جائے۔ وہ مذاکرہ کی انتظامی کمیٹی کے ممبر تھے

نظر ان پر بار بار پڑی تھی۔ لیکن کوئی بتانے والا اتفاق سے نہ ملا۔ ملاقات ان سے صرف اس وقت ہوئی جب مذاکرہ والوں کی دواعی دعوت وزیر تعلیمات پاکستان مغربی کے داس کی طرف سے ۸ر جنوری کو شب میں "فلیٹی" ہوٹل میں تھی۔ ملاقات بالکل سرسری رہی اور ان کی نورانیت سے استفادہ کی حسرت ہی رہ گئی۔ ان کے اوصاف و کمالات لکھنؤ میں مولانا علی میاں ندوی سے خاصے سننے میں آچکے تھے۔ قرآن مجید کی صحت طبع میں اہتمام ان کا ایک کارنامہ ہے کئی سال ہوئے انھوں نے انجمن حمایت اسلام کی طرف سے جو قرآن مجید بہت ہی خوشخط اور خوشنما اور بہت اچھے کاغذ پر چھپوایا تھا وہ غلطیوں سے تمام تر پاک تھا ـــــ علماء کے ذکر میں اپنے لکھنؤ ہی کے ایک مشہور شیعی عالم بلکہ مجتہد مولوی سید علی نقی صاحب (اُستاد لکھنؤ یونیورسٹی) کا نام رہا ہی جاتا ہے مذاکرہ کے دو ایک اجلاسوں میں یہ بھی شریک ہوئے اور مجھ سے قریب ہی بیٹھے رہے۔ گورنر کی طرف سے صوبہ حکومت کے لیے جو سرکاری تقریب منعقد ہوئی (اور جس میں ایک مذہبی اور اسلامی جمہوریت سے کہیں بڑھ کر شان ایک سیکولر یا نامذہبی مملکت کی تھی) وہاں بھی دیر تک نشست انھیں کے ساتھ رہی علماء شیعہ میں سب سے قریب تر اہل سنت سے شاید یہی ہیں۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کسی اور ذیل یا ضمن میں نہیں آتے بجائے

خود ایک انجمن یا ادارہ ہیں۔ ان کے بعض مسائل سے چونکہ اختلاف ہے اس لیے
ان کی جماعت کے رسالہ دار در، (یا ان کی فوج کے رسالہ داروں) نے مبالغہ
و غلو سے کام لے کر مدیر صدق کو ان کا شدید مخالف بلکہ معاند قرار دے دیا۔ ان
کے دفتر جماعت اسلامی پر جا کر حاضری دی۔ اس وقت کہیں اور اپنے جلسے میں
مصروف تھے۔ ملاقات کالوکیم کے اندر ہوئی۔ اور پھر اندر اور باہر کئی کئی ملاقاتیں
رہیں۔ ایک ناشتہ کے دسترخوان پر بھی دیر تک ساتھ رہا۔ ایک زمانہ میں ان
سے تعلقات اچھے خاصے تھے۔ یہ صورت ان کی الجمعیۃ (ہفتہ وار) کی ایڈیٹری
سے لے کر ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن کے دارالاسلام پٹھان کوٹ میں
منتقل ہونے تک باقی رہی۔ پھر جب سے وہ ایک پارٹی کے لیڈر یا امیر بن گئے
ہم دونوں کے راستے بڑی حد تک الگ ہو گئے لیکن بحیثیت متکلم و اہل قلم دل میں
اب بھی ان کی بڑی وقعت ہے۔ ان کے بعض اجتہادات کا ساتھ ان کے
قدیم سے قدیم رفیق و مخلص ہی نہیں دے پائے اور ان سے الگ ہو جانے
پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں تو یہ چیز تو الگ ہے۔ باقی ان کا قلم اب بھی دین کی گراں بہا
خدمات انجام دے رہا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ سے خالی ہوگا کہ تعلیم یافتہ
گروہ کے بڑے حصہ کا ایمان سنبھالے ہوئے ہے۔ اور بہ حیثیت مجموعی ان
کی تحریروں میں خیر کا عنصر شر کے عنصر پر کہیں غالب ہے —— کالوکیم
میں جب وہ اپنا مقالہ اجتہاد پر پڑھنے کو آئے تو پہلی خوشی تو اس سے ہوئی کہ

مقالہ انھوں نے بجائے کسی اور زبان کے اُردو ہی میں پڑھا۔ یہ ہمت سوا ان کے شاید ایک آدھ کوئی صاحب کرسکے۔ دوسری مسرت یہ دیکھ کر ہوئی کہ جب ان کا وقت ختم ہوگیا اور مقالہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا تو صدر کی گھنٹی بجانے پر انھوں نے معاً اس کی تعمیل کی اور مقالہ ناتمام چھوڑ کر اپنی جگہ پر واپس آگئے۔ حالانکہ ان کے معتقدین کی ایک بڑی جماعت جو ان کا مقالہ سننے کو آئی تھی برابر پکارتی رہی کہ مقالہ ختم کرکے آئیے۔ ناتمام نہ چھوڑیئے۔

ایسے موقع پر معتقدین کے اس پرجوش مطالبہ کی پروا نہ کرنا اور جلسہ کے نظم و انضباط کو مقدم رکھنا (خصوصاً جبکہ جلسہ ہی میں دوسری مثالیں اس کے برعکس موجود تھیں) بڑے حوصلہ اور بڑے ظرف کا کام ہے۔ الحمد اللہ کہ مودودی صاحب شرافت کے اس امتحان میں پورے اُترے۔

مولانا مودودی کے ذکر کے ساتھ معاً عزیزی امین احسن اصلاحی کا نام خیال میں آجانا قدرتی سا ہے۔ نام کے ساتھ بجائے مولانا کے عزیزی سہواً نہیں عمداً ہے۔ ایک تو وہ اصلاحی اور مدرسہ الاصلاح (ضلع اعظم گڑھ) اس وقت تک گویا ندوہ ہی کی ایک شاخ تھا۔ اور پھر شاگرد اور زیر تربیت رہے۔ مولانا عبدالرحمٰن ندوی

نگرامی مرحوم (سابق شریک ایڈیٹر سچ مرحوم) کے جن سے اپنے تعلقات برادرانہ تھے۔ خود اصلاحی سلمہ سے جب تک یہ لکھنؤ میں رہے براہ راست تعلقات بالکل عزیزانہ رہے اور آج وہ چاہے جتنے بڑے بن گئے ہوں میری نظر میں تو ابھی ویسے ہی چھوٹے ہیں۔ ان کا مقالہ عربی میں سنا، ملاقاتیں بار بار رہیں لیکن ہر بار سرسری و ناتمام ہی رہیں۔ ایک دن صبح ناشتہ پر انھوں نے مدعو کیا۔ مولانا مودودی، مولانا شفیع دیوبندی اور کئی صاحب بھی تھے۔ خیال یہ تھا کہ دسترخوان سادگی کا سبق دے گا اور ناشتہ دعوت شیراز کا نمونہ ہوگا۔ جاکر دیکھا تو کھانے کی چیزوں کی وہ کثرت اور وہ رنگا رنگی کہ مولوی کے دسترخوان پر دھوکا بار بار کسی آنریبل منسٹر کی میز کا ہوتا تھا!۔۔۔۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ جہاں تک زبان کے ذائقہ اور چٹخارے کا تعلق ہے اُمّت کے سارے طبقے کیا درویش باصفا اور کیا رئیس ذی جاہ کچھ ایک ہی سے ہیں!

جماعت اسلامی ہی کے اور اہم معزز رکن حکیم محمد اشرف صاحب ایڈیٹر "المنبر" اپنی محبت سے ملنے ہوٹل میں آئے اور اپنے پرچہ ہی کی طرح خود بھی گفتگو میں شستہ و شستعلیق اور سلجھے ہوئے دماغ کے نظر آئے۔

یہ بات نہیں کہ اپنی ملاقاتیں عالموں اور دینداروں تک محدود رہیں یا یہ کہ کالوکیم میں مجمع صرف ایسے ہی حضرات کا تھا۔ جی نہیں روشن خیالی اور تعلیم جدید

کی نمایندگی کثرت سے تھی، بلکہ کہنا چاہیے کہ اکثریت اسی طبقہ کی تھی اور یوں بھی ملنے ملانے میں تعداد ان حضرات کی اچھی خاصی رہی۔ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ایس اے۔ رحمٰن صاحب کی نشست مقابل جانب فاصلے پر تھی اور پہلے کبھی کا تعارف نہ تھا۔ ازراہ کرم و مسافر نوازی خود ہی بڑھ کر تشریف لائے۔ اپنا مقالہ انگریزی میں پڑھا بہ حیثیت مجموعی بہت غنیمت تھا۔ بلکہ بعض پہلوؤں سے قابل داد بھی، اب اخبارات میں پڑھا کہ ترقی پاکر سپریم کورٹ کے جج ہو گئے ہیں ——— انھیں کے متصل نشست سپریم کورٹ کے جج جسٹس محمد شریف کی تھی وہ اخلاق وکرم میں ان سے بھی سوا نکلے۔ اس اجنبی محض سے بڑھ کر نہ صرف ملے بلکہ چونکہ نوائے وقت کے واسطے سے "صدق" ان کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ اس لیے دس بیس مخصوص ڈیلی گیٹوں کے ساتھ ایک دن لنچ پر مدعو بھی کردیا۔ پاکستان لاکمیشن کے صدر ہیں اور اخبارات میں پڑھا کہ سپریم کورٹ سے ابھی ابھی ریٹائر ہوگئے ہیں۔ لنچ خوب تھا، اس لحاظ سے کہ کھانے جتنے بھی تھے سب اپنے مشرقی اسلامی قسم ہی کے تھے اور ان کو امریکی اور برطانوی نمایندوں نے بڑے ذوق وشوق سے تناول فرمایا خصوصًا مرغ بریانی کو۔ گو ساتھ ہی افسوسناک پہلو یہ تھا کھانا کھلانے کا طریقہ تمامتر فرنگی اختیار کیا گیا تھا۔ یعنی بجائے بیٹھ کے کھڑے کھڑے کھانے کا! ——— "صاحب" نے پہلے تو تہذیب کا سبق یہ دیا تھا کہ بیتاب کھڑے کھڑے کیا جائے، اور اب جنگ کے

بعد سے جدید تحفہ یہ کھڑے کھڑے کھانے کا دیا ہے! ــــ مشہور مستشرق پروفیسر ہٹی (HITTI) سے ملاقات اور گفتگو یہیں رہی۔ کھانے کے بعد ہم لوگوں کی طرح وہ بھی طشت میں ہاتھ دھو رہے تھے۔ یہ مشرقی اور "اسلامی" منظر دیکھ کر رہا گیا او رمعمول وعادت کے خلاف بات چیت کی ابتدا، اسی طرف سے کر دی گئی ہندوستانی مسلمانوں کا حال کرید کرید کر پوچھتے رہے خصوصاً عربی اور اسلامی علوم کی تعلیم کا۔ لکھنؤ، حیدرآباد، کلکتہ ان تین بڑے مرکزوں کے نام خود ہی لیے اپنی نئی کتابوں تاریخ شام، وتاریخ لبنان کا بھی تذکرہ کرتے رہے یہیں تعارف سپریم کورٹ کے دوسرے جج جسٹس شہاب الدین مدراسی ثم پاکستانی سے بھی ہوا، مولوی محی الدین قصوری سے بھی ملاقات سالہا سال کے بعد ہوئی، ان کے والد ماجد مرحوم مولوی عبدالقادر قصوری مرحوم کا تو کیا کہنا، ایک بزرگ آدمی تھے، ان کے بھائی مولوی محمد علی قصوری ایم لے (کیمرج) بھی بڑے پرجوش اور باہوش مبلغ دین گزرے ہیں۔ غرض این خانہ تمام آفتاب ست ــــــ مہمانوں میں اعزاز واکرام کے ساتھ اور بجا طور پر ہاتھوں ہاتھ عزام پاشا مصری لیے جا رہے تھے۔ تعارف ہوا۔ بات چیت شروع ہوئی پہلے انگریزی میں اور جب دیکھا کہ موصوف اردو بول رہے ہیں تو پھر اردو میں رہی۔ اقبال کی بعض اردو نظموں کا ترجمہ عربی میں کر رہے ہیں۔ ان کی شخصیت خاصی دلکش اور متوازن معلوم ہوئی۔ یعنی نہ انگریزی علوم وفنون کے نام سے چڑھ اور نہ ان سے بیجا

مرعوبیت۔ بعد میں بھی ان سے دوچار ملاقاتیں رہیں۔ ہر دفعہ جی خوش ہی رہا۔

روشن خیالوں کے ایک خاص حصہ کے سرخیل خلیفہ ڈاکٹر عبدالحکیم ہیں ان سے شناسائی حیدر آباد کے زمانہ سے ہے۔ آدمی مہذب و شائستہ ہیں۔ ایکی بھی ملاقات رہی اور اپنی طرف سے وضعداری انھوں نے نباہی۔ وحدت ادیان کے قائل ہیں اور نجات کے لیے شاید صرف عقیدۂ توحید اور اعتقاد آخرت (بہ حذف عقیدۂ رسالت) کافی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جو مقالہ پڑھا اس میں بھی یہ رنگ جھلک رہا تھا ـــــ جدید تعلیم یافتہ گروہ کی نمایندگی مذاکرہ میں کچھ کم نہ تھی اور کم ہونے کی وجہ بھی کیا تھی۔ کراچی، سندھ، پنجاب، ڈھاکہ، راجشاہی متعدد یونیورسٹیاں تو خود پاکستان ہی میں ہیں۔ اور باہر کی یونیورسٹیاں ان کے علاوہ۔ کثرت سے ان یونیورسٹی کے دکاترہ اور غیر دکاترہ استادوں سے نیاز حاصل ہوتا رہا۔ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی (سابق مسلم یونیورسٹی والے) سے برسوں کے بعد ملاقات ہوئی۔ کلکتہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی اور سندھ کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر داؤد پوتا اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی دہلوی ثم کراچوی (سابق وزیر مرکز) تو اسی ہوٹل میں مقیم تھے۔ ان سے ملنا روزانہ اور کئی کئی بار ہوتا رہا۔ کراچی یونیورسٹی کے اُستاد تاریخ ڈاکٹر محمود حسین خاں سے جو ہمارے

ہندوستان کے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے بھائی رشتہ ہی کے لحاظ سے نہیں صورت و سیرت کے اعتبار سے بھی ہیں سے خوشگوار ملاقاتیں کئی بار ہوئیں اور یونیورسٹی کی طرف سے جو شاندار ڈنر شب کو ہوا، اور اس میں سابقہ پھر اسی تکلیف دہ کھانے سے پڑا۔ اس میں انھوں نے اسی طرح خدمت انجام دی۔ اور کھانے کی پلیٹیں اس طرح بار بار میرے لیے لائے کہ جیسے میں ان کا کوئی بزرگ ہوں اور وہ میرے خرد ہیں۔ ان کے تقریباً ہم نام ڈاکٹر محمود حسن خاں صدر پبلک سروس کمیشن مشرقی پاکستان سے بھی ملنا بار بار ہوا، دوسروں سے ان کی مذہبی بحثیں سنتا رہا۔ ڈھاکہ کے استاد عربی ڈاکٹر صغیر حسین المعصومی اور راجشاہی کے ڈاکٹر شہید اللہ سے بھی اکثر مذاکرے رہے۔ یہ ڈاکٹر شہید اللہ اُستاد بنگلہ و سنسکرت کے ہیں۔ لیکن بڑے متقشف مسلمان صورت اور لمبی داڑھی ہی کے لحاظ سے نہیں۔ عقائد کے لحاظ سے بھی ہیں۔ سندھ یونیورسٹی کے استاد تاریخ منظہر الدین صدیقی اور راجشاہی کے استاد فلسفہ ڈاکٹر جمیل سے بھی گفتگوئیں رہیں۔ اقبال اکیڈمی کراچی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رفیع الدین اپنی ڈگریوں کے باوجود دین میں بڑے راسخ ہی نہیں بلکہ بلامبالغہ ایک نئے قسم کے علم کلام کے ماہر بھی جو سائنس اور فلسفہ کی لائی ہوئی نئی سی نئی گمراہیوں کا مقابلہ پوری قوت سے کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر میر ولی الدین اُستاد فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی سے مدت دراز کی تحریری نیازمندی کے بعد ملاقات پہلی بار یہیں ہوئی

یہ بھی اسی ہوٹل میں مقیم تھے۔ ان کی گہری مذہبیت اور ان کے تصوف وسلوک سے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ کاش ان کا ظاہر بھی ان کے باطن ہی کی طرح انوار ایمان کا آئینہ دار ہوجائے ــــــ کلوکیم کے باہر یہاں کے استاد فلسفہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی (علیگ) سے سرسری ملاقاتیں رہیں، وہ بھی اپنی دینی صلابت و حرارت میں کسی سے ہمنزدوم پر نہیں۔ کلوکیم کے اندر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ پرنسپل اورنٹیل کالج سے گو افسوس ہے کہ ملاقات نہ ہوسکی، پھر بھی ان کی اسلامیت پر ان کے مقالے اور ان کی کتابیں گواہ ہیں۔ سیلون یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد یوسف (صدر شعبۂ عربی) سے ملاقاتیں رہیں۔ پرانے علیگڑھی اور اپنے یوپی ہی کے آدمی نکلے۔ ایک پرجوش مسلمان ظفر احمد صاحب انصاری الہ آبادی ثم پاکستانی بی اے، ال، ال، بی اور فلسفہ میں ایم اے مگر صورۃً بالکل مولوی اور جوش و تصلب میں تو بہت سے مولویوں سے بڑھے ہوئے، پاکستان کے دستور دآئین کی اسلامیت کیلیے بڑا زور لگانے والے۔

جدید طبقہ سے ہمارے پرانے علما کی یکسر بیزاری اور بدگمانی بجا نہیں اسی گروہ میں بعض ایسے پختہ دین دار بھی نکل آتے ہیں جن کے رسوخ فی الدین اور صلابت پر رشک آتا ہے۔ اور بعض جو بہ ظاہر بہکے ہوئے نظر آتے ہیں ان کے ہاں بھی ضد اور تعصب سے زیادہ دخل ناواقفیت اور بے علمی کو ہے ایک صاحب کو انھیں میں سے عین اس وقت جبکہ ان کے حریف مقابل بے دین

اور دین سے خارج قرار دے رہے تھے۔ اپنے کانوں سے کہتے سنا کہ "آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اللہ اور رسول کا نام آجائے تو میں اپنی جان تک دینے کو حاضر ہوں۔ لیکن آپ لوگوں نے جو یہ مسئلے گڑھ رکھے ہیں یہ میری سمجھ سے باہر ہیں" ضرورت ایسے تمام افراد سے میل جول بڑھانے، مل جل کر ان کے دل ٹٹولنے اور طویل صحبتوں سے رفتہ رفتہ ان کے ایک ایک شک وشبہ کو دور کرنے کی ہے نہ کہ ان کے ساتھ برتاؤ خشونت کا کیا جائے اور انھیں یکسر ملحدوں اور زندیقوں ہی کے درجہ میں رکھا جائے۔ اس طریقہ نے بہت سے قابل قدر مخلصوں کو بیگانہ بنا ڈالا ہے مابہ الاشتراک پر نظر مابہ الاختلاف سے کہیں زیادہ رہنی چاہیئے۔

جلسہ ہی میں ایک دن "روشن خیالوں" کے امام پرویز صاحب (طلوع اسلام والے) نظر پڑے، ایک صاحب سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہی ہیں۔ ان کی شکل پہلی بار دیکھنے میں آئی۔ لیکن ان کا نام اور ان کی تحریریں میرے لیے نئی ذرا بھی نہیں۔ مدت ہوئی جب یہ حکومت ہند کے سکریٹریٹ میں دہلی میں تھے اور صدق کا نقش اول سچ نکل رہا تھا۔ تو یہ اس کے خاص ہمدردوں اور عملی معاونوں میں تھے۔ نگار کی ملحدانہ تحریروں اور اس وقت کے مشہور منکر حدیث ڈپٹی مقبول احمد (حق گو) کے خلاف جب سچ کو مستقل مہم چلانا پڑی تھی تو پرویز صاحب اس مہم کے صف اول میں تھے۔ ۱۹۳۱ء ۱۹۳۲ء ۱۹۳۳ء میں ان کے مضمون کثرت

سے ہیں نکل چکے ہیں۔ معارف وغیرہ سے بھی ان کے تعلقات ایسے ہی مخلصانہ تھے یہ اچھے پرجوش مجاہد تھے۔ یہ حال ایک دو دن نہیں برسوں رہا اور ان کے محبت بھرے اور کارآمد خطوط شاید سینکڑوں کی تعداد میں میرے پاس جمع ہو گئے تھے ـــــ انسان کو بگڑتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ ثم رددناہ اسفل سافلین میں بیان فطرت بشری کا ہے۔ نفس ہر انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے اور شیطانی ترغیبات نے بڑے بڑوں کو خراب کر کے رکھا ہے۔ واللہ اعلم بگاڑ کہاں سے پیدا ہوا۔ اور اس کے اثر سے پرویز صاحب بجائے ایک مخلص و سرگرم کارکن کے اپنے کو ایک فاضل محقق خیال کر بیٹھے اور اس کے بعد معاف فرمایا جائے کام ہمارے مولوی صاحبان نے ضد دلا دلا کر اور ذاتی حملے کر کر کے خراب کیا

بہرحال پرویز صاحب سے ملاقات رہی اور وہ بڑی اچھی طرح ملے جس طرح ایک بھلے آدمی کو ملنا چاہئے۔ ان کا مقالہ (انگریزی تفسیری غلطیوں سے پر تھا۔ شدید نزلہ کے باعث میں تو سہ پہر کے اجلاس میں شریک نہ ہو سکا۔ البتہ ایک تنقیدی پرچہ لکھ کر سکرٹری صاحب مذاکرہ کو دے آیا تھا کہ اسے پڑھ کر سنا دیا جائے ـــــ میں طلوع اسلام کے مطالعہ سے محروم رہتا ہوں ان کی اور کتابیں معارف القرآن وغیرہ بھی دیکھنے کا اتفاق برائے نام ہی ہوا البتہ اس کا اندازہ ہوا کہ پرویز صاحب صدق کو اپنے مطالعہ سے مشرف فرماتے رہتے ہیں۔ اس کا بھی اندازہ ہوا کہ پاکستان کے ایک اونچے طبقہ میں انکا

،شر اچھا خاصہ ہے اور بعض "بڑے لوگ" انھیں ایک امام یا مجتہد کے درجہ پر رکھے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال کے بعد ہم لوگوں کو ضرورت اور اور زیادہ محتاط رہنے کی ہے۔ یعنی ان کے عقائد پر گرفتیں تو خوب کی جائیں اور ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں اور گمراہیوں کی پردہ دری میں مروت سے اور چشم پوشی سے کام ذرا بھی نہ لیا جائے۔ لیکن ان کی ذات کو معرض بحث اور ان کی شخصیت کو ہدف تمسخر و تضحیک بنائے رکھنا ہرگز کوئی دینی خدمت نہیں۔

حجازی اور عراقی، مصری اور شامی ہی فاضلوں کے اتنے بڑے مجمع کے دیکھنے چہ جائیکہ اس میں شامل ہونے کی توقع زندگی بھر کبھی کیوں ہو سکتی تھی چہ جائیکہ فرنگی فاضلوں اور مستشرقین کے مجمع میں! ایک تو یہی یقین تھا کہ ایسا اجتماع جب کبھی بھی ہوگا۔ یورپ یا امریکہ ہی میں ہوگا اور پھر یہ کہ جب اور جہاں کہیں بھی ہو اس میں اس گمنام گوشہ نشین کی شرکت کا بھلا کون سا محل ہوگا! —— قدرت نے اچانک اور بے شان و گمان دونوں مفروضے جھٹلا دیے جلسہ یورپ اور امریکہ کے کسی دور دراز ملک میں نہیں۔ پڑوس ہی کے ملک پاکستان میں ہوا۔ اور وہاں بھی پشاور یا کوئٹہ یا کراچی میں نہیں بلکہ یوں کہیے کہ عین ہندوستان ہی کی سرحد پر اور پھر جلسہ کے داعیوں نے انتخاب میں

اہلیت پر حسن ظن کو مقدم رکھا، اور اس طرح جرمنی اور فرانس ہالینڈ اور روس برطانیہ اور امریکا کے فاضلوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے اور قریب سے ان کا مطالعہ کرنے کا موقع (وہ سطحی اور سرسری ہی) اس نااہل کو بھی میسر آگیا! ـــــــ یہ لوگ کوئی ۲۰، ۲۵ کی تعداد میں ہوں گے ۔ دو خاتون باقی مرد ، ان میں سے مقالے بھی ۱۴، ۱۵ نے پڑھے ۔ ان میں سے بعض تو اسلام کے سیاسی پہلوؤں پر تھے ۔ مثلاً اسلام میں ریاست کا تصور" بعض معاشی پہلوؤں پر مثلاً محنت اور مزدوری اسلامی شریعت کی روشنی میں ، بعض کلامی پہلوؤں پر مثلاً ۔ "اسلام کا رویہ دوسرے ادیان و مذاہب سے متعلق" اور بعض فقہی پہلوؤں پر مثلاً" اجتہاد کی گنجائش اسلام میں" اور ایک آدھ مقالہ اسلامی" آرٹ ، یعنی تعمیرات وغیرہ پر بھی تھا ـــــــ مسلمانوں اور اسلام کے ساتھ ہمدردی ان سب مقالوں میں مشترک تھی بعض میں نمایاں ۔ اس ہمدردی کی بنیاد وقعت اور احترام پر تھی ۔ مخالفانہ تنقید، تحقیر اور بے وقعتی اور اپنی سیاسی، عقلی و علمی بالادستی کا احساس و اظہار گویا نہ تھا ۔ یہ بات آج سے ۳۰، ۳۵ سال ادھر ممکن نہ تھی ۔ اس خوشگوار صورت حال کے اور اسباب جو کچھ بھی رہے ہوں ایک سبب بہرحال یہ بھی تھا کہ عالم اسلامی کے جو نمائندے آئے تھے وہ کمزور، درسست، پست ہمت و درماندہ ، احساس کمتری کے مریض نہ تھے علی العموم خوب پڑھے لکھے اور اپنی اسلامیت پر رسوخ کے ساتھ مغربی طرز فکر و نظر

میں بھی خوب برتی تھے۔ بلکہ ایک اسلامی ملک کے نمایندہ نے تو صاف صاف اپنی تقریر میں ان حضرات کو مخاطب کرکے کہہ بھی دیا تھا کہ " اب ہم آپ لوگوں کے قدم قدم پر محتاج و دست نگر نہیں رہے ہیں۔ آپ ہی کی درسگاہوں میں پڑھ پڑھ کر اور آپ ہی کی شاگردی اختیار کرکرکے سیاسی آزادیوں کے ساتھ ساتھ ہم میں علمی اور ذہنی خود داری بھی آگئی ہے۔ اور اب ہم آپ کے پس رووں میں نہیں، ساتھ کے چلنے والوں میں ہیں "

جس طرح اسلامی ملکوں کے نمایندوں میں شاید ممتاز ترین شخصیت مصر کے عبدالوہاب عزام پاشا کی تھی، مستشرقین کی صف میں سب سے نمایاں پرنسٹن یونیورسٹی (امریکہ) کے لبنانی الاصل استاد فلپ۔ کے ہٹی کو حاصل تھی معمر آدمی ہیں۔ اور سن ہی کے اعتبار سے بہتوں سے سینیر نہیں۔ بلکہ اپنے علم و فضل کے لحاظ سے بھی ایک امتیازی مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کی ضخیم کتاب "ہسٹری آف دی عربس" بھی۔ اور ان کی تازہ ترین ہسٹری آف سیریا (تاریخ شام) اور ہسٹری آف لبنان (تاریخ لبنان) ہیں۔ یہ آخری کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ جب پروفیسر موصوف سے جسٹس شریف کے ہاں لنچ پر ملاقات ہوئی تو خود ہی اس کتاب کا ذکر فرماتے رہے ۔۔۔ بعض معاشرتی ادائیں بھی مسلمانوں سے لے لی ہیں۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ لنچ کے بعد مسلمانوں ہی کی طرح ہاتھ دھورہے

تھے۔ ورنہ عام فرنگی تہذیب میں کھانے کے بعد کلی کرنا اور ہاتھ دھونا کہاں۔ میں نے اس چیز پر بڑھ کر انھیں مبارکباد بھی دی جسے ہنس کر انھوں نے قبول فرمایا ـــــ یوں ان کی عام روش اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ خاصی ہمدردانہ ہے۔ لیکن اسے کیا کریں کہ بہرحال فرنگی ہیں کھل کر اعتراض تو کرتے نہیں لیکن بین السطور میں اکابر اسلام (اجل صحابہ و خلفائے راشدین) کے سلسلہ میں کوئی بات ایسی کہہ ہی جاتے ہیں جس سے پڑھنے والے کا دل ان کی طرف سے ہٹ کر رہ جائے تاریخ عرب میں تو اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ تاریخ شام میں زیادہ۔

مذاکرہ کے آخری روز ایک چھوٹی سی مجلس مشورت وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کے ہاں الگ منعقد ہوئی جس میں ماہر وفد کے صرف صدر شامل تھے اور اس میں یہ طے پایا کہ مذاکرہ کے اسی ادارہ کو مستقل کر دیا جائے اور اس کے اجلاس وقتاً فوقتاً کسی اسلامی ملک کی دعوت پر وہاں ہوتے رہیں اس موقع پر ہٹی صاحب نے ایک بڑی سمجھ اور معقولیت کی بات کہی جس سے دل میں ان کی قدر و وقعت زیادہ پیدا ہو گئی۔ انھوں نے کہا کہ دیکھیے ان جلسوں میں دینی مذہبی بحثیں بھی چھڑ جاتی ہیں تو اس ادارہ کے دو حصے کر دیجئے ایک میں صرف تاریخی، علمی، تمدنی عنوانات پر گفتگو ہو۔ ان میں ہم کو ضرور شامل رکھیے۔ ہم لوگ اسی میں بمسرت شریک ہوں گے۔ باقی دوسرا حصہ جس میں آزادی سے آپ دینی، مذہبی اعتقادی مسئلوں پر گفتگو کرنا چاہیں ہم لوگوں کو اس

سے الگ ہی رکھیے ۔۔۔ " ڈسپلن " کے وسیع مفہوم میں نظم انقیاد، اطاعت تہذیب، خوش کلامی کے سارے پہلو آ گئے۔ یہ مغربی نمایندے مجسم " ڈسپلن " تھے اور اس کی ایک جھلک اس معقول مشورہ کے اندر بھی موجود ہے۔

معمر اور سینیر ہونے کے لحاظ سے فرانس کے ڈاکٹر لوئی مسینان (MASSIGNAN) شاید ٹی سے بھی بڑھے ہوئے تھے حسین بن منصور حلاج کی کتاب الطواسین انھیں نے بڑی محنت سے مرتب و مہذب کر کے شائع کی ہے۔ اور ایک عمر سے فرینچ میں اسلامیات سے متعلق موقت رسالے شائع کر رہے ہیں ان کا اثر چہرہ اور جسم پر نمایاں ہے اور ثقل سماعت کے باعث انے کان میں آلہ بھی لگائے رہتے ہیں۔ ان کی نشست کا نمبر میرے نمبر سے قریب ہی تھا لیکن بات چیت کا موقع نہ نکل سکا ان کا مقالہ " اسلام میں کاسبوں یا پیشہ وروں کے حقوق " یا ایسے ہی کسی موضوع پر تھا ۔۔۔ اچھے مقالوں میں ایک مقالہ ایک ادھیڑ عمر کی خاتون مس لیمبٹن (LIMBTAN) تھا۔ لندن یونیورسٹی میں فارسی کی اُستاد (یا استانی) ہیں۔ موضوع یہ تھا امیر یا امام جب بجائے عدل و اقامت دین و شریعت کے راستہ فسق و ظلم کا اختیار کرے تو اس کا علاج اسلام نے کیا بتایا ہے؟ عزل امام یا اس سے بغاوت ؟ یا کیا ؟ موضوع دلچسپ تھا اور مقالہ ہمدردی اور علم و نظر کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ ان کی نشست مجھ سے فاصلہ پر تھی

اور میں کہ مردوں ہی سے ملنے ملانے اور تعارف حاصل کرنے میں بدتمیت واقع ہوا ہوں۔ ایک خاتون سے ملاقات کی ہمت کہاں سے لاتا۔ جسٹس شریف کے ہاں لنچ پر یہ بھی تھیں، اور پلاؤ کی داد دیتے ہوئے اس کے لیے — A PERFECT DISH کا فقرہ انھیں کی زبان سے ادا ہوا تھا ——

نشست میں مجھ سے قریب ترین ہالینڈ کے ڈاکٹر (DURRAS) یہ لائیڈن یونیورسٹی میں اسلامیات کے معلم ہیں اور کرامات شیخ جیلانی وغیرہ پر کچھ چیزیں شائع کر چکے ہیں۔ ان کے مقالہ کا موضوع کچھ اس قسم کا تھا "اسلامی قدروں اور جدید معاشرتی نظریوں میں تصادم" ان سے یکجائی کئی دن تک کئی کئی گھنٹے رہی۔ بہرخاموشی آخر پہلے انھوں نے ہی توڑی اور معمولی بات چیت ہونے لگی۔ انھیں نے پوچھا کہ آپ ہندوستان کے کس حصہ سے آئے ہیں؟ اور جواب میں جب لکھنؤ کا نام سنا تو پھر پوچھا کہ آپ کی مادری زبان کیا ہے؟ اس پر میں نے کہا "اردو" تو بڑی حیرت سے اس لفظ کو دہرایا اور پھر کہا کہ" اب بھی اردو! ہندوستان کے اخبار نویسوں نے ہندی کا پروپیگنڈہ ہی اس غضب کا کیا ہے۔ اور جواہر لال اور مولانا ابوالکلام تک کی تقریروں کو بجائے ہندوستانی یا اردو کے جب ہندی کا نام دے دیا ہے تو باہر والے بیچارے قدرۃً یہی سمجھنے لگے ہیں کہ اردو تمام تر ختم ہو چکی ہے اور اب ہندی ہی ہندی باقی رہ گئی ہے!——

ایک اور قابل ذکر اور معروف ہستی کینڈا کی میک گل یونیورسٹی کے ادارہ اسلامیات

کے ڈائرکٹر ولفرڈ اسمتھ کی ہے۔ اسلام اور ہندی اسلام پر کتابیں لکھ چکے ہیں جن کے بعض حصے اچھے خاصے اور کھلے ہوئے تکلف دہ ہیں اور شاید آپ ہی کا مبارک قلم اقبالؒ کو "معاشیات سے جاہل" ہونے کا سرٹیفکیٹ دے چکا ہے ایک صاحب نے رات کے یونیورسٹی ڈنر میں ان سے تعارف کرا دیا دل ان سے کچھ کھلا نہیں۔ اس لیے بات چیت بھی کچھ یوں ہی سی رہی۔ ان کا مقالہ اسلام میں قانون اور اجتہاد پر تھا۔ خود تو اس کے سننے کا اتفاق نہ ہوا مگر دوسروں سے اس کی شکایت ہی سننے میں آئی ـــــ جرمنی کے پروفیسر اسپولر SPULAR کا مقالہ سیرۃ نبوی کے بعض پہلوؤں سے متعلق بڑا دلچسپ اور پر بصیرت رہا۔

ان مغربی مہمانوں میں سب سے زیادہ دلچسپ دجاذب توجہ شخصیت اٹلی کے پروفیسر الگزنڈر بوسانی BAUSANI کی نظر آئی، روم کی یونیورسٹی میں فارسی کے اُستاد ہیں اور اقبال کے جاوید نامہ وغیرہ کے اطالوی زبان میں مترجم۔ مقالہ "اسلامی شاعری" پر تھا۔ اور اس سے پتا چلا کہ فارسی کے علاوہ اردو شاعری پر بھی ان کی نظر اچھی خاصی ہے۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ وغیرہ کا تذکرہ بھی اس میں تھا۔ اور تبصرہ بھی۔ دلی خوشی ہوئی کہ اب ہماری اردو بھی اس قابل سمجھی جانے لگی کہ فضلائے فرنگ اس پر توجہ کریں۔ مقالہ

کے بعد باہر ان کے گرد ایک مجمع لگ گیا۔ لوگوں کو ایک مشغلہ ہاتھ آگیا اور ان کے تبصرے پر الٹے سیدھے سب ہی طرح کے تبصرے ہوگئے! چہرہ پر داڑھی مسلمانوں سے مشابہت پیدا کرنے والی "صاحب" کی وہ شان وہ آن بان وہ دھاک، جو کچھ روز قبل تک ہر گورے چمڑے والے کا ایک پیدائشی حق سمجھی جاتی ہے۔ اس کا کہیں آس پاس پتا نشان نہیں، ہر شخص سے بے تکلف جس نے جہاں چاہا، گھیر کر باتیں شروع کر دیں! ـــــ خدا بھلا کرے لاہور کے منچلے اور شیوا طراز ناشر طفیل صاحب ایڈیٹر "نقوش" کا کہ انھوں نے ایک شام کو اپنے ہاں کھانے پر انھیں مدعو کر دیا۔ اور دعوت میں خالص مشرقیت کا التزام رکھا۔ کھانے سب اپنے ہی طریقے کے پنجابی، پاکستانی کہیے یا ہندستانی اسلامی اور اس سے کہیں بڑھ کر نشست بجائے میز کرسی کے فرش پر! "کھڑے کھانے" کے اس تکلف وہ دور میں نشست ہی کا انتظام بجائے خود قابل داد تھا، چہ جائیکہ نشست بھی چاندنی اور قالین بھی! خدا جانے کیا چوک ہوگئی، ورنہ اگر کہیں ساتھ میں مشاعرہ اور قوالی کا بھی انتظام کر دیا جاتا تو معزز مہمان کو مشرقیت اور مشرقی زندگی و ماحول کا لطف پورا ہی آجاتا اور قال حال سے بدل کر رہتا!

یہ دلچسپ و پرلطف صحبت خاصی دیر تک قائم رہی، گفتگو بوسانی صاحب سے انگریزی سے زیادہ اردو ہی میں رہی اور جب مجلس برخاست

ہوئی، تو دل میزبان اور مہمان دونوں کی شکرگزاری کے جذبات سے لبریز تھا۔

پرانے قسم کے عالموں، فاضلوں اور نئی طرز کے ڈاکٹروں اور مستشرقین کے علاوہ یوں بھی عام اہل قلم کی برادری لاہور میں اچھی خاصی بڑی ہے اور یہ ممکن نہ تھا کہ وہ سب کلوکیم میں شامل ہوں الگ فرداً فرداً بھی ان میں سے سب ملنے کے قابل تھے۔ ان میں سے ایک کی زیارت تو کلوکیم ہی کے سلسلہ میں ہوگئی اس کے ڈائرکٹر بھی تھے۔ .... ڈاکٹر محمد شفیع چہرہ کی قطع اور مونچھوں کی وضع اقبال سے ملتی ہوئی۔ مغربی طرز کے عالم مشرقیات لاہور میں اب سب سے بڑے شاید یہی ہیں۔ ان کے علم کا شہرہ عرصہ سے سننے میں آرہا تھا۔ ملاقاتیں ہوئیں مگر قدرۃً بہت ہی سرسری، تشنگی باقی ہی رہ گئی ——— لاہور کے ایک بڑے زبردست صاحب قلم بلکہ لکھا ڑسارے لاہوری لکھنے والوں کی ناک مشہور ناول نگار ایم اسلم صاحب ہیں، صدق و مدیر صدق کے پرانے مخلص وکرم فرما۔ ان کی اسلام دوستی اور اسلامیت یقیناً کسی بیان وتصریح کی محتاج نہیں، بار بار ملنے آئے اور دعوت حسب معمول خوب دھوم دھام سے کی۔ اس دعوت میں ملاقات مسلم لیگ کے نامور لیڈر میاں امیرالدین سے رہی اور ایک حکیم صاحب (نام غالباً حسن عسکری صاحب تھا) سے بھی جنھوں

نے مجھے نزلہ میں مبتلا دیکھا کئی دوائیں اپنے پاس سے عنایت کیں۔
اسلامیت میں اسلم صاحب کے پبلیشر فردغی صاحب بھی ان سے کچھ
کم نہیں بلکہ ناشرین کے طبقہ میں ایسی فکر اسلامی رکھنے والے تو میرے
تجربہ میں یہی ایک آئے۔ گفتگو بڑی سنجیدہ و مرتب کرتے ہیں۔ ذاتی حملوں
کے حشویات ولغویات سے پاک! اور یہ صفت آج اپنے عنقا ہونے کی
بنا پر معمولی نہیں (بہت بڑی صفت ہے) انھوں نے بھی خود اپنے ہاں
ناشتہ پر مدعو کیا۔ اور اس نام کے ناشتہ نے بہت سے "کھانوں"
کو مات کر دیا۔ غرض مصنف اور ان کے ناشر دونوں کی صحبتیں ہر طرح خوشگوار
رہیں ـــــ شہر کے ایک دوسرے نامور ناشر محمد طفیل صاحب (صاحب نقوش)
ناموری ایک دوسرے رنگ کی اور دوسرے طبقہ میں نقوش کے رنگا رنگ
اور حیرت انگیز حد تک ضخیم نمبروں کی بنا پر حاصل کیے ہوئے ہیں ملاقات پہلی بار
ابھی ہوئی۔ پہلے افتتاح مذاکرہ کے دن ایٹ ہوم میں اور پھر خود انھیں
کے ہاں شب کی دعوت میں، آدمی کم گو، خاموش اور شرمیلے نظر آئے۔
معلوم ہوتا ہے کہ شوخی وطراری سب قلم تک محدود ہے۔ دعوت انھوں
نے اطالین مستشرق اردو و فارسی کے ماہر پروفیسر بوسانی BAUSANI
کی بھی اور خالص مشرقی کھانے، خالص مشرقی انداز سے فرش پر بٹھا کر
خوب کھلائے اور اس طرح ہم لوگوں کو بھی بوسینی صاحب کی صحبت وگفتگو

سے فیض یاب ہونے کا موقع بہم پہنچایا۔ بہ حیثیت میزبان بھی خوب نکلے۔
مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

پرانے اور بہت پرانے و بے تکلف ملنے والوں میں مولوی سید
ہاشمی فریدآبادی (علیگ) ہیں۔ ایک عمر بابائے اردو مولوی عبدالحق کے
ساتھ حیدرآباد دکن میں گزاری۔ پھر کراچوی ہوئے۔ اور اب تو مدت سے
لاہوری ہیں۔ اردو کے بڑے اچھے لکھنے والوں میں ہیں۔ دہلی کی زبان ہی
نہیں لکھتے اس کی نوک پلک تک کا لحاظ رکھتے ہیں۔ عمر بھر ساری لکھنے لکھانے
ہی میں بسر کر دی، پر اس قسمت کا کیا علاج کہ ناموری وہ نہ حاصل ہوئی جس
کے یہ ہر طرح مستحق تھے۔ آجکل ضخیم تاریخ لاہور مرتب کر رہے ہیں اور عموماً
تاریخ ہی کے موضوع کو شروع سے اپنائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ عثمانیہ یونیورسٹی
کے سررشتہ تالیف و ترجمہ میں جو منسلک رہے تو تاریخ ہی کے شعبہ میں لیکن
اسے کیا کیجئے کہ فطرت نے ان میں صلاحیتیں مورخ و واقعہ نگار سے کہیں بڑھ کر
ادیب و انشاپردازکی ودیعت کر رکھی ہیں۔ لاہور میں رہتے بھی بہت دور
ہیں۔ ماڈل ٹاؤن میں۔ وہاں تک رسائی بھی مجھ مسافر کی دشوار تھی لیکن
اللہ کا کرم کہ کلوکیم کے باہر ہی ان سے ملاقات ہو گئی اور دوسرے دن انھوں
نے ہوٹل تک تکلیف کی۔ اللہ انھیں مدتوں صحیح و سلامت رکھے۔ سن کے

اثر کو کیا کریں۔ میری نظروں میں تو ان کی پہلی ملاقات کی شکل پھر رہی ہے جب وہ جوان رعنا تھے اور چہرہ سے مردانہ حسن پھٹا پڑتا تھا، مذہب و تصوف کی طرف جوانی ہی میں مائل ہو گئے اور اب تو کہنا چاہیے کہ نقشبندی سلسلہ کے ایک صاحب ریاضت بزرگ ہیں ـــــ ایک روز شام کو کلوکیم کے باہر فارسی اور انگریزی کے تین ماہر مل گئے۔ پروفیسر فیروز فرہنگ نامہ جدید کے مصنف آغا عبدالحمید عرفانی ماہنامہ ہلال (کراچی) کے مرتب اور شاہ حسن عطا جو اپنے جوار لکھنؤ ہی کے رہنے والے ہیں۔ اور علی گڑھ یونین کی وائس پریسیڈنسی بڑی شان و شوکت سے کرکے۔ اب غالباً ایرانی رعایا ہیں تینوں بے طرح مہربان رہے اور مبالغہ آمیز حسن ظن کا اظہار طرح طرح کرتے رہے اپنی ہی موٹر پر ہوٹل پہنچا گئے ـــــ فارسی دانوں ہی کے سلسلہ میں نام پروفیسر اکبر منیر کا یاد پڑ جاتا ہے۔ لاہور میں خوب ہی متعارف ہیں۔ اقبالؒ سے غالباً خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ ہوٹل میں آئے اور دیر تک تشریف رکھی ـــــ میاں بشیر احمد صاحب (صاحب ہمایوں) کا نام سالہا سال سے سننے میں آرہا تھا۔ کلوکیم میں جو ڈنر ایک شام کو یونیورسٹی کی طرف سے ہوا اس میں مہمان کی حیثیت سے یہ بھی آئے اور اس طرح ملے کہ فرط تواضع سے گویا بچھے جاتے تھے ـــــ اشرف صبوحی دہلوی ثم لاہوری کا ذکر پچھلے سفرنامۂ پاکستان میں آچکا ہے۔ ایک بھی ملاقات رہی۔ اپنی دھیمی طبیعت

اور خاموشش زبان کا نقاب ایسا ڈال رکھا ہے کہ پتا ہی نہیں چلنے پاتا کہ اس کے اندر چہرہ کسی ادیب و اہل زبان کا ہے ـــــ قاضی نذر احمد نگینوی یہاں کے کسی اسلامیہ کالج میں اُستاد ہیں ملاقات رہی ۔ ان کے بعض مضمون اس لحاظ سے قابل قدر نکلے ۔ کہ ان میں عرب، شام، مصر وغیرہ اسلامی ملکوں کے جغرافی مقامات کے عربی اور انگریزی دونوں نام موجود ہوتے تھے ۔ دونوں زبان کے جغرافیائی ناموں کا تطابق ایک اچھا خاصا دشوار مسئلہ ہے اور کثرت سے طالب علموں کو اس وادی میں بھٹکتے ہی رہنا پڑتا ہے ۔ خوب ہو جو یہ ایک لغت یا فرہنگ اس قسم کا مرتب کردیں ـــــ سید شاہد حسین رزاقی بانسوی ثم لاہوری اپنے جوار ہی کے نہیں اپنی برادری کے ہی ہیں ۔ اودھ کی مشہور درگاہ بانسہ کے پیرزادوں میں سے یہاں ادارۂ ثقافت سے منسلک ہیں، قریب ہونے کے باوجود ابتک دور ہی رہے تھے ۔ اب کی خود ہی بڑھ کر ملے ۔ اور اب جو پہلی سابقہ ان سے براہ راست پڑا تو معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنی بہت اصلاح کرلی ہے ۔ صلاحیتیں ان میں اچھی اچھی معلوم ہوئیں اور ایک خاص قسم کا توازن اور سلجھاؤ ان میں ملا جو یہاں کی سرتاپا ہیجان فضا میں ایک خصوصی نعمت ہے ۔ دل ان سے ملکر اور بات چیت کرکے خوش ہی رہا ـــــ منشیوں ۔ ادیبوں، اہل قلم کا یہ سرسری تذکرہ بھی یقیناً ناقص و ناتمام رہے گا اگر اس میں نام اردو کے ممتاز شاعر احسان دانش کاندہلوی

نم لاہوری کا نہ آنے پاتا۔ ان سے ملنے کا اشتیاق مدت سے تھا۔ ابکی جاکر پورا ہوا، شورش صاحب (چٹان والے) ہاں کی دعوت میں یہ بھی شریک تھے صرف ایک ملاقات سے سیری تو خیر کیا ہوتی۔ خصوصًا جبکہ ان کا کلام بھی ان کی زبان سے سننے میں نہ آیا۔ یہی غنیمت ہے کہ ابکی ملاقات ہوگئی۔

ادیب الملک خواجہ محمد شفیع دہلوی نم لاہوری کی شخصیت اس کی متقاضی ہے کہ ایک لمبا پیراگراف مستقل انھیں کے ذکر کے لیے وقف رہے۔ گویہ ذکر تمامتر ذکرِ خیر نہ ہوگا۔

جہاں تک میری ذات سے ان کے اخلاص، محبت، نیازمندی کا تعلق ہے مبالغہ آمیزی نہیں، شاعرانہ حد تک مبالغہ آمیز ہے جتنا جھک کر بلکہ گر کر وہ مجھ سے ملتے ہیں اور اس سے میں کٹ کٹ جاتا ہوں، اور عملی مدد بھی ابکی ان کی ذات سے جتنی ملی خصوصًا لاہور اسٹیشن کے ورود کے وقت اتنی کسی دوسرے سے نہ مل سکی۔ خطوط جس انتہائی تکریم و عقیدت کے ساتھ لکھتے رہتے ہیں۔ ان ساری حیثیتوں سے وہ میرے لیے ایک نعمت بے بدل ہیں اور اتنا ہی نہیں دلی سے ان کی ہجرت لاہور معتبر راویوں کے بیان کے مطابق واقعی ایک حد تک "ہجرت" ہی کے حکم میں داخل ہے اور پھر لاہور پہنچ کر انھوں نے جس ایثار، خودداری، دیانت، صبر و تحمل، بلکہ توکل کا ثبوت دیا۔ اس نے

ان کے لیے عزت و احترام کا گہرا نقش میرے دل میں بٹھا دیا ہے ـــــــ لیکن (اور دلی تاسف و تلق کے ساتھ یہاں لیکن، لانا پڑتا ہے) دوسری طرف ان کی زندگی کا ایک پہلو بڑا ہی قابل ملامت اور ان کی ریاضتوں اور مجاہدات کے خرمن کو آگ لگا دینے والا ہے۔

۲ اور یہ ہے ان کا مشغلہ ہجو گوئی و ہجو نگاری جو مشغلہ اب کہاں رہا ہے اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب نے اسے فخر و اطمینان کے ساتھ اپنا فریضہ زندگی بنالیا ہے ! اور وہ بے محابا بے تحاشہ ہجو نگاری بھی اس غضب کی جو شاید سودا و انشا، کو بھی پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ ایسی بے پناہ ہجو نگاری تو کافروں کی بھی مطلق صورت میں جائز نہیں چہ جائیکہ اپنے ہی بھائی بندوں اور اپنے ہی ملک کے اونچے افسروں اور عہدہ داروں کی جو سب کے سب کلمہ گو ہی ہیں۔ اور ان میں یقیناً بہت سے اچھے مسلمان بھی ہیں۔ خواجہ صاحب کے ذہن میں خدا جانے یہ کہاں سے بیٹھ گئی ہے کہ ان کی ذات پر سب وشتم ان کے نسب پر بدترین حملے ان کی صورت و شکل کی تضحیک غرض ہر قسم اور ہر درجہ کی گالی گلوچ ایک کار ثواب اور بھٹیار خانہ کومات کرنے والی اس بولی ٹھولی کا نام ان کی زبان میں ادب و انشا ہیں ! یوں بھی اس طرح دشنامی لٹریچر کے اقتباسات دینے آسان نہیں اور پھر اس سفرنامہ میں تو اور بھی اس کا موقع نہیں ورنہ دل پر جبر کر کے دس بیس سطریں اس ادب

لطیف کی نہیں ادب کثیف کی ضرور نذر ناظرین کر دی جاتیں۔ بغیر اصل نمونوں کے کوئی اندازہ کر نہیں سکتا، کہ خواجہ شفیع جیسا شریف طینت و شریف النفس انسان سفلیت کے کتنے گہرے غاروں میں اُتر سکتا ہے! دوبارہ عرض ہے کہ خواجہ صاحب کو مجھ سے بے پناہ اخلاص و محبت ہے لیکن عین اسی اخلاص ہی کا یہ مقتضا ہے کہ انھیں اس غلط ترین راستہ پر پڑے رہنے سے اپنے امکان بھر روکوں اور جہاں بہت سی کوششیں خانگی طور پر تحریراً اور زبانی دونوں طرح کر چکا ہوں۔ ایک بار پبلک میں انھیں سنا دوں کہ میں ان کی اس سرتا سر غیر اسلامی روش سے متنفر ہوا جاتا ہوں۔ اکابر اہل سنت نے حجاج بن یوسف اور یزید بن معاویہ جیسے کھلے مجرموں کے حق میں کس درجہ احتیاط برتنے کا حکم دیا ہے۔ چہ جائیکہ ایسے معاصرین کے حق میں جن کی زندگیاں ایک اوسط درجہ کے معمولی مسلمان کے معیار سے ہرگز فروتر نہیں۔ بزرگوں کی زبان سے تو یہ ہدایت کان میں پڑی ہوئی گونج رہی ہے کہ غصہ، گرمی، نفرت و بیزاری کے قابل تیرا اپنا نفس ہے باقی دوسرے کلمہ گو کے لئے اس کے اعمال کی زیادہ سے زیادہ حسن ظن سے تاویل و توجیہہ کر کے اس کا اعزاز و اکرام ہی واجب ہے ——— اور اپنے وطن کے حکیم و صوفی شاعر کا شعر تو ضرور ہی خواجہ صاحب کے ذہن میں محفوظ ہوگا ؎

دیوانگی بہانۂ بیگانگی نہیں اپنے سے گر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

لاہور پہنچے دوسرا بلکہ تیسرا دن بھی گزر گیا۔ اور شہر کے سب سے بڑے باخبر "نوائے وقت" والے حمید نظامی کی طرف سے کوئی خیر خبریت نہیں! لاہور والے اس اجنبی اور نووارد مسافر کے حق میں بے طرح مہربان نکلے، کیا عوام اور کیا خواص، کہنا چاہیے کہ ٹوٹ پڑے، کلو کیم پہنچ کر اندر تک جانے اور اسی طرح باہر نکل کر سواری تک پہنچنے میں لوبے لگ جاتے تھے۔ قدم قدم پر مصافحے، کہیں کہیں معانقے اور سب سے بڑھ کر "آٹوگراف" (بہ قلم خود) کی فرمایش کرنے والوں کی یلغار! ـــــ خط خاص کی فرمایش اس سے جس کی بدخطی ضرب المثل بن چکی ہو! سبحان اللہ! سچ کہا مومن دہلوی نے ؎

ان نصیبوں پہ کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا!

ایک ایک دن میں بلا مبالغہ، تیس تیس چالیس چالیس دستخطوں کے اصرار! گویا میں بھی کوئی قومی لیڈر یا ہیرو تھا! یا ایک ننھا منا ایڈیشن خود "قائد اعظم" کا! یہ گھیرنے والے یقیناً زیادہ تر طالب علم ہی ہوتے تھے۔ لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ سب طالب العلم ہی نہ تھے۔ اچھے اور پختے اور معمر لوگ بھی ان میں شامل۔ واقفیت کے لیے حوالہ سب کی زبانوں پر، کیا بڑے اور کیا چھوٹے "نوائے وقت" ہی کا کہ اس میں التزام کے ساتھ ہر ہفتہ "سچی باتیں" اور نوٹ "صدق" کے پڑھتے رہتے ہیں! گویا چرچا گردو پیش

ہر وقت نوائے وقت کا اور خود صاحب نوائے وقت ہی غائب!

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے!

آخر جب ۴، ۵ دن گزر گئے، مدت قیام نصف ہی رہ گئی، اور دل میں فکر بھی تشویش کی حد تک پہنچ چکی، تو ایک روز دوپہر کو یک بیک حمید نظامی صاحب مع اپنے رفیق طریق، آغا شورش کاشمیری کے ہوٹل میں وارد! معلوم ہوا شہر میں تھے ہی نہیں کراچی گئے ہوئے تھے ابھی واپس آئے ہیں۔ اور اب ملاقاتیں بار بار رہیں۔

نوائے وقت اردو روزناموں میں بڑی حد تک ایک معیاری پرچہ ہے۔ زبان صحیح، سلیس، شگفتہ، عوامیت، بازاریت ابتذال سے ہمیشہ بلند نقیب شخصیتوں کا نہیں اصول کا، ناقد پارٹیوں کا نہیں مسائل کا۔ تحریریں نہ جذباتی نہ جدلیاتی بلکہ استدلالی، متانت سنجیدگی و شرافت کا ہر حال میں حامل۔ اس روش اور اس طرز کے پرچہ کا خواص ہی میں مقبول ہونا دشوار ہے چہ جائیکہ خواص کے ساتھ عوام میں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جائے۔ اسے پرچہ کے مالک اور ایڈیٹر کے نصیب کا اعجاز نہ کہیے تو اور کیا کہیے!

گو سیری نہ ہوئی، پھر بھی نظامی صاحب سے ملنا بار بار ہوا اور گفتگوئیں ہر بار اچھی ہی رہیں۔ اپنے اخباری مقالوں کی طرح وہ گفتگو میں

بھی ماشاء اللہ وزن اور توازن دونوں پر قادر ہیں۔ نہ اتنے پر گو کہ

وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

کا نقشہ کھنچ جائے اور مخاطب بیچارہ

یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

کی تصویر بن جائے! نہ ایسے کم گو کہ مخاطب "بور" ہو کر رہے اور اپنے کو بار خاطر سمجھنے پر مجبور ہو جائے!

اور ان سے کچھ ہی کم ملاقاتیں چٹان والے آغا شورش کشمیری سے بھی رہیں۔ "چٹان" کے لفظ سے دھوکا نہ کھایئے۔ کسی قسم کی کرختگی کا گمان بھی دل میں نہ لائیے۔ آدمی باغ و بہار، "پنجابیت" کے نقل کا نام نہ نشان، زندہ دلی کی تصویر، بے تکلفی، بے ساختگی کے پیکر، تخلص شورش اگر اُستاد کا عطیہ ہے تو ان کی مردم شناسی قابل صاد، اگر طبع زاد ہے تو خود شناسی قابل داد!

اے وائے بر شہرے کہ در وفتنہ گرے نیست

پیشے کے لحاظ سے صحافی ہیں۔ لیکن ذوق و عادت دونوں کے لحاظ سے خطیب، صحافت پر غالب خطابت اور خطابت پر غالب انانیت لکھتے ہیں تو گویا میز پر بیٹھے قلم نہیں چل رہا ہے۔ پلیٹ فارم پر زبان اور اعضاء جسم حرکت میں ہیں! مجھ سے ملاقات کی عمر کچھ ایسی طویل نہیں۔ اور پھر راہیں بھی ہم دونوں کی کچھ الگ الگ سی ہیں۔ اس پر بھی ملے تو یوں نہیں کہ جیسے

کوئی غیر و بیگانہ ملتا ہے بلکہ جیسے اپنا اور اپنوں سے بڑھ کر اپنا۔ مخاطبے کی گرمجوشی نے پتہ بھی نہ چلنے دیا کہ گفتگو کسی باہر والے سے ہو رہی ہے۔ نقش یہ جما کہ سامنے کوئی مخلص قدیم ہے بلکہ شاید عزیز قریب ـــــ تصنع و طمع کاریوں کے اس دور میں اخلاص کا یہ جوہر ہزاروں وصفوں کا ایک وصف ہے۔

انھیں کے ہاں ملاقات وارث کامل صاحب سے بھی ہوئی۔ مدتوں مدینہ (بجنور) میں رہے۔ اب منتقل ہو کر "پٹھان" میں آ گئے ہیں اور ہندوستانی سے پاکستانی بن گئے ہیں۔ ان کی زیارت ہندوستان میں نہیں یہیں مقدر تھی ان کی وضع قطع دیکھ کر حیرت بھی ہوئی چہرہ مہرہ ٹھیٹھ اسلامی لباس خاص مشرقی۔ داڑھی مقطع اور نورانی اس حلیہ اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ یہ آج کی صحافت کے ساتھ واللہ اعلم نباہ کیونکر کر رہے ہیں! ابھی تو وارث کامل ہیں۔ خدا کرے کسی دن مرشد کامل کہلائیں۔

صحافت ہی کے دو چار اور نمایندوں سے بھی علیک سلیک رہی، ایک مرشد زادے "نہ سہی" "سالک زادے" سہی عبدالسلام خورشید ایم، اے درسگاہ صحافت کے پرنسپل دوسرے اپنے ہی جوار بلکہ برادری کے جوان محمد زبیر صدیقی سندیلوی ایم، اے نیوز ایڈیٹر پاکستان ٹائمز۔ تیسرے روزنامہ "ڈان" (کراچی) کے نمائندہ لاہور (نام افسوس ہے کہ ذہن میں محفوظ نہ رہا) چوتھے جماعت اسلامی کے صحافی اور اہل قلم کوثر نیازی صاحب۔

چندمنٹ کے لیے انڈین ہائی کمیشن کے دفتر کے پریس اٹاشی سے بھی نیاز حاصل رہا۔ اور کلوکیم کے ایک اجلاس کے عین برخاست کے وقت ایک صاحب نے صاحب سلامت میں سبقت کی، اور اپنا نام ثاقب زیروی بتایا۔ لاہور کے ایک ہفتہ وار کے ایڈیٹر قبل اس کے کچھ اور بات چیت ہو، ہجوم کا ریلا آیا وہ ہم دونوں کو الگ کر گیا۔

لاہور آکر اگر کوئی سالک صاحب سے نہ ملا تو گویا ہندوستان آکر وہ تاج محل آگرہ کی زیارت سے محروم رہا! بقول شخصے۔

"جسے تو نہ ملا اسے کچھ نہ ملا"!

اور ان سے اگر مل لیا تو سمجھیے کہ پھر کسی اور صحافی سے ملنے جلنے کی ضرورت ہی نہ رہی: اپنی ذات واحد سے صحافت لاہور کے مرکز و مرجع بنے ہوئے اور گویا اس میکدہ کے مسلم پیر مغاں!

تیرے ابہام پر موتی ہے تصدق توضیح
تیرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

لاہور جو صحافیوں کا ایک مستقل اکھاڑا بھی ہے کہ آج اس پہلوان نے اسے گرایا اور کل اس پٹھے نے اسے پچھاڑا، ایسے غدار شہر میں کسی کی اُستادی پر سب کا متفق ہو جانا ہے بڑے نصیبے کی بات!

مزاح وخوش طبعی کے ڈانڈے کچھ نہ پوچھیے کہ کیسے دبے پاؤں تفنن وتضحیک سے مل جاتے ہیں اور اچھا خاصا بھلا آدمی ادھر ذرا چوکا ادھر ظریف سے مسخرہ اور بذلہ سنج سے بھانڈ بن گیا! سالک علم مجلس کے ماہران نزاکتوں کے مزاج شناس، صحیح معنی میں ظریف و بذلہ سنج ہیں۔ برجستگی بدیہہ گوئی، ادبیت شوخی ان میں شروع ہی سے رہی تھی۔ عمر، تجربہ کی پختگی اور بالغ نظری نے ان کی شخصیت میں اب اور چار چاند لگا دیے ہیں ــــ اکبر کی حکیمانہ ظرافت کی جھلک کوئی آج اگر دیکھنا چاہے اور ان کی عارفانہ نکتہ رسی اور بذلہ سنجی کا نچوڑ اگر آج آنکھوں کے سامنے لانا چاہے تو کسی حد تک ضرور سالک صاحب اس کے پورا کر سکتے ہیں ــــ ایک جگہ سہ پہر کے نشستے میں جب ہوتے ہوتے مغرب کا وقت آ گیا تو ان آنکھوں نے یہ منظر دیکھا کہ اس مختصر مجمع میں سے دو تین صاحب جو نماز ہی کے لئے نہیں اٹھے بلکہ اُن کے قدم محلہ کی مسجد کی طرف بڑھے تو ان السابقون الاولون میں ایک یہ موٹر نشین حضرت سالک بھی تھے۔ آج مجلس احباب کو چھوڑ کر نماز ہی کے لیے اُٹھنے کا کون روادار ہوتا ہے چہ جائیکہ رخ مسجد کا کرے!

سالک صاحب اب صحافی تو برائے نام ہی سے رہ گئے ہیں البتہ ایک زمانے صحافت کی حیثیت سے سرگرم کار ہیں ــــ پہلوان جب سن سے اتر جاتا ہے تو خود کشتی کا زور دکھانے کے بجائے بہتوں کو داؤ پیچ سکھاتا رہتا ہے ــ

اور اب وہ مصنف و کتاب ساز بھی ہیں لاہور جا کر اگر کسی کو اسلامی لاہور کے ماضی و حال سے مالہٗ و ماعلیہ سے واقف ہونے کا شوق ہو اور اسے رہنما صرف ایک ہاتھ آنا ممکن ہو تو بلا تامل اسے چاہیے کہ وہ رُخ سالک ہی صاحب کی طرف کرے۔

کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا

قال و حال کے درمیان ربط و توافق تو کمتر ہی ہستیوں کے حصہ میں آتا ہے۔ دنیا نام ہی اس کا ہے کہ تعلیم کچھ ہو اور عمل کچھ شورش صاحب کے دسترخوان، جی نہیں دسترخوان کہاں۔ کھانے کی میز نے اس باب میں ریکارڈ قائم کر دیا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس مسافر کی وہ مسافر نوازی نہ فرماتے۔ پچھلے تجربہ کی بنا پر عرض کیا گیا کہ خدا کے لیے ابکی ان تکلفات سے کام نہ لیجیے گا ارشاد ہوا کہ نہیں ابکی بالکل سادگی رہے گی، صرف ایک قسم کا کھانا پیش کیا جائے گا ــــــ دعوت ہوئی چٹان کے بھولے بھالے ناظرین اس خیال میں ہوں گے کہ بس ماحضر پیش کر دیا ہوگا۔ سادگی کے لحاظ سے دعوت شیراز کا نمونہ!

نفس کھانے سے قبل اس کا ایک مستقل ابتدائیہ تھا اور کھانے کے بعد اس کا ایک طویل اختتامیہ! خشک و تر میووں کی شکل میں۔ لذیذ و نفیس

پھلوں کی صورت میں، نمکین بھنے ہوئے مغزیات اور لطیف و شیریں لوزیات کے روپ میں! ـــــ دعوت کے یہ تکلفات کھانوں کے یہ تنوعات ہر کس کے حصہ میں نہیں آتے کسی رئیس اعظم ہی کے حصہ کی چیز ہیں!

کھانے کی میز پہ جب رسائی ہوئی تو رزاق مطلق کی نعمتوں اور بخششوں کا ایک پورا میوزیم (ندرت خانہ) سجا سجایا نظر آیا۔ مرغ کا قورمہ اور مرغ کی بریانی مرغ مسلم اور طرح طرح کے کباب مچھلی اور انڈے کے طرح طرح کے سالن اور اب یاد نہیں کہ اور کیا کیا! ـــــ آج کا دن شہر میں بکری کا گوشت نہ ملنے کا تھا اس کا کیا خوب توڑ سوشلزم کے اس ذہین مبلغ نے سوچ لیا اور سادگی اور کفایت کی کیا چوراہیں اس سرمایہ شکن و سرمایہ بیزار نے نکال لیں!

تلافی کی بھی ظالم نے تو کیسا کی!

حکومت نے بکری کے ذبیحہ پر پابندی یقیناً اس لیے عائد کی ہے کہ شاہ خرچ میزبانوں نے بکروں کو اس طرح بے دریغ کاٹنا شروع کر دیا تھا کہ اس سے نسل کے خاتمہ کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے لیکن کہیں میرے شیر نے دس بیس دعوتیں اور اسی پیمانہ پر کر ڈالیں....... تو ذرا عجب نہ ہوگا کہ حکومت کو مرغ کے نسل کے بھی تحفظ کی فکر ایسی ہی لاحق ہو جائے!

سنا ہے کہ پچھلے سفرنامہ (۱۹۵۵ء والے) میں ان اولو العزمیوں کی روداد پڑھ کر جاپان کے چار خریدار ٹوٹ گئے۔ عجب نہیں کہ ابکی نوبت

آٹھ کی آجائے! لیکن دیکھیے کہیں دھوکا نہ ہو جائے۔ یہ سارا ذکر تو صرف کھلانے کا ہوا نہ کہ "کھانے" کا اور کھانے اور کھلانے کے درمیان جو فرق ہے ظاہر ہے بلکہ جہاں تک خود کھانے کا تعلق ہے مہمان کی شہادت عینی ہے کہ میزبان اس باب میں لاأبالی بلکہ بے نیاز سا واقع ہوا ہے۔

صدق و مدیر صدق کے پرانے اور خصوصی مخلصوں میں ایک خان بہادر شیخ عبدالرحیم ایڈوکیٹ (فیروزپور روڈ) ہیں۔ اب کی بھی حسب توقع وہ طے تو سارے لوازم مسافر نوازی و کرم فرمائی کے ساتھ ۱۹۱۲ء، ۱۹۱۳ء میں ان کا ساتھ چند مہینے کے لیے علی گڑھ میں رہا تھا۔ "ساتھ" غلط استعمال ہوا میں خشک مزاج اور اکل کھرا زندگی کے اس دور میں ساتھی کسی کا بھی نہ تھا یہ کہیے کہ ان کا معاصر تھا۔ یہ اس وقت یونین کے وائس پریسیڈنٹ تھے۔ اور جو جانتے ہیں، بس وہی جانتے ہیں کہ علی گڑھ میں وائس پریسیڈنسی کے کیا معنی ہوتے تھے۔ انگریزی کے اعلا مقرر تھے۔ مولانا محمد علیؒ اور ان کے کامریڈ سے عشق رکھتے تھے اور اسی مناسبت سے حسن ظن مدیر صدق کے ساتھ بھی قائم رکھے ہوئے ——— بیچارے اب آنکھوں سے معذور ہو گئے ہیں، اللہ ان کی بینائی اور عام توانائی دونوں میں بہت برکت عطا کرے ——— مخلصوں کی قدر ہوتی تو ہر سن میں کم و بیش ہے۔ ادھیڑ سن کے بعد بہت بڑھ جاتی ہے ——— عبدالوحید خاں ایم۔اے، ال، ال بی ممبر اسمبلی میرٹھی

ختم لکھنوی تم لاہوری سے ملاقات ابکی بہت دیر میں ہوئی یعنی سفر کے بالکل آخری دن روانگی سے کل دو ڈھائی گھنٹے قبل ملے تو اسی قدیم گرم جوشی بلکہ ہماہمی سے۔ سفر میں باہر گئے ہوئے تھے۔ جزبز ہورہے تھے کہ اب حسب حوصلہ کھلانے پلانے کا کوئی موقع نہیں۔ اسٹیشن تک ساتھ آئے بلکہ اپنے ہی موٹر پر لائے۔ وہ تو پلیٹ فارم پر آتے اور جب تک گاڑی ہی نہ چھوٹ جاتی ساتھ چھوڑنے والے نہ تھے لیکن امرتسر والے پلیٹ فارم پر اب پرندہ بھی پر کہاں مارسکتا ہے۔ بھارت سے آنے جانے والے دونوں مجرم یا قیدیوں کے شمار میں ہیں۔ کسٹم کی سخت گیریاں سلامت رہیں، مخلصوں، دوستوں عزیزوں مہمانوں سب کے درمیان یہی دیوار آہنی حائل! ــــ سفرنامہ کی یہ آخری قسط ہے پڑھنے والے بھی پڑھتے پڑھتے اُکتا گئے ہوں گے اور لکھنے والے کے دل میں الگ یہ چور بیٹھا ہوا، کہ کسی طرح یہ ختم ہو تو پھر دوسرے ضروری اور اہم تر مضمونوں کے لیے گنجائش نکلے!

نئے ملنے والوں میں ایک نام ڈاکٹر جہانگیر خاں کا یاد پڑرہا ہے۔ صدر مملکت کے استقبالیے میں گورنمنٹ ہاؤس میں غالبًا ملاقات ہوئی تھی گو رواداری میں، بالکل ہی سرسری۔ ڈائرکٹر تعلیمات کے عہدۂ جلیل پر فائز مگر غلبۂ تواضع نے ظاہر ہی نہ ہونے دیا کہ یہ بھی کوئی چیز ہیں۔ اور اسی مجمع میں نیاز، آپ کو تو

دردو کوثر والے شیخ محمد اکرام سے بھی حاصل ہوا۔ شوق ان کی زیارت کا بھی عرصہ سے تھا۔ لیکن کیا کہیئے کہ نوبت بس علیک سلیک سے زیادہ کی نہ آسکی سابق آئی، سی، ایس کے ممبر اب بھی کسی بڑے عہدہ پر ہیں۔ نواب صاحب ممدوٹ (سابق گورنر سندھ اور موجودہ وزیر مغربی پاکستان) افتتاح مذاکرہ ہی کے دن شام کو ایٹ ہوم میں ملے اور اپنے معمول کریمانہ کے مطابق خود ہی صاحب سلامت میں پہل کی۔ لیکن قبل اس کے کہ میں پوری طرح پہچان سکوں۔ اور کچھ عذر معذرت پیش کرسکوں منّا صدر مملکت کی طرف سے ان کی پکار ہوئی اور وہ یہ جا وہ جا ہاتھ سے نکل چکے تھے ـــــــ مذاکرہ کے آخری دن جلسہ کی صدارت، پاکستان کے وزیر تعلیمات مسٹر بی کے داس نے کی، یہ غیر مسلم بزرگ یہی نہیں کہ مرکزی وزارت پاکستان کے ایک رکن ہیں بلکہ یہ خیال کر لیا جائے کہ جلسے کی صدارت بھی آخری دن انھیں نے کی، اور ایڈریس بھی اچھا خاصا سنایا، شب میں لاہور کے سب سے بڑے اور شاندار ہوٹل فلیٹی میں دعوت بھی شاہانہ پیمانہ پر انھیں کی طرف سے ہوئی۔ وہاں بھی ملنا جلنا دو ایک نئے صاحبوں سے ہوا۔ جن کے نام بھی اب حافظہ میں نہیں، اتنا یاد ہے کہ ایک ڈاکٹر صاحب تھے اور مولانا ظفر اقبال جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، کھڑے کھانے کے تکلیف دہ دستور سے سابقہ یہاں بھی پڑا۔ اپنے لیے الگ ایک میز پر جگہ نکال لی۔ اور حسن اتفاق سے عزام پاشا مصری بھی وہیں آکر بیٹھے

اور اس طرح چند منٹ کی گفتگو کا موقع ان سے پھر مل گیا۔ قیام لاہور کی آج آخری رات تھی۔ برابر سوچتا رہا کہ دیکھیے اب پھر بھی کبھی آنا نصیب ہوگا؟ ـــــ مولوی محمد اشرف خاں ایم اے (اُستاد پشاور یونیورسٹی) سے ناظرین صدق کچھ واقف ہو چکے ہیں۔ بیچارے غایت محبت و اخلاص سے سفر کرکے پشاور سے آئے۔ دن میں ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ ہمارے معظم و مکرم مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے مرید خاص و مسترشد با اختصاص ہیں۔ اور ان کے صوفیانہ معارف کے شاید سب سے بڑے حامل۔ تبلیغی جماعت کے بھی سرگرم رکن ہیں۔ یورپ تک کا سفر اسی سلسلہ میں کر چکے ہیں۔ حالانکہ بیچارے پیروں سے کچھ معذور سے ہیں۔ حسب توقع تواضع و فروتنی مجسم نظر آئے۔ مزید گفتگو و ملاقات کی ان سے حسرت ہی باقی رہ گئی ـــــ جماعت تبلیغی والوں کی کارکردگی، سرگرمی، قوت عمل پر رشک آتا ہے۔ ہر جگہ اپنی دھن میں لگے ہوئے۔ کراچی کے صدق نواز حاجی محمد یوسف بٹلہ مع اپنے رفیقوں کے اس سلسلہ میں لاہور آئے ہوئے تھے اور کئی دن پہلے ملاقات کر چکے تھے۔ ان کی قوت ایمانی پر رشک آتا ہے کہ بڑی بڑی داڑھیوں اور موٹے جھوٹے کپڑوں کے ساتھ بغیر شرمائے اور جھجکے یورپ اور امریکہ جا جا کر وہاں والوں پر تبلیغ کر آتے ہیں! اور یہ تو بہت ہی اچھا کرتے ہیں کہ اپنا حلقۂ عمل محدود رکھے ہوئے، اپنی ساری سرگرمیاں اسی کے اندر رکھتے ہیں۔ یہ یکسوئی و حدود شناسی

بھی اللہ کی بڑی نعمتوں ہی میں سے ہے۔ مختلف مقصد بجائے خود اعلا سہی، لیکن انسان کی اپنی قوت تو بہرحال محدود ہی ہے ـــــ بڑی تمنا ایک مخلص قدیم و غائبانہ کرم فرما خاں صاحب چودھری نیاز علی خاں صاحب سے ملنے کی تھی پہلے دارالاسلام پٹھان کوٹ کے تھے اب جوہرآباد میں مہاجر تھے بیچارے نہ آسکے اور اپنے بجائے غازی سراج الدین کو بھیجنے پر قناعت کی یہ ایک مرد مجاہد نظر آئے۔

گھوم پھر کر شہر کے مستقلاً دیکھنے بھالنے کی گنجائش ظاہر ہے کہ کہاں نکل سکتی تھی۔ تاہم دس دن کے قیام میں آمد و رفت میں بہت سے حصے تو نظر سے گزر ہی گئے اور بعض حصے بار بار، زندہ دل پر رونق۔ صحت مند شہر کو دیکھ کر جہاں دل خوش ہوتا تھا وہیں یہ حسرت بھی دامن گیر ہو جاتی تھی کہ اب ہم سے کیا؟ ہمارے لیے تو اب اجنبی ہے: نہ پردیس کے حکم میں نہ اپنا:

ہمیں کیا چمن ہے جو رنگ پر ہمیں کیا جو فصلِ بہار ہے!

کاش یہ ۱۹۴۷ء تاریخ میں نہ آیا ہوتا! آیا تھا تو اپنی نوعیت بالکل دوسری ہی رکھی ہوتی! ـــــ کتنے دل توڑ گیا! کتنے زخم اپنے پیچھے چھوڑ گیا!

مسجدیں اچھی خاصی آباد پائیں۔ نماز جمعہ پڑھنے کا اتفاق نیلے گنبد کی بڑی

مسجد میں ہوا۔ اوپر نیچے اندر باہر مجمع سے پٹا ہوا پایا اور باہر موٹروں کی تعداد سے اندازہ ہوا کہ نمازیوں میں موٹر نشینوں کی تعداد بھی ماشاء اللہ خاصی بڑی ہے اور بے حیائی کے بھی وہ منظر دیکھنے میں نہ آئے جنھیں خود لاہور ہی کے اخبارات نے اتنا اچھال رکھا ہے۔ باقی یہ تو ظاہر ہی ہے کہ فرنگی تمدن کے اثرات سے کوئی بھی بڑا شہر ہو بچ کیونکر سکتا ہے۔ لیکن اس میں تخصیص لاہور کی نہ رہی کراچی اور ڈھاکہ، دہلی اور لکھنؤ، بمبئی اور کلکتہ سب اپنے اپنے مرتبۂ ترقی کے لحاظ سے ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

ابھی قیام لاہور میں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ ہندوستانی ڈپٹی ہائی کمشنر کے دفتر کے ایک غیر مسلم اہلکار نے مہربان ہو کر آمد و رفت شروع کی کمیشن کا ارادہ تو یہ تھا کہ ہندوستانی نمائندوں کو بعض اور نمائندوں کے ساتھ اپنے ہاں ایٹ ہوم دے اور ایک محض اتفاقی مجبوری سے یہ ارادہ عمل میں نہ آسکا ـــــ اب کیا بتایا جائے کہ اشتراک و اتحاد کے ایسے سارے منصوبوں سے دل کو کس درجہ خوشی ہوتی ہے ـــــ آخری دن جلسہ کے وقت کے بعد کمیشن اپنے سکریٹری کے ہمراہ جانا ہوا۔ پریس اٹاشی صاحب سواری لے کر لینے آگئے تھے۔ ڈپٹی ہائی کمشنر بھنڈاری صاحب بڑے لطف و اخلاق سے پیش آتے رہے، چائے، کافی، منگائی اور بھی ہر طرح خاطر داریاں کیں ـــــ دل یہ خیال کر کے خون کے آنسو روتا ہے کہ اگر خدانخواستہ دونوں ملکوں کے

درمیان نزاع اور بڑھ گئی تو کیا انجام ہوکر رہے گا خصوصاً ہندی مسلمانوں کا! مصالحت و مفاہمت جب ادھر پنڈت جواہرلال کے اور اُدھر ملک غلام محمد مرحوم کے زمانہ میں نہ ہوسکی تو بعد کو امید ہی کیا ہوسکتی ہے۔

اپنے عزیزوں اور ہم وطنوں کی بھی ایک تعداد اب لاہوری ہوگئی ہے میجر ڈاکٹر خلیل الرحمان عزیز ہونے کے ساتھ ساتھ پرانے میزبان رہ چکے ہیں۔ ایکی میزبانی تو ان کے بس میں نہ تھی۔ پھر بھی کئی میل دور رہ کر (انکی کوٹھی مانٹگومری روڈ۔ کنٹونمنٹ کا فاصلہ ہمارے ہوٹل سے ۵-۶ میل سے کم تو بہرحال نہ ہوگا) جتنی خاطریں ان سے ممکن تھیں کیے گئے۔ ماشاءاللہ بڑے مذہبی ہیں۔ چہرہ پر داڑھی اور سر پر پٹے رکھلائے ہوئے کون "میجر" ہوگا؟ اور خاطرداریوں کے لحاظ سے ایسا ہی کچھ حال سید ناظم علی ایم اے دریابادی کا رہا۔ یہاں سکریٹریٹ کے محکمہ سول سپلائی میں ہیں اور ہوٹل سے بہت دور پونچھ ہاؤس کے قریب کسی کالونی میں رہتے ہیں۔ چلتے وقت ان دونوں نے جو ناشتہ ساتھ کردیا اس نے بڑا کام دیا۔ اخلاص کی آمیزش تو ہر تلخ کو شیریں بنادیتی ہے۔

درمحبت تلخہا شیریں شود!

چہ جائیکہ جب کھانے بھی حسن طباخی کی پوری رعایتوں کے ساتھ تیار کیے گئے ہوں گے ــــــ اور انھیں اپنوں میں ایک نام درگاہ بانسہ (ضلع بارہ بنکی)

کے پیرزادے سعید میاں صاحب (سید سعید الحسن رزاقی) کا رہا جاتا ہے، آئے اور یگانگت کا حق ادا کر گئے۔

روداد سفر لیجیے ختم ہورہی ہے۔ ایک دن اور وہ بھی عنقریب اسی طرح سفرِ حیات کا خاتمہ ہونا ہے اور اس کی روداد اس سے ہزار درجہ زیادہ تفصیل و تحقیق کے ساتھ خود مسافر کے نہیں اس کے دو ہمزاد رفیقوں کے ہاتھ سے ہر آن اور ہر لحظہ قلمبند ہورہی ہے مایلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید اس کے لیے دعا صرف یہ کرنا ہے کہ وہ داہنے ہاتھ کی طرف سے وصول ہو۔ واما من کتابہ بیمینہ الخ

—— یہ روداد تمامتر ناتمام رہے گی، اگر اس میں ذکر ان تین صاحبوں کا صراحت نہ ہو، جو کہنا چاہیے کہ اپنا سارا وقت اس اجنبی کی مسافر نوازی کے لیے وقف کیے ہوئے تھے۔

(۱) ایک تو معلوم و معروف اہل قلم مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی خیرآبادی ثم پاکستانی۔

(۲) دوسرے پبلک کے لیے گمنام شفقت جیلانی خاں جالندھری ثم لاہوری (سندرداس روڈ پر کہیں رہتے ہیں)

(تیسرے پبلک کے لیے غیر معروف حبیب الرحمان خاں صاحب ساکن گوجر گڑھی ضلع مردان۔

رئیس احمد جعفری تو خیر آج سے نہیں مدت دراز سے عزیزوں کے حکم میں ہیں۔ اور شفقت جیلانی بھی صدق کے بڑے پرانے قدر دانوں میں ہیں بلکہ سالہاسال ہوئے اسی صدق ہی کے سلسلہ میں پنجاب سے لکھنؤ تک کا سفر اختیار کر کے مجھ سے مل بھی چکے ہیں۔ تیسرے صاحب ذاتی طور پر اجنبی محض تھے۔ صدق ہی البتہ پڑھتے رہے ہیں۔ بظاہر ان کو سرحدی اُجڈ قسم کا انسان ہونا چاہئے تھا، مگر یہ "خشک" محض ہونے کے بجائے بڑے "تر" نکلے اور کرخت ہونے کے بجائے سرتاسر ملائم! عجیب عجیب طرح یہ خدمتوں میں لگے۔ رہے اور بڑی بات یہ کہ بڑی خوش فہمی اور مجھ بدمزاج کے مذاق کی پوری رعایتوں کے ساتھ! ــــــ اخلاق و قدریت کے ساتھ خوش فہمی اور عقل سلیم بھی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے یہ تینوں اگر اپنا کام کاج چھوڑے گھنٹوں میرے ساتھ نہ لگے رہتے تو خدا جانے چھوٹی بڑی کتنی دقتوں کا سامنا رہتا۔ اور میرے رفیق عزیزی محمد ہاشم قدوائی سلمہ ایم اے (لکچرر شعبۂ سیاسیات مسلم یونیورسٹی) جنھیں بہ طور سکریٹری ساتھ رکھا تھا کی ساری کوششیں ادھوری اور ناکام رہ جاتیں۔ سکریٹری کا کام علاوہ اور بہت سے کاموں کے ایک یہ بھی تھا کہ جو عنایت فرما صبح تڑکے منھ اندھیرے نماز فجر کے معًا بعد ہی ہوٹل میں آکر گھیر لیتے تھے انھیں کسی طرح معذرت کر کرا رخصت کریں۔!

خیر اتنے صاحبوں کا شکریہ تو نام بنام ادا ہو چکا، بیسوں نہیں پچاسوں

بلکہ سینکڑوں چھوٹے بڑے اللہ کے بندے (اور ان میں زیادہ تر طلبہ ہی تھے) ابھی اور باقی رہ گئے ہیں جو اپنی محبت اور حسن ظن کا مظاہرہ کلوکیم کے اندر اور باہر مسجدوں میں قیام گاہ پر اور مختلف مقامات پر برابر کرتے رہے ان میں سے بہتوں کے نام اول تو دریافت ہی نہ ہوئے اور جو ہوئے بھی تو ان کا یاد رکھنا بس کی بات نہ تھی ــــــ اجر انشاء اللہ ان سب کو مل کر رہے گا اور وہ ہر انسانی اور اخباری شکریہ سے بڑھ کر ہے۔

دیکھتے دیکھتے واپسی کی تاریخ ۹ جنوری آگئی اور لاہور چھوڑنا پڑا ہوٹل چھوڑتے وقت یاد ہوٹل کے ان ویٹروں (بیروں) کی بھی آتی رہی، جو یوپی کے باشندے ہیں کوئی ضلع بریلی کے، کوئی ضلع میرٹھ کے، ۱۹۴۷ء کی مسلم گردی میں وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور ہوئے اور اب ہوٹل میں بیراگیری کرکے اپنی زندگی کے دن یا اپنی قسمت کا نوشتہ پورا کر رہے ہیں! ــــــ گاڑی کا وقت دوپہر کے بعد کا تھا لیکن وہی کسٹم کے مرحلہ سے گزرنے کے لیے کم سے کم دو گھنٹہ قبل پہنچ جانا ضروری تھا۔ دونوں مملکتوں کے حکام والا مقام جب تک عام لوگوں کی طرح ریل پر سفر کرکے ذاتی تجربہ نہ حاصل کریں سمجھ ہی نہیں سکتے کہ معمولی مسافروں پر کیسا گزر کر رہتی ہے۔

کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

مخلصوں کی بڑی تعداد اسی لیے اسٹیشن آنے سے باز رہی کہ بہرحال امرتسر والے پلیٹ فارم تک پہنچنا تو نصیب ہی نہ ہوگا صرف دوچار لوگ آئے اور ان بیچاروں کو بھی مجرموں اور قیدیوں کے خاردار جنگلے کے ادھر ہی رک جانا پڑا۔ صرف ایک دو سخت جان ایسے نکلے جو اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر پھاند پھوند کر اندر آگئے۔ دل ڈر رہا تھا کہ دیکھیے تلاشی میں کیا کیا تو ہنیتں آتی ہیں۔ لیکن میجر ڈاکٹر خلیل کا ذاتی اثر کام آگیا۔ اور اس مرحلہ سے دم بھر میں نجات مل گئی —— دل کو بے اختیار یاد آگیا کہ آخرت کی "چیکنگ" کا سچ بھی اگر رحمت وفضل شامل حال رہا اسی طرح دم بھر میں پانی بن سکتا ہے اور آخر والنازعات غرقاً کی وعید کے ساتھ ہی والناشطات نشطاً کی بشارت بھی تو موعود ہی ہے —— خواجہ محمد شفیع کا ذکر شروع میں آچکا ہے کہ ورود لاہور کے وقت وہ کیسے فرشتۂ رحمت ثابت ہوئے آج بھی ان کی آمد کا پختہ وعدہ تھا اور اس کا بڑا سہارا تھا۔ لیکن ایک اتفاقی معذوری سے انھیں آنے میں دیر ہوگئی اور اللہ میاں نے کام ڈاکٹر خلیل کے ذریعہ سے نکال دیا۔ پھر بھی وہ گاڑی کی روانگی سے خاصا قبل مع انھیں عزیز کے آگئے جو محکمۂ کسٹم سے متعلق ہیں اور ان کا آجانا تقویت مزید کا باعث تھا۔ گاڑی چلی لاہور نگاہوں سے دور ہوا۔ اور امرتسر کا پلیٹ فارم آگیا اور جاتے ہوئے جن مصیبتوں کا سامنا ہوا تھا ان سے ہو کر ایکبار پھر گزرنا پڑا! ——

اور آخر وہ وقت بھی کٹ گیا جس طرح اللہ ہر وقت کو کاٹ دیتا ہے۔ دوسرا دن ہوا۔ اور ۱۰ر جنوری کی دوپہر کو اپنے قدم پھر لکھنؤ کے پلیٹ فارم پر تھے۔

جی میں تھا کہ روداد سفر کا خاتمہ شکر کے ترانوں اور مسرت کے زمزموں پر کیجئے۔ اور لاہور والوں کے لطف و محبت سے متاثر ہو کر قدرتاً ارادہ و حوصلہ پھر ایک بار سفر کا کیجئے لیکن کیا کیا جائے کہ اور سارے لطف اور مسرتیں ایک طرف اور پھر پاسپورٹ اور ویزا اور دہرے بلکہ چوہرے کسٹم کی لعنتیں دوسری طرف! یہ تلخیاں اُن شیرینیوں پر کہیں بھاری! اور مسافر بجائے مسرت کے زمزمے شکر کے ترانے گنگنانے کے بے مزہ ہو کر آیندہ ایسے سفر سے پناہ مانگنے کی دعا میں مصروف! بہ قول شخصے۔

ہم پھرے کعبے سے اے قبلہ تو ہندو ہو کر!

(صدق جدید ۱۴ر فروری ۱۹۵۶ء)

مذاکرہ عالمیٔ اسلامی

اپنا بچپن تھا کہ مولانا شبلیؒ کے سفرنامہ مصر و روم و شام کے شروع میں "اورنٹیلسٹس کانفرنس" کا نام پہلی بار نظر سے گزرا اور نٹیلسٹ کا ترجمہ مستشرق رائج تھا۔ اور مراد ایسے شخص سے ہوتی تھی، جو گو ہو مغربی یا فرنگی لیکن مطالعہ مشرقی (خصوصاً اسلامی) علوم و فنون کا خوب کر چکا ہو۔ اور اس حیثیت سے شہرت حاصل کئے اور نام پائے ہوئے ہو۔ شرقیات یا اسلامیات کے ان مغربی ماہرین کے جلسے ہر تھوڑی مدت کے بعد یورپ کے کسی شہر میں ہوتے رہتے تھے۔ کیا خبر تھی کہ کبھی یہ خواب حقیقت بن کر سامنے آئے گا اور عمر کے کسی دور میں بھی اس قسم کے کسی جلسہ میں بھی شرکت اپنے حصہ میں آئے گی!

پچھلے مہینے پاکستان نے لاہور میں جو عظیم الشان عالمی جلسہ پنجاب یونیورسٹی کی دعوت پر منعقد کیا وہ کچھ اسی نوعیت کا تھا۔ سوا اس فرق کے کہ اس میں اسلامیت مستشرقین کی عام کانفرنسوں سے کہیں زائد تھی اور اسلامی رنگ اس میں ہر اعتبار سے نمایاں تھا ـــــ جن لوگوں نے اسے ایک قسم کی جمعیۃ العلما یا علما دین کا مجمع سمجھ رکھا تھا انھیں اپنی توقعات میں سخت مایوسی ہوئی ہوگی لیکن اس میں غلطی خود ان توقع قائم کرنے والوں کی تھی۔ کانفرنس کے بانیوں، داعیوں

اور شرکا مجلس کی نہیں ۔

دعوت نامے پاکستان کے اندر اور باہر صدہا اہل علم کے نام جاری کیے گئے۔ اور ان میں عموماً اور بیشتر اہل فضل و کمال کے ساتھ کچھ نااہل بھی مجھ جیسے شامل ہو گئے۔ باہر سے آنے والوں میں جہاں تقریباً ہر مسلم مملکت مثلاً مصر، شام، عراق، ترکی، حجاز، ایران، افغانستان، یتونس انڈونیشیا وغیرہ کے دو دو چار نمائندے تھے، وہیں امریکا، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، کناڈا جرمنی، اٹلی وغیرہ کی نمائندگی وہاں کے اکابر فضلا کر رہے تھے ہندوستان سے ۷،۶ اشخاص مدعو تھے ان میں سے کئی نہ پہنچ سکے اور ان میں سب سے زیادہ افسوسناک غیر حاضری مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھنوی کی تھی۔ مدعوین میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ (حیدر آبادی ثم فرانسادی) بھی تھے۔ مگر سنا ہے کہ دعوت نامہ ان کے پاس اس قدر تاخیر سے روانہ ہوا کہ وہ کوئی صورت قبول دعوت کی نہ نکال سکے۔ اور آنکھیں ڈاکٹر عبدالحق افضل العلماء (مدراس) اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی (صاحب بُرہان) کو تلاش ہی کرتی رہ گئیں۔ حاضرین میں بڑی تعداد قدرۃً خود پاکستان کے اہل فکر و اہل قلم کی تھی۔ بیرونی مہمانوں کی تعداد سوا سو سے کم کسی حال میں نہ ہوگی، ان کے مصارف سفر کے انتظام اور ان کے ایک پورے عشرہ تک قیام و مہمانداری میں مجموعی مصارف کئی لاکھ سے کیا کم ہوئے ہوں گے اور پھر مقالات کے ترجمے

اور طباعت وغیرہ میں پنجاب یونیورسٹی نے دل کھول کر جو خرچ کیا اس کی میزان الگ!

مجلس کا باضابطہ نام الندوۃ العالمیۃ للاسلامیات یا انٹرنیشنل اسلامک کالوکیم CULLOQUEMM تھا۔ افتتاح صدر جمہوریہ پاکستان کے ہاتھ سے ۲۹ دسمبر کے سہ پہر ہی کو ہو گیا تھا۔ ۳۰ دسمبر سے ۸ جنوری تک پورے دس دن۔ اجلاس دو دو ہوتے رہے۔ صبح کے اجلاس (۹½ تا ۱۲½) میں مقالات عربی یا انگریزی یا "نادرًا" اردو میں پڑھے جاتے تھے۔ اور سہ پہر کے اجلاس (۳ تا ۵) میں ان پر نقد و نظر ہوتی تھی۔ گو یہ آخری اجلاس کبھی وقت پر ختم نہ ہو سکا اور ہمیشہ وقت سے زائد ہی طول پکڑتا رہا، ایک دن صبح کے اجلاس کا ناغہ بھی ہو گیا۔ مصر کے ایک ممتاز نمائندے ڈاکٹر عبداللہ دراز بیچارے چند گھنٹوں کی بیماری کے بعد ۷ جنوری کو واصل بحق ہو گئے۔ اور ۷ کا پہلا اجلاس ان کی تعزیت میں ملتوی رہا۔ مقالے کوئی ۷۰، ۵۰ کی تعداد میں پڑھے گئے ہوں گے۔ عربی مقالوں کے ترجمے انگریزی اور انگریزی مقالوں کے عربی میں ملتے تھے اور زبان بھی ہر مقالہ کا خلاصہ عربی یا انگریزی میں بیان کر دیا جاتا تھا۔ کم و بیش یہ انتظام اردو کے لیے بھی تھا۔ پھر بھی اُردو کو وہ جگہ نہ ملی جس کی وہ مستحق تھی۔ حد یہ ہے کہ خود پاکستانیوں نے بھی (بجز ایک مولانا مودودی کے) اس کے حق کا خیال نہ کیا۔

مقالات ومباحث کے عنوانات اس قسم کے تھے۔

۱۔ ثقافت اسلامی۔

۲۔ اسلام کا رویہ دوسرے مذہب و ادیان کے ساتھ۔

۳۔ موجودہ سائنس اور اسلامی مسائل۔

۴۔ اسلام کا زرعی و معاشی نظام۔

۵۔ امن عامہ اور اسلام۔

پانچ عنوانات اسی طرح کے اور تھے۔

پاکستان کے علماء کی نمایندگی مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی ثم کراچوی مولانا مودودی۔ مولانا داؤد غزنوی۔ مولانا امین احسن اصلاحی مولانا نور الحق ندوی پشاوری۔ مولانا محمد یوسف بنوری اور مولوی ظفر احمد انصاری ایم اے کر رہے تھے۔ جدید طبقہ کی ترجمانی ان حضرات کے حصہ میں آئی جسٹس محمد شریف (سپریم کورٹ) چیف جسٹس ایس اے رحمٰن (ہائی کورٹ) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور پرویز صاحب کراچی کے ڈاکٹر رفیع الدین اپنی ڈگریوں کے لحاظ سے تو جدید ہیں لیکن اپنے عقائد و خیالات کے اعتبار سے قدیم۔ سندھ کے ڈاکٹر داؤد پوتا سابق ڈائرکٹر تعلیمات، اور ڈاکٹر محمود حسین خاں کا شمار بھی انھیں میں کیا جائے اور مشرقی پاکستان سے ڈاکٹر محمود حسین (صدر پبلک سروس کمیشن) کے سرکردگی میں ڈھاکہ اور راج شاہی یونیورسیٹیوں کے اساتذہ اور "دکاترہ" کی ایک

پوری "ٹیم" ان کے علاوہ تھی۔

یورپ اور امریکا کے اکابر فضلاء کی خاصی تعداد موجود تھی۔ امریکا کے مشہور ومعروف پروفیسر ہٹی۔ فرانس کے بوڑھے پروفیسر سنیان MASSIGNAN ہالینڈ کے پروفیسر ڈربوز DURRAS کناڈا کے پروفیسر اسمتھ برطانیہ کے مس لیمبٹن (LAMBTAN) اٹلی کے ڈاکٹر بوسانی (BUSSANi) وغیرہم۔ مسلم ممالک کے نمایندے بھی عموماً بہت اچھے تھے۔ مصر وشام حجاز ومراقش وایران کے وفدوں میں شاید وہاں کے بہترین نمایندے شامل تھے۔ شیخ ابوزہرہ بہجت البیطار اور شیخ جمال اور فرزان فرا در سب سے بڑھ کر عبدالوہاب عزام کی تقریریں اور شخصیتیں بھولنے والی نہیں ہیں یہ لوگ علوم جدیدہ سے خوب واقف کے باوجود ان سے ذرا بھی مرعوب نہ تھے اور جہاں اپنے یا پرایوں کسی کی بھی زبان سے کوئی زد اسلام پر پڑتے دیکھتے پوری قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے اور برجستہ جوابی تقریر میں اس مغالطہ کی پردہ دری کر دیتے۔ مثلاً ایک مستشرق نے اپنی تقریر میں یہ کہا تھا کہ عصر حاضر میں اسلامی تعزیرات پر شاید نظرثانی کرنے کی ضرورت ہو گئی ہے۔ اس کے جواب میں معاً ایک اسلامی ملک کے نمایندے نے کھڑے ہو کر کہا کہ مشاہدہ وتجربہ سے جواب لیجئے کہ اسلامی تعزیرات آج بھی جہاں کہیں باقی ہیں وہاں جرائم کی شرح رفتار کیا ہے اور اس کا مقابلہ بڑے سے بڑے ترقی یافتہ ملک سے کر دیکھئے۔

اس طرح ایک اور افسوسناک تقریر خود ایک پاکستانی جوان (مقیم القرہ) کی تھی اس پر اتنی لے دے ہوئی کہ مقرر کو اس پر آمادہ ہونا پڑا کہ روداد میں یہ تقریر بجنسہ نہیں بلکہ نظرثانی اور دو ممبروں کی مقرر شدہ کمیٹی کی منظوری کے بعد ہی درج ہوسکے گی۔

یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ کار روائیاں ساری ہی شروع سے آخر تک اسلامی نقطہ نظر کے مطابق تھیں۔ قابل اعتراض متعدد چیزیں تھیں پھر بھی بحیثیت مجموعی غلبہ خیر کا شر پر رہا۔ لڑکیوں اور عورتوں کی خاصی تعداد تماشائیوں میں تھی اور پھر جو برقع پوش نہ تھیں، ان میں کوئی نمایاں بے حیائی پائی نہیں گئی۔ البتہ یہ حال صرف کانفرنس کے اجلاسوں بھر رہا۔ ایک روز جب شب میں ڈنر ہوا، تو وہاں خواتین ٹھیٹھ مغربی انداز پوشش و تزئین کے ساتھ جلوہ نما تھیں۔ اسی شب میں ڈنر کے بعد جو دستاویزی فلم ترقی پاکستان سے متعلق دکھائی گئی (اور اس کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔) اس میں ملک کے قدرتی منظروں، دریا، پہاڑ وغیرہ اور عمارتوں اور فوجی ترتیوں کے ساتھ ترقی یافتہ پاکستانی خاتون کے بھی نظارے بہت سے کرائے گئے اور فرنگی مہمانوں کے سامنے خواہ مخواہ اور تکلیف دہ حد تک اسلامی ننگ و ناموس کی نمائش کرائی گئی۔

صبح کے اجلاس کا آغاز قرآن پاک کی تلاوت سے ہوتا تھا مصر شام

پاکستان وغیرہ بلکہ روس (تاشقند) کے بھی ایک خوش الحان قاری نے تلاوت کی اور مستشرقین بھی ادب کے ساتھ کھڑے ہو کر اس کی سماعت کرتے رہے۔ سہ پہر کے وقت اجلاس میں جو وقفہ ۱۵، ۲۰ منٹ کا ہوتا تھا۔ وہ چائے کے نام سے ہوتا تھا کاش بجائے اس کے نماز عصر کے نام سے ہوتا! افتتاح کے دن صدر جمہوریہ کی آمد کی گھاگھمی اور سرکار دربار کے لوازم متعلقہ میں ہر وقفہ اتنی دیر کر کے ہوا کہ نماز عصر کا وقت بھی گویا نہیں باقی رہ گیا تھا ـــــ اُردو پاکستان کی تو ملکی و سرکاری زبان ہی ہے۔ اور یوں بھی عالم اسلامی کے لیے بعد عربی کے درجہ اسی کو مل سکتا ہے۔ لیکن مذاکرات کے سلسلہ میں عربی کے ساتھ دوسری زبان جو حکمراں نظر آتی تھی وہ انگریزی تھی۔ اُردو کا درجہ بہت ہی گھٹا ہوا نظر آیا۔ گو ضروری نہیں کہ اُردو کی یہ ناقدری دانستہ اور ارادی ہی ہو۔

جلسوں میں ایک افسوسناک کمی جو مسلم ملکوں کے نمایندوں میں خاص طور پر محسوس ہوئی وہ انضباط (ڈسپلن) کی کمی تھی۔ لیکچروں یا مقالوں کے لیے وقت کی تعین ناگزیر تھی، لیکن ایکبار نہیں۔ بار بار یہ ہوا کہ مقررہ ۱۵ منٹ ختم ہوگئے۔ اور صدر جلسہ گھنٹی پر گھنٹی بجائے جاتے ہیں۔ لیکن شامی، مصری، ایرانی مقرر صاحب اپنی ہی سنائے چلے جا رہے ہیں۔ یورپ و امریکہ والے اس سے کیا تاثر لے کر گئے ہوں گے؟ ـــــ تصویر کشی کی بلا بس اس طرح نازل

ہوئی کہ معاذ اللہ۔ ہر ہر رُخ سے کہنا چاہیے ہر ہر منٹ پر کیمرہ اپنا کام کرنے کو تیار رہتا۔ تصویرکشی اگر جائز ہو بھی تو کم سے کم اس کی بہ کثرت وافراط تو ضرور دل کو اکتا دینے والی اور طبیعت پر بار بن جانے والی تھی ـــــ اور فوٹوگراف سے بس کچھ ہی کم حملہ" اٹوگراف " والوں کا تھا! ہر ہر لڑکا اور ہر ہر لڑکی نوٹ بک لیے موجود کہ اس پر کچھ لکھ ضرور دیجیے اور اگر کچھ نہیں تو کم سے کم اپنا اسم شریف ہی! اس ہجوم و ہنگامہ میں یہ بے محل فرمایش جتنی تکلیف دہ تھی، اس کا اندازہ بھی باہر والوں کو نہیں ہو سکتا۔

سوا سو ڈیڑھ سو مہمانوں اور وہ بھی ملک ملک سے آنے والوں کے آرام و آسایش کا پورا انتظام بہت آسان نہ تھا۔ خامیاں اور فروگزاشتیں اس باب میں بہت سی رہیں اور مہمانوں کو شکایت پیدا ہو جانی کچھ بیجا نہ تھی۔ پھر بھی انتظام بہ حیثیت مجموعی غنیمت ہی کہا جائے گا۔ گو کُھلا ہوا گوشۂ چشم مغربی مہمانوں ہی کی طرف زیادہ تھا۔ ان کے لیے ہوٹل اور قیام گاہیں اعلیٰ سے اعلیٰ تھیں۔ اور ہم مشرقی طرز والے مہمانوں کا شمار درجۂ دوم میں تھا۔ داعی جلسہ میاں افضل حسین صاحب (وائس چانسلر) کو اخباری روایتوں کے مطابق بالکل "صاحب" قسم کا اور "متکبر" انسان ہونا چاہیے تھا۔ تجربہ سے یہ شکایت بہت مبالغہ آمیز معلوم ہوئی۔ ان کے مددگار محمد افضل ایم اے اور عزیز بٹ صاحب اور مولانا علاء الدین اور پروفیسر امتیاز علی صاحب

مستعدی سے دوڑ دوڑ کر کام کر رہے تھے اور ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شفیع صاحب عالمانہ وقار اور سنجیدگی کی تصویر تھے۔

مدراس

سفر مدراس (۱۹۵۸ء)

سیر و سفر کے شوق کا بھی ایک سن ہوتا ہے جس طرح کھیل کود کا شوق بچپن کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے جوانی ختم ہونے پر سفر ایک "بار" معلوم ہونے لگتا ہے اور ہر قسم کے سامان راحت و انتظام آسایش کے باوجود بھی طبیعت سفر کے لئے آمادہ نہیں ہوتی۔ سوا اس کے کہ کوئی ضرورت ہی اس کی آپڑے اور کوئی بہانہ سفر کے ٹالنے کا چل نہ سکے۔ عمر کی اس منزل پر پہنچ کر فانی بدایونی کے اس شعر کے معنی روشن ہوتے ہیں ؎

مئے گلگوں تھا سادہ پانی بھی
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی!

عمر کے اس پچھلے نہیں اس سے پہلے حصہ میں وطن سے نکل کر جنوب ہند میں بڑے سے بڑا بھی سفر جو کیا اس کی آخری منزل حیدر آباد رہی۔ اس سے آگے جانے کا اتفاق جب اس زمانے میں نہ ہوا تو اب اس کی کیا توقع ہوسکتی تھی؟ ——— سن اور اس کے مقتضیات سے بھی کہیں بڑھ کر موثر امتناع سفر میں اب اپنے پڑھنے لکھنے کے مشغلے ہو رہے ہیں۔ تحریر کا کام کھانے پینے کی طرح گویا جزو زندگی بن چکا ہے اور وہ ہے اس نوعیت کا کہ اس کے لئے ہر وقت ایک طرف ایک مستقل کتب خانہ کی محتاجی اور دوسری طرف یکسوئی کے لئے مجمع سے علیحدگی اور ایک حد تک گوشہ گیری ناگزیر۔ سفر سے

مانع ہونے کے لیے عذر طبعی تو موجود تھا ہی، اب اس سے کہیں زیادہ قوت و شدت کے ساتھ اس پر یہ عذر عقلی مستزاد ـــــــ رہے پبلک لکچر، تقریر وعظ کی غرض سے سفر۔ تو تجربہ نے خوب بتا دیا کہ دوسروں کے لیے جو کچھ بھی ہو، بہر حال اپنے لیے یہ دونوں زندگیاں نبھ نہیں سکتیں، یا تو شہروں شہروں پھر کر دھوم تقریروں کی مچائی جائے اور کاغذ و قلم کے مشغلے کو تہ کر کے رکھ دیا جائے اور یا پھر سکون، یکسوئی کے ساتھ جلسوں اور جلوسوں کے شور و شغب سے الگ قلمی ہی خدمت کر لی جائے۔

ایک بڑی ہی درد انگیز و حسرت ناک مثال مولانا محمد علیؒ کی پیش نظر رہی ان کی سی بے مثل صلاحیتوں کا شخص پبلک جلسوں میں پڑ کر کسی ٹھوس کام کا باقی نہ رہا۔ اور اپنے قلب و دماغ کی مستقل یادگار گویا کوئی ایک بھی ملک وملت کے لیے نہ چھوڑ گیا۔

تحریر و تقریر دونوں کے راستے بالکل الگ الگ ہیں اپنے لیے خوب سوچا کہ کون سی راہ اختیار کی جائے۔ شروع ہی سے اپنے کو مناسبت تحریر ہی کے رنگ سے تھی۔ مضمون نگاری کہنا چاہیے کہ بچپن ہی سے شروع کر دی تھی فیض صحبت بھی ایسے ہی لوگوں سے زیادہ اٹھایا جو اصلاً اہل قلم تھے۔ مولانا شبلیؒ، حضرت اکبر، وغیرہ۔ عمر کا صرف ایک دور ایسا آیا جب مولانا محمد علیؒ کے ذاتی اثر و اصرار سے تحریک خلافت کے جلسوں میں نمایاں حصہ لیا

لیکن یہ دوچار ہی پانچ سال بعد ان کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا اور رفتہ رفتہ یہ عہد کر لیا کہ صدارت وغیرہ الگ رہی پبلک جلسوں میں (خواہ وہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی) نفس شرکت سے احتراز رہے گا اور شدید اصرار، تقاضے اور دباؤ کے بعد بھی۔ بحمد اللہ اسی عہد کو نباہنے کی توفیق رہی استثنا کی خانیں بس خال ہی خال ملیں گی۔ ورنہ ڈر یہ لگا ہوا تھا کہ اگر ایک بار بھی کسی کی مروت میں یا اثر سے اس عہد کو توڑا تو دوسرے اسی کو سند پکڑ لیں گے اور پھر جان بچانے کا کوئی حیلہ حوالہ کارگر نہیں ہوگا۔ عادت رفتہ رفتہ طبیعت ثانی بن جاتی ہے۔ ایک عمر کی ارادی مشق کے بعد اب یہ حال ہو گیا کہ جلسہ، جلوس، استقبال گل پوشی، زندہ باد کے نعروں کے نام تک سے وحشت ہونے لگی ہے۔ ان کی دہشت دل میں سما گئی ہے۔ ان کے تصور ہی سے ہول ہونے لگتا ہے۔

اس صورت حال کے بعد احتمال بھی اس کا کسی کو ہو سکتا تھا کہ عمر کے پینسٹھویں یا چھیاسٹھویں سال میں ایک سفر حیدرآباد سے بھی آگے اور بہت آگے کا اختیار کرنا ہوگا۔ لیکن ارادۃ اللہ غالبۃً۔ وہ لطیف وخبیر جب کوئی کام بندوں سے کرانا چاہتا ہے تو اس کے سامان بھی غیب سے عجیب عجیب پیدا کر دیتا ہے۔

مدت ہوئی سن گن ملی تھی کہ مدراس کے افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق

اپنے حسنِ ظن سے کام لے کر کسی مذہبی موضوع پر علمی لکچر اس نا اہل سے شہر مدراس میں دلوانا چاہتے ہیں۔ جیسے علمی لکچر ایک زمانے میں سر اقبالؒ اور پھر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ایک ایک ہفتہ کے فصل سے کئی ہفتوں تک دیئے تھے۔ بعد کو پھر کچھ خبر نہ ملی۔ البتہ یہ سننے میں آیا کہ جس فنڈ سے یہ لکچرار باہر سے بلائے جاتے تھے وہ فنڈ مدت ہوئی ختم ہو چکا۔ اور اب باہر سے کسی کے بلائے جانے کا احتمال نہیں۔ پھر دل نے یہ بھی کہا کہ ان عالی مقام لکچراروں سے اس ہیچ مداں کو نسبت ہی کیا، اچھا ہی ہے جو اسے بلا کر اس کی ہنسی نہ کرائی جائے غرض بات آئی گئی ہو گئی۔

شاید جنوری ۱۹۵۷ء کی کوئی تاریخ تھی کہ مدراس یونیورسٹی کے رجسٹرار کا مراسلہ موصول ہوا کہ فلاں فنڈ سے فلاں مذہبی عنوان پر انگریزی میں لکچر دلانے مقصود ہیں۔ معاوضہ کی رقم اتنی ہو گی۔ کرایہ وغیرہ الگ سے کچھ نہ ملے گا۔ لکچر فلاں زمانے میں ہوں گے ــــــ سوچا تو انگریزی زبان کی شرط کڑی معلوم ہوئی۔ اردو میں جو مشق چڑھی ہوئی ہے۔ انگریزی میں کہیں اس کی آدھی تہائی بھی نہیں۔ جتنا وقت اردو کام میں لگتا اس سے کئی گنا انگریزی میں تیار کرنے میں لگ جاتا محنت کہیں زیادہ کرنی پڑتی پھر مہلت بھی کام کے لیے کچھ ناکافی سی معلوم ہوئی۔ عنوان بھی اپنی مرضی کا سو فیصد

نظر نہ آیا اور یہ بھی خیال آیا کہ لکچر اگر ہفتہ یا نصف ہفتہ کے فصل سے ہوئے جب بھی بہت روز ٹھہرنا پڑ جائے گا۔ رہا مالی معاوضہ سو یوں تو کم نہ تھا لیکن ایک ملازم اور ایک سکریٹری ساتھ لے کر اتنے لمبے سفر پر جو خرچ آتا اس کے لحاظ سے زیادہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا ـــــ یہ سب سوچ ساچ رجسٹرار کو معذرت لکھ بھیجی اور بات اپنے نزدیک ختم کر دی۔

۸۔۱۰ ہفتے اس مراسلت کو گزرے ہوں گے کہ مدراس سے انھیں افضل العلماء کا خط موصول ہوا کہ آپ سے ملنے دریاباد آنا چاہتا ہوں اپریل میں دہلی آؤں گا، وہیں سے دریاباد آنے کی اجازت چاہتا ہوں، تاریخ تقریباً فلاں ہوگی۔ اس وقت تک موصوف سے شخصاً کوئی شناسائی نہ تھی اور خط بھی ان کا غالباً یہ پہلا ہی تھا۔ واقفیت صرف ان کے نام سے تھی اور شہرت ان کے کام کی تھی۔ علی گڑھ وہ کچھ روز کے لیے پرو وائس چانسلر ہو کر آئے تھے اور عارضی طور پر وایس چانسلر بھی ہو گئے تھے، یہاں سنا تھا کہ وہ اتنے ہی دنوں میں اپنی دینداری اور اپنے فہم و تدبر دونوں کا نقش دلوں پر بٹھا گئے ہیں۔ اور ایک حیدر آبادی عزیز سے ان کا یہ قابل رشک اور ناقابل یقین حد تک عجیب کارنامہ سننے میں آچکا تھا، کہ جس دن اپنی صاحبزادی کا عقد انھوں نے کیا، اسی دن سات یتیم لڑکیوں کا بھی عقد انھوں نے کرایا! ایسے قصے تو صرف اولیاء اللہ ہی کے ہو سکتے تھے۔ ورنہ

اپنے ظرف پر قیاس کیا جائے تو عین اپنے ہاں کی تقریب کے وقت کوئی دوسرا اپنے ہاں کی تقریب میں اعانت کی بھی درخواست اگر کرتا ہے تو الٹا اور غصہ ہی آجاتا ہے۔ کہ اگر اپنے پاس کچھ اور ہوتا تو اپنے ہی ہاں اسے بھی نہ لگادیا جاتا، دوسروں کے دینے دلانے کا یہ کون سا موقع ہے؟۔۔۔
بہرحال عقیدت ان کے اخلاقی اور دینی کردار سے متعلق اچھی خاصی قائم ہو چکی تھی، ملنے کو دل ان سے بے اختیار چاہا۔ لیکن ساتھ ہی یہ یاد آیا کہ دنیوی اعتبار سے وہ ایک اونچے مرتبہ پر فائز ہیں۔ اور شہر کے اعلا معیار زندگی کے عادی مدراس پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہیں۔ اپریل کی گرمی میں یہاں اس دیہات کے لیے زحمت سفر کیسے گوارا کر سکیں گے، جواب لکھا کہ دیدار سے مشرف یقیناً کیجیے۔ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ملاقات اسی دیہات میں ہو۔

آے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کریوں!

لکھنؤ آخر آنا جانا ہوتا ہی رہتا ہے۔ آپ لکھنؤ جب آسکتے ہوں۔ چند روز قبل اپنی تاریخ آمد اور اپنے ہوٹل سے اطلاع دے دیں، لکھنؤ آنے کا وقت نکالوں گا اور وہیں آپ سے مل لوں گا۔
جواب آیا کہ یہ نہیں ہونے کا۔ حاضری دریاباد ہی میں دوں گا، اجازت وہیں کے لیے طلب کر رہا ہوں۔
مجبوراً آخری جواب یہ عرض کیا گیا کہ بہتر ہے اگر آپ اس گرمی اور

رمضان کے مہینے ہی میں سفر دریاباد کا مجاہدہ اختیار کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ تو آپ کا ارشاد منظور، لیکن ایک شرط ادھر سے بھی ہے۔ خدا کے لئے روزہ رکھ کر نہ آیئے گا۔ مسافر کے لیے افطار میں فقہا نے تو خیر پھر بھی قیل و قال کی ہے لیکن حدیث سے صاف مرضیٔ مبارک یہی معلوم ہو رہی ہے اور بظاہر قرآن بھی اسی کی تائید میں ہے۔

ادھر تو یہ ہوا۔ ادھر تکوینی طور پر اسی درخواست کی تائید یوں ہوئی کہ دہلی سے لکھنؤ آتے عین اسی شب میں ڈاکٹر صاحب علیل بھی ہو گئے اور اب وہ مسافر ہی نہ تھے بلکہ ساتھ ہی مریض بھی۔ رخصت افطار صوم سے فائدہ اٹھانے کے داعی تو ہی ایک چھوڑ دو موجود!

اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے!

لکھنؤ سے دریاباد ٹرینوں کی آمد و رفت کثرت سے رہتی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب لکھنؤ سے اپنے معزز میزبان کے ذاتی موٹر پر آرہے تھے تاکہ آمد و رفت دونوں کا وقت اپنے اختیار میں رہے۔ وسط رمضان کی کوئی تاریخ تھی اور کوئی دس بجے دن کا وقت۔ کہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ڈاکٹر صاحب وارد ہوئے ——— دیکھا تو بغیر کسی خادم و ملازم کے تنہا ہیں۔ اور وضع اتنی سادہ کہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہوں گے! رنگ صاف نہ ہونے کے باوجود چہرہ پر وہ نورانیت، جو صرف ریاضتوں اور تعلق باللہ

سے پیدا ہوتی ہے، اہلاً وسہلاً مرحبا. شربت وغیرہ پیش کیا گیا اور ملاقات کئی گھنٹے کی رہی، وقت اس کے لیے پہلے سے نکال رکھا گیا تھا۔ واپسی سہ پہر کو ہوئی۔

ملاقات پہلی تھی۔ لیکن دل ایسا کھلا کہ جیسے مخاطبہ کسی پرانے مخلص سے ہورہا ہے۔ موصوف کی اعلیٰ علمی قابلیت، علوم مشرقی ومغربی دونوں کی جامعیت گہری فکر ونظر، صحیح دینداری، لیکن ہر تعصب اور گروہ بندی سے برتری اخلاص و عالی ظرفی، سب کے انداز سے اور بڑے خوشگوار انداز سے اس ایک ملاقات میں ہو گئے۔ بیعت اگر حضرت تھانویؒ سے تھی تو مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ عقیدت میں کمی نہ تھی۔

مرکز عقیدت اگر دیوبند تھا، تو گوشۂ چشم ندوہ کی جانب سے ہٹا ہوا نہیں! دینداری میں شغف کے ساتھ دل میں جگہ سرسید، بلکہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے لیے بھی پوری طرح موجود! دو بار اگر آکسفرڈ میں جا جا کر قیام رکھا، تو دو ہی بار حج بیت اللہ کو بھی گئے ——— جمود ذرا سا بھی نہیں۔ بڑی فکر اس کی کہ جدید مسائل وحالات کے پیش نظر علماء راسخین (مثلاً فاضل گیلانی مرحوم) کی ایک کمیٹی قائم کی جائے اور اس سے جدید سوالات کے مستند جوابات حاصل کیے جائیں ——— ایک بڑی غلط فہمی بھی دور ہوئی۔ اب تک یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اصلاً یہ انگریزی خواں ہیں اور اس کے بعد دینی ڈگریاں بھی حاصل کرلی ہیں۔ آج تحقیق ہوا

کہ اس کے برعکس اصلاً عالم دین ہی ہیں (اور کرنول کے ایک بڑے فاضل اور شیخ وقت کے فرزند) اور ایم اے ڈی فل وغیرہ سب اس کے بعد کیا ہے علوم دین کے ساتھ عربی ادب، انگریزی ادب اردو ادب سب پر گہری نظر اور توازن اعتدال و شرافت کے ایک معجون مرکب، جی مل کر خوش ہوگیا، مدت دراز کے بعد ایسی متوازن شخصیت ہاتھ آئی (اصل قحط ملت میں متوازن شخصیتوں ہی کا تو ہے) اور اپنے اوپر افسوس ہوا کہ اس سے قبل ہی کیوں نہ ان کی زیارت کر لی تھی۔

مدراس کے لکچروں کا ذکر خود ہی ایک مناسب تمہید کے ساتھ چھیڑا اور فرمایا کہ اقبال و سلیمان والا فنڈ تو مدت ہوئی ختم ہوچکا ہے، اب حال میں ایک دوسرا فنڈ (گو اس سے چھوٹا) ایک مخیر خاتون کو ترغیب دے کر قائم کرایا ہے اس کے بعد اپنی خداداد فراست سے میری رکاوٹوں کو میری زبان سے سنے بغیر سمجھ گئے اور بڑے میٹھے انداز سے ایک ایک دشواری کا حل بتاتے چلے گئے۔

(۱) اہم ترین دشواری زبان کی تھی۔ اس کے لیے اطمینان کامل کے ساتھ فرمایا انگریزی کی قید ہرگز نہیں۔ بہ مسرت تمام لکچر اردو میں ہو سکتے ہیں۔ آدھی دشواریاں تو اسی ایک مسئلہ کے حل ہو جانے سے ختم ہوگئیں۔

(۲) عنوان کے لئے کہا کہ تمامتر آپ کی رائے وصوابدید پر ہے، مذہب کے دائرہ کے اندر آپ جو چاہیں رکھ سکتے ہیں۔

(۳) مدراس میں لمبے قیام کی ضرورت نہ ہوگی ہر روز بلاناغہ ایک لکچر ہوسکتا ہے۔ چھ دن میں بہ آسانی فراغت ہوسکتی اور پہنچنے کے آٹھویں دن رخصت ہوسکتی ہے۔ ایک دن سفر کرنول کے لیے نکال لے۔

(۴) سامعین کا حلقہ بہت بڑا نہ ہوگا اور پبلک جلسے کی صورت نہ پیدا ہونے پائے گی، صرف پڑھے لکھے تھوڑے سے لوگ سننے آئیں گے۔

(۵) جلوس، استقبال وغیرہ کا شائبہ بھی نہ پیدا ہونے پائے گا، اور ملاقاتیں بھی ہر طرح محدود رکھی جائیں گی۔

(۶) مدراس یونیورسٹی میں اردو کا اگزامنر ہی نہیں، بورڈ آف اگزامنرز (ماڈریٹرز) کا ممبر بھی منتخب کرادیا گیا ہے ۔۔ اور ان مجلسوں کی تاریخیں عین اسی زمانہ میں رکھ دی گئی ہیں۔ آمد و رفت کا کرایہ یونیورسٹی دیگی اس لئے اس فنڈ والی رقم سے ملازم یا سکریٹری بلکہ دونوں کا کرایہ بہ آسانی نکل سکے گا۔

یہ ساری باتیں اس تصریح کے ساتھ اسی ایک نشست میں نہیں ہوئیں۔ کچھ باتیں اشارہ کنایہ میں اس وقت کہہ دیں کچھ بعد کو خط میں لکھ بھیجیں۔

ایک خیال آج سے نہیں، سالہا سال سے یعنی کوئی ۳۰، ۳۲ سال قبل سے دل کے ایک گوشے میں نشوونما پارہا تھا کہ سیرۃ النبی پر ایک کتاب خود قرآن مجید ہی سے اخذ کر کے مرتب ہونا چاہیئے۔ سیرت نبوی پر کتابیں ماشاءاللہ

متعدد زبانوں میں اچھی سے اچھی موجود ہیں۔ خود اردو ہی میں مولانا شبلی و
مولانا سلیمان کی سیرۃ النبی اور مولانا عبدالرؤف داناپوری کی اصح السیر کس سے
کم ہیں، لیکن ان سب کے بڑے اور اصل ماخذ وہی حدیث وسیر کی روایتیں ہیں
فرصت میسر آسکے تو ایک کتاب اس موضوع پر خاص قرآن مجید ہی کی
بار بار تلاوت سے مرتب کیجئے۔ یہ بالکل درست ہے کہ رسول اللہ صلعم کی شخصی
زندگی کے بعض اہم جزئیات (مثلاً تاریخ ولادت، تاریخ وفات عمر، تعداد
ازدواج واولاد وغیرہ) کے ذکر سے قرآن مجید خاموش ہے۔ تاہم حضور کی پبلک
زندگی کے اکثر اور شخصی زندگی کے بھی بعض اہم جزئیات پر قرآن مجید سے روشنی
اچھی خاصی پڑسکتی ہے اور صراحۃً النص کے ساتھ اگر دلالۃ النص۔ اشارۃ
النص، واقتضاء النص کے قاعدوں سے کام لیا جائے تو سیرۃ نبوی کے اکثر
مباحث، قرآن مجید سے براہ راست اخذ و استنباط کئے جاسکتے ہیں۔ البتہ
ضرورت اس کے لیے پورا وقت دینے اور قرآن مجید کو شروع سے آخر تک
اس نقطۂ نظر سے بار بار پڑھنے کی ہے۔ سال کے بعد سال آیا۔ اور گزرتا گیا
اپنی عمر جوانی سے ڈھل کر ضعیفی کی آگئی۔ اور اس ناکامی و محرومی کا یہ داغ
سینہ چاک کرکے کس کو دکھلایئے، کہ اس خاص کام کے لئے فرصت کبھی نہ
نصیب میں آسکی!

اب جو ڈاکٹر عبدالحق سے گفتگو ایک علمی دینی موضوع کے لیے آئی تو

دل نے کہا کہ اب اس سے بہتر موقع اور کون ہاتھ آسکے گا، اور گو فرصت اب بھی بہت کم اور ہجوم مشاغل بدستور ہے۔ پھر بھی اللہ کا نام لے کر اب یہی موضوع اختیار کیجئے اور جن محترمہ مرحومہ نے اپنے عطیہ سے یہ لکچر شپ قائم کرائی ہے اس نئی سیرت نبوی کا اجرا انھیں کے نام لکھوائیے۔ نقش مکمل نہ سہی محض خاکہ سہی، پھر بھی اب اس سے بہتر موقع زندگی میں (جو اب باقی ہی کتنی رہ گئی ہے) نہیں ملے گا۔

لکھا پڑھی ہوئی۔ اور چند روز میں بات طے پاگئی، رجسٹرار مدراس یونیورسٹی کا خط ازسرنو آیا، ابکی اس کا جواب بجائے انکار کے منظوری میں گیا۔ اور اب قرآن مجید کا مطالعہ اس سیرتی نقطۂ نظر سے شروع ہوا، ساری متعلقہ آیتوں کو پہلے نشان لگا کر یکجا کرنا پھر نقل کے بعد انھیں مختلف بابوں کے اندر اور مختلف عنوانوں کے ماتحت سمیٹ کر ان سے نتیجہ نکالنا اور دوبارہ سب کو نقل کرنا، اس سارے کام کے لئے دو ایک سال کے وقت کی ضرورت تھی جو تنہا اسی کام کے لئے مخصوص ہو۔

اتنی فرصت ممکن کیونکر تھی؟ کل چند مہینے ہی کا تو اب وقت باقی رہ گیا تھا پھر اس میں بھی علاوہ صدق کی ادارت کے "چھوٹے بڑے بیس کام اور! بہرحال جوں توں ورق گردانی تو کلام پاک کی کر ہی لی۔ اور مسودہ

ضاف ہونے کو دیا، فرمایش چھ لکچروں کی تھی، اتنے کی تو کوئی صورت نہ نکل سکی، کل پانچ لکچر تیار ہوئے۔ اوسطاً ہر لکچر ایک گھنٹہ میں پڑھنے کا، اکثر لکچروں کے اندر، دو دو تین تین باب۔

ادھر مدراس یونیورسٹی کے اردو بورڈ آف اسٹڈیز کے صدر پونا کے کوئی ڈاکٹر ورما تھے، ان سے جو مراسلت شروع ہوئی تو وہ بھی اپنی شائستگی پاکیزگی، مروّت، شرافت کے لحاظ سے ایک ہلکے قسم کے ڈاکٹر عبدالحق ہی نکلے قاعدہ سے میٹنگ اخیر دسمبر میں ہوئی تھی لیکن مجھے عین اسی وقت لاہور جانا تھا بین الاقوامی مذاکرہ اسلامی (کلوکیم) میں شرکت کے لیے۔ بیچارہ ڈاکٹر ورما نے میری خاطر سے تاریخ ہفتہ عشرہ آگے بڑھائی، جب بھی ممکن نہ تھا کہ لاہور سے وطن آکر اور دوسرا سفر مدراس کا اختیار کرکے وہاں پہونچ سکوں۔ دلی شرمندگی و تاسف کے ساتھ انھیں معذرت لکھی اور لکھا کہ میٹنگ بغیر میرے کرلیجیے۔

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

جواب آیا کہ یہ ممکن نہیں۔ آخر تاریخ یہ طے پایا کہ میٹنگ ۲۱ / ۲۲ جنوری کو ہو۔ اس کے لیے ۱۸ کو صبح سویرے لکھنؤ سے روانہ ہوکر ۲۰ جنوری کی شام تک مدراس پہونچ جاؤں سیرۃ والے لکچروں کی تاریخیں بھی ۲۱ تا ۲۴ جنوری قرار پاگئیں۔ ۲۵ کی شب میں مدراس سے روانگی براہ کرنول وحیدرآباد

کہ ۲۹ ر جنوری کو لکھنؤ واپس پہنچ جاؤں۔

۱۸ ر جنوری۔ آج صبح سویرے روانگی لکھنؤ سے ہوئی۔ جھانسی میل پر سواری کا اتفاق اب کی برسوں کے بعد ہوا، ورنہ ایک زمانہ میں حیدرآباد کے سفر عموماً اسی سے ہوتے ہی رہتے تھے۔ قدرۃً آج یہ گاڑی کچھ عجیب اور نامانوس سی محسوس ہوئی۔ بعد دوپہر جھانسی پہنچے اور نماز ظہر اتر کر پلیٹ فارم پر اطمینان سے پڑھی۔ دہلی بمبئی میل کے آنے میں ابھی عرصہ ہے پلیٹ فارم پر ٹہل قدمی دیر تک رہے گی ــــ جھانسی جنکشن سے سابقہ کوئی نیا نہیں، بمبئی حیدرآباد اور (اپنی سسرال) باندے جاتے اور آتے خدا معلوم کتنی بار اسی جنکشن سے گزرنا اور کتنی بار یہاں اترنا بھی ہو چکا ہے۔ نوجوانی، جوانی، ادھیڑ سن کے کتنے دَور یہ پلیٹ فارم دیکھ چکا ہے گھنٹوں اسی ویٹنگ روم میں قیام رہا ہے۔ روزہ یہاں افطار کیا ہے۔ تراویح یہاں پڑھی ہے۔ تحریک خلافت کے آخر زمانہ میں مولانا شوکت علی سے یہیں ملاقات ہوئی ہے۔ ۱۹۲۹ء میں حج کو جاتے ہوئے اپنی چھوٹی بچیوں کو یہیں سے رخصت کیا تھا۔ باندے آتے جاتے کتنی خوشگوار قسم کی خانگی یادیں اسی پلیٹ فارم کے ساتھ وابستہ ہیں! ــــ اللہ نے حافظہ کی بھی کیا نعمت دی ہے۔ جب چاہیے بغیر کچھ خرچ کیے اس قدرتی بائسکوپ کو کھول لیجئے اور بڑے سے بڑے خوشگوار و پُر تکلف خیالی منظروں سے گھنٹوں دل بہلاتے رہئے

——— پرتکلف ہی نہیں، بڑے سے بڑے پردرد اور حسرتناک منظروں سے بھی!

دہلی بمبئی میل آیا اور ہماری لکھنؤ جھانسی میل کی بوگی کٹ کر اسی میں لگی کوئی ۸½ بجے شب کا وقت ہوگا، کہ بھوپال اسٹیشن آگیا۔ بھوپال سے بھی بڑی خوشگوار یادیں خانگی اور دینی دونوں قسم کی وابستہ رہ چکی ہیں، تفصیل کس کس چیز اور کہاں تک بیان ہو! رات کو یہیں ٹھہر کر بقیہ سفر صبح تڑکے، دہلی مدراس (گرینڈ ٹرنک) اکسپریس سے طے کرنا تھا۔ مولانا محمد عمران خاں ازہری ندوی (سابق مہتمم ندوہ) مستعدی، کارگزاری، اخلاص کے پتلے ہیں، مع اپنے صاحبزادے مولوی حبیب ریحان خاں ندوی (نشان منزل والے) کے موجود تھے۔ دو ایک اجنبی صاحبان بھی ان کے ہمراہ تھے۔ مگر ہر طرح مہذب، شائستہ، خوش تمیز جو بار خاطر کسی طرح نہ ہوئے، ایک صاحب غالباً وحیدی صاحب نامے تھے، اور ایک بڑی پرانی مخلص شاہجہاں پوری خاتون بھی۔ جنھیں بیعت اب مولانا سید سلیمان ندوی سے ہے۔ کوئی ½ ۱۰ بجے پر یہ محفل برخاست ہوئی اور رات ویٹنگ روم میں آرام سے گزری (جیسا آرام کہ مسافرت میں ملنا ممکن ہے)

فجر ابھی نہیں ہونے پائی تھی (اور موسم یاد کر لیجئے کہ شدید سردی کا تھا) کہ مولانا عمران کئی میل کا فاصلہ طے کر کے مع چائے کے سامان اور برقی چولھے کے پھر آموجود! نماز فجر جماعت کے ساتھ ویٹنگ روم میں ادا ہوئی، اور

ابھی سلام پھیرا ہی تھا کہ جی، ٹی، ایکسپریس آگیا۔ خاصہ اندھیرا تھا لیکن جگہ بحمداللہ محفوظ و مخصوص مل گئی۔ انتظام کئی روز قبل سے کر دیا گیا تھا پھر بھی آجکل کے اندھیر کے لحاظ سے اطمینان نہ تھا، چائے اور ناشتہ انھیں عمران خاں اور ان کی اولاد (آلِ عمران) کی عنایت سے عین BED-TEA کے وقت خوب مل گیا ——— درجہ میں نگاہ کی تو رفیق سفر تین نظر آئے۔ تینوں ہندو، لیکن تینوں شریف و مہذب و شائستہ تھے۔ مدراس کے اور دہلی سے آرہے تھے۔ اردو سے معمولی بول چال کی حد تک تینوں واقف، اور مسلم کلچر سے تینوں کم و بیش متاثر، ایک صاحب کے جسم پر بجائے دھوتی کے تہمد، جو خالص مسلمانوں کا لباس سمجھا جاتا ہے ——— مدراسی ہندوؤں کی بے تعصبی، رواداری اور مسلم آمیزی کا نقش جو بعد کو اور قوی اور گہرا پڑا، اس کی شروعات یہیں سے ہوئی۔

جی، ٹی، ایکسپریس کی تیز رفتاری کا کیا کہنا لیکن گاڑی ہل بہت رہی ہے اس لئے نظر جما کر پڑھنے میں آنکھ پر زور قدرۃً بہت زیادہ پڑنے لگتا ہے۔ کتابیں جو ساتھ تھیں۔ بند کر کے رکھ دیں، طویل سفر یوں بھی بڑا کھلنے والا ہوتا ہے، چہ جائیکہ جب پڑھنا پڑھانا دشوار ہو! صبح ہوئی دوپہر ہوئی اور گاڑی ہے کہ بگٹٹ چلے جا رہی ہے! ——— گویا سفر زندگی ہے کہ مسلسل اور غیر منقطع بس طے ہوتا چلا جا رہا ہو! ——— ہوشنگ آباد گزرا، اٹارسی نکلا اور پورا وہ علاقہ گزر گیا۔

جو ایک زمانہ میں سنٹرل انڈیا کہلاتا تھا، مالوہ بھی اسی علاقہ میں ہے، وہی مالوہ جس کی شہرت بعض حلقوں میں افیون کے دم سے قائم ہے۔ فسانہ آزاد کی زبان میں ع

پلا ساقیا مالوے کی افیم

یہ سارا راستہ ۱۹۱۷ء سے لے کر اب تک بیسیوں مرتبہ طے کیا ہوا ہے۔ سن کے فرق کے ساتھ اور مقصد سفر و نوعیت سفر کے فرق کے ساتھ گویا راستہ کا نقشہ بھی ہر دفعہ بدلتا ہی رہا ہے۔ ہوشنگ آباد کے جنگلوں سے گزرتے ہوئے خوف کی خیالی کیفیت ہر مرتبہ طاری ہوتی رہی ہے، کتنے ڈاکے، کتنے خون، کتنے قتل ان گھنی جھاڑیوں میں ہوئے ہوں گے، کتنے قافلے ان اندھیریوں میں لٹے ہوں گے، کتنے ٹھگوں نے بے دردی سے بے گناہوں کے گلے میں پھندے مار کر انھیں یہیں گڑھوں میں دفن کر دیا ہوگا! پنڈاریوں کے دور میں یہاں کا سماں کیا رہا ہوگا! کتنے شہیدوں کے لاشے اس ویرانے میں تڑپے ہوں گے! کتنے یتیموں، بیواؤں، مظلوموں کی چیخیں آج بھی اس فضا میں خاموشی کے ساتھ گونج رہی ہوں گی! —— دوپہر کے بعد کا وقت تھا کہ ناگپور نظر پڑا، یہاں بھی اپنے کئی عزیز رہ چکے ہیں۔ تصور کی آنکھ کے سامنے ایک ایک کر کے گزرتے رہے۔ گاڑی رکی اور ۱۰، ۷ "صدق" نواز بھلے آدمیوں کا گروہ کھڑا ہوا نظر آیا۔ یہاں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی کے صدر

مولوی رفیع الدین صاحب (علیگ) ہیں۔ انھیں خط لکھ دیا تھا۔ اور کرم فرماؤں کے نام اب کہاں یاد۔ ہاں ایک صاحب نہ بھولنے والے اردو کے کہنہ مشق سخن گو ناطق گلاؤٹھوی تھے۔ نام مدت دراز سے سننے میں آرہا تھا۔ نیاز آج پہلی بار حاصل ہوا۔ اترنے کے لئے اصرار شروع ہوا۔ جواب بجز معذرت کے اور ممکن کیا تھا۔ شاداب و شیریں سنتروں کی بھری ٹوکری رفیع الدین صاحب نے ساتھ کردی ـــــ گاڑی پھر چلی اور چلتی رہی۔ یہاں تک کہ وارد ھا اسٹیشن آگیا، اس نے بھی کتنی پرانی یادیں تازہ کردیں۔ گاندھی جی کی زندگی میں اسے کس درجہ اہمیت و مرکزیت حاصل تھی! ہندوستان بھر کا گویا غیر سرکاری دارالسلطنت بنا ہوا تھا۔ وتلک۔ الایام نداولہا بین الناس۔ لوگ نعرہ لگاتے ہیں۔ انقلاب زندہ باد۔ پائداری انقلاب کو بھی کہاں نصیب۔ پلک جھپکاتے توبڑے سے بڑا انقلاب خود ہی مردہ ہوجاتا ہے۔ زندگی تو بس جس کی ہے اسی کی ہے!

عشق با مردہ نہ باشد پائدار
عشق را با حی و باقیوم دار

...۱۲۰۰ میل سے اوپر کا سفر کچھ دل لگی نہیں۔ گاڑی لاکھ تیز رفتار ہو، آخر فاصلہ کو کیا کرے۔ لکھنؤ چھوڑے ہوئے آج دوسری شام ہو رہی ہے اور منزل

ابھی ایک ثلث سے زیادہ باقی ہے۔ کھانے کی گاڑی ساتھ ہے کھانا تو کچھ مدراسی مذاق کا سا ہے۔ البتہ اس گاڑی کے خادم اور بیرے بڑے تمیزدار خوش سلیقہ کارگزار ہیں۔

رات بڑھی، بلہارشاہ گزرا اور قاضی پیٹ کا قرب محسوس ہوا۔ قاضی پیٹ جنکشن وہی ہے جہاں سے راستہ حیدرآباد کا کٹتا ہے اور یہیں سے آدھی رات کے وقت دو بوگیاں کاٹ کر حیدرآباد کے لئے لگادی جاتی ہیں اور باقی ایکسپریس اپنی راہ چلا جاتا ہے —— حیدرآباد مرحوم حیدرآباد کا نام زبان پر آگیا! غالب ؂

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے!

وطن کے بعد پھر اگر کہیں مخلصوں کی تعداد بڑی سی بڑی تھی، تو اسی شہر اور اس کے اطراف میں! زندگی کا ایک سال بہ حیثیت مجموعی خوشگوار ترین یہیں کاٹا۔ عثمانیہ یونیورسٹی اس وقت تک قائم ہو چکی کہاں تھی ہاں قائم ہو رہی تھی۔ اور صرف اسی کا مقدمۃ الجیش سررشتہ تالیف و ترجمہ اس وقت تک قائم ہو پایا تھا۔ اور پھر اس کے بعد سالہاسال کی آمدورفت دنوں نہیں ہفتوں مسلسل قیام! ہر روز دعوتیں ہر شام جلسے اور پارٹیاں! نواب عمادالملک بلگرامی، سرامین جنگ بہادر، سراکبر حیدری

سید عبدالمجید دہلوی (اسسٹنٹ ہوم سکریٹری) مولوی سید عبدالغنی بہاری
وارثی (اسسٹنٹ اکاونٹنٹ جنرل) مسز سروجنی نائیڈو، مہاراجہ سرکشن پرشاد
بابائے اُردو عبدالحق، سر مسعود جنگ کی بزرگانہ شفقتیں اور عنایتیں، حکیم امتیازالدین
و حکیم امروہوی کی مسیحا نفسیاں، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالحلیم شرر، مولوی
وحیدالدین سلیم، جلیل القدر فصاحت جنگ، سید ہاشمی فرید آبادی، قاضی تلمذ
حسین، جناب الیاس برنی، مولانا عبداللہ عمادی، مولانا علی حیدر طباطبائی کی
کرم فرمائیاں، ہوش بلگرامی، اکبر یار جنگ، مولانا گیلانی، مولانا عبدالباری
ندوی، بہادر یار جنگ، احمد محی الدین (رہبر دکن) اور سید امین الحسن بسمل
موہانی کا بے پناہ اخلاص، اور ناظر یار جنگ، اختر یار جنگ مینائی، اور سید
ناظم علی ہانسوی کے عزیزانہ تعلقات یگانگت وغیرہا، ان میں سے کس کس چیز کو
بھلایا جائے۔ کس کس کو یاد رکھا جائے۔ وطن کے بعد کوئی دوسرا مقام وطن
ثانی اگر بن سکتا تھا تو یہی حیدرآباد تھا۔ سب سے پہلے یہاں آنا ستمبر ۱۹۱۱ء
میں ہوا تھا اور اس وقت یہ لائن تھی بھی نہیں۔ لکھنؤ سے آنا منماڑ اور اورنگ آباد
ہوکر ہوتا تھا، جو کوئی ۴۸ گھنٹے کے مزید سفر کے بعد حیدرآباد پہنچاتی تھی۔ اسی ۴۰
۔ ۴۱ سال کے اندر دنیا کیا سے کیا ہوگئی اور حیدرآباد تو اسی انقلاب کا شکار خصوصی
ہوکر رہا۔ مسلم دور اقتدار کا جو آخری نشان ہندوستان میں باقی تھا اپنے ہاتھوں
نادان دوستوں کے ہاتھوں سب خواب و خیال بن کر رہ گیا اور باہر کو چھوڑ

خود اپنے اندر جو انقلابات ہوئے ان کا پوچھنا ہی کیا یا یہی کچھ سوچتے سوچتے آنکھ لگ گئی اور قاضی پیٹ بے خبری میں گزر گیا۔

لیکن شوق و اشتیاق جب اتنا تھا، تو آخر حیدرآباد اُتر کیوں نہ لیا؟ آخری مرتبہ اس سرزمین پر آنا اکتوبر ۱۹۳۸ء میں ایک عزیزہ کی شادی کے سلسلہ میں ہوا تھا۔ ۲۰ سال کی اس حسرت کو ایکی بہ آسانی مٹایا جا سکتا تھا لکھنؤ سے سفر دو چار روز قبل شروع کر دینا تھا۔ مدراس میں کام کی تاریخیں تو ۱۲ سے شروع ہوتی تھیں یہ قبل کے دو چار دن یہیں گزار لینے تھے ۔ مالی سوال بھی کوئی بڑا نہ تھا۔ مدراس تک کے مصارف سفر کا تو سرکار نے بل پیش ہونا ہی تھا صرف اتنے سے سفر قاضی پیٹ تا حیدرآباد) کی آمد و رفت کا خرچ ذمہ پڑ رہا تھا، اور یہ کوئی ایسی بڑی رقم نہ تھی، تو پھر اسے کیوں نہ پورا کر لیا؟ اور کیوں اپنے ہاتھوں یہ موقع کھو دیا۔ جو قسمت سے ہی ہاتھ آ رہا تھا؟ ــــــ سوال معقول ہے لیکن جواب ذرا تفصیل بلکہ تطویل چاہتا ہے۔

ارادہ خود ہی حیدرآباد اترنے کا تھا۔ بہت سے عزیز اگرچہ دکن سے پاکستان جا چکے ہیں۔ پھر بھی جو باقی ہیں وہ بھی کچھ اہم نہیں بہت سے مخلص مرحوم ہو چکے ہیں۔ ان کی قبروں پر جا کر فاتحہ پڑھنے کے لیے دل بے اختیار ہو رہا تھا۔ جو مخلصین ماشاء اللہ زندہ ہیں ان کی بھی خاطر عزیز تھی۔ یہ پروگرام بنایا کہ ادھر سے جانے میں چار دن کا وقت نکالیے۔ پہلا دن تو صرف مرحومین کی نذر ہو کہ "بہادر یار جنگ مرحوم، اور احمد محی الدین مرحوم (رہبر دکن والے) کے مزارات

پر رجاں، تو ز واجبات میں سے تھا۔ پھر اختر یار جنگ مرحوم، حاجی شاہ محمد یوسف
دریابادی وغیرہ کا نمبر تھا، اور مخلصین میں سید ابن الحسن بسمل موہانی مرحوم کا نمبر
اول تھا اور نمبر ہوشیار جنگ مرحوم تھے۔ اور اور بھی کئی ایک، دو دن ملنے ملانے
ملانے کے لئے مخصوص تھے اور ایک پورا دن نلگنڈہ کی آمد و رفت کے لئے۔ یہ
اسکیم ایک مخلص کو لکھ بھیجی۔ اور ان سے راز داری کی تاکید کر دی۔ اور صاحب
رہنمائے دکن کو بھی ان کی قدیم خاندانی خصوصیت کی بنا پر لکھ بھیجا اور یہ بھی لکھ
دیا کہ یہ معلومات بالکل نجی کے ہیں، اشاعت ہرگز مقصود نہیں، ورنہ نادیدہ
محبین و مخلصین کی فوج ٹوٹ پڑے گی۔ اسٹیشن ہی سے استقبال و جلوس
وغیرہ کے قصے شروع ہو جائیں گے اور ہجوم سے بچنے اور اپنے سکونِ خاطر قائم
رکھنے کی ساکھ جو برسوں کے بعد اب خدا خدا کر کے قائم ہوئی ہے وہ سب
دم کے دم میں برباد ہو جائے گی اور پھر وہی مصیبت پیش آجائے گی کہ ہلک
جلسوں میں کہاں جایا جائے اور کس سے انکار کیا جائے غرض انھیں یہ ساری
تفصیل تو کیا لکھتا لیکن اجمال کے باوجود خط کو خانگی حدود کے اندر رکھنے
کی تاکید خاص کر دی تھی ——— مشیت کو منظور کچھ اور ہی تھا۔ یہ خط انھیں
دیر کو ملا اور اس سے قبل ہی انھیں کسی اور ذریعہ سے اس کی سن گن مل چکی
تھی۔ ان غریب نے اپنی سادگی سے اسے ایک "نیوز" خبر خیال کر کے اپنے
روزنامہ میں چھاپ دیا اور ادھر تعمیر ملت کے بھی کوئی کارکن صاحب اس

اس خبر کو لے اُڑے۔ اب کیا تھا. شہر بھر واقف ہو گیا اور عین وہ شے سامنے آ گئی جس سے بچنے کا اتنا اہتمام کیا گیا تھا. پبلک یا قوم کے اشتیاق نامے دریاباد انھیں حوالوں سے پہنچنے لگے۔ انا للہ

طبیعت قدرۃً سخت جز بز ہوئی اور حیص بیص کے بعد بالآخر فیصلہ کرنا پڑا کہ سرے سے یہ ارادہ ہی فسخ کیا جائے اور حیدرآباد کو پروگرام سے خارج ہی کر دیا جائے۔ یہ فیصلہ آسان نہ تھا. طبیعت پر سخت گراں تھا۔ کچھ دعدہ خلافی بھی اس سے لازم آ رہی تھی۔ لیکن یہ فیصلہ نہ کرنے سے جو صورتحال پیدا ہو رہی تھی وہ اس سے کہیں زیادہ گراں تھی۔ اور دعدہ خلافی کے لئے یہ مجبوری کا عذر بالکل کافی تھا۔ آخر دل پر صبر کا پتھر رکھ کر یہی رائے قائم کرنا پڑی۔ اور چٹ پٹ نئے خط اس فیصلہ کے ماتحت لکھ کر روانہ کر دیے۔

۔۳ مارچ کو عین فجر کے وقت گاڑی بجواڑہ جنکشن پہنچی اور دیر تک کھڑی رہی یہاں بھی کچھ مخلصین تھے۔ لیکن انھیں خط دیر میں ملا، اس لیے کوئی صاحب اسٹیشن نہ آ سکے۔ اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا، نماز فجر اور اس کے بعد معمولات میں خواہ مخواہ فرق پڑتا۔ معمولات کے لفظ سے اوراد و تلاوت و نوافل کی طرف نہ جائیے۔ جی نہیں مراد محض مادی و جسمانی معمولات سے ہے جن کا تجربہ قبض کے ہر مریض کو رہتا ہے ــــــ اب راستہ تمامتر نامانوس

تھا۔ انسانی شکلیں، بولیاں، عمارتیں سب اجنبی سی دکھائی دے رہی تھیں اور دل میں بے اختیار وطن کی یاد آنے لگی تھی۔ رفیقۂ زندگی کی طبیعت، عرصہ سے خراب چلی آرہی ہے اور کبھی کبھی بہت زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔ خیال بار بار انھیں کی طرف جارہا تھا اور دل کچھ مضطرب سا ہو رہا تھا، جوں جوں مدراس قریب آتا گیا۔ داہمے بھی بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ دوپہر ڈھل گئی اور سہ پہر شروع ہوگیا۔ نماز ظہر سے فراغت اول ہی وقت کر لی تھی کہ لیجئے وہ مدراس اسٹیشن آخر آہی گیا۔ گاڑی رکی، اور منٹ دو منٹ کے بعد میزبان ڈاکٹر عبدالحق اپنے سادہ لباس میں مع اپنے صاحبزادہ کے نظر آگئے۔ ان کے مسکراتے ہوئے چہرے نے اطمینان دلادیا کہ وطن سے کوئی تار دار نہیں موصول ہوا ہے گویا گھر پر خیریت ہی ہے۔

اسٹیشن سے میزبان کا مکان چند منٹ کا معاملہ تھا۔ کوئی چار سوا چار بجے سہ پہر کا وقت تھا کہ موٹر رکا اور میزبان کے ہمراہ مہمان ان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اپنے کمرے میں جانے اور سفر کے میلے کپڑے اتارنے کا کیا ذکر، ابھی ہم لوگ بس بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ تار گھر کے چپراسی نے تار لاکر دیا۔ اور میزبان نے پتے پر میرا نام پڑھ کر تار میری طرف بڑھادیا! کچھ نہ پوچھیے کہ ان چند سکنڈوں میں دل پر کیا گزر گئی۔ اب بھی یقین کہ تار وطن سے آیا ہے اور ہونہ ہو سانحہ کی خبر دینے والا ہے۔ تار کھولنے کی ہمت ہی نہیں

ہو رہی تھی، انسان کتنا تھڑ دلا اور دل کا کچا واقع ہوا ہے! زبان سے دعوے اپنی بہادری کے جتنے بھی کر لے! ـــــ خیر اللہ کا نام لیتے ہوئے دعائیں پڑھتے ہوئے جوں توں تار کو کھولا، خبر بیوی کے بھائی خاں بہادر حاجی شیخ مسعود الزماں رئیس اور بیرسٹر باندا کے دفعۃً انتقال کی درج تھی روانگی کے وقت لکھنؤ میں انھیں اچھا خاصہ تندرست اور ہشاش بشاش چھوڑے ہوئے چلا آرہا تھا ـــــ راستے کے وہم آخر بالکل بے بنیاد نہ نکلے ـــ

زبان سے بے اختیاری میں انا للہ تو نکلا، اور باقی بس سناٹے میں آگیا! مرحوم سے اس خاص رشتہ کے علاوہ اور بھی قریب کی عزیز داریاں تھیں، سن میں مجھ سے دو سال بڑے تھے، کالج میں دو سال ساتھ پڑھے ہوئے تھے اور ہر طرح کی بے تکلفی رکھتے تھے۔ آخری شکل تین ہی دن قبل کی لکھنؤ میں نظر کے سامنے پھر رہی تھی اور وفات کا یقین ہی نہیں آرہا تھا ـــــ انسان روز ہی ایسے واقعے اور حادثے دیکھتا رہتا ہے لیکن غفلت کے قربان جائیے کہ اپنی ذات اور اپنے عزیزوں کی طرف سے ایسی ہی بھول میں پڑا رہتا ہے گویا موت نہ اپنے کو کبھی آنا ہے اور نہ اپنے کسی عزیز قریب کو! عالی ظرف میزبان نے تار ہاتھ سے لے لیا۔ اور تعزیت و تسلیہ اپنی والی کرنے لگے یہ بھی کہا کہ اگر چاہیں تو ہوائی جہاز کا انتظام ابھی کرا دیا جائے "

عقل نے سوچ کر بتایا کہ اتنی طوالت اور بار مصارف کے بعد بھی حاصل کچھ نہیں جو ہونا تھا وہ ہو ہی چکا۔ نماز جنازہ یا تدفین میں شرکت تو بہرحال ہو ہی نہیں سکتی۔ اب اگر دو ایک گھنٹے کے اندر انتظام ہوائی جہاز کا ہو بھی گیا تو جہاز بہرحال کانپور ہی تک تو پہنچائے گا۔ رات کے کسی وقت وہاں سے پھر ٹرین ہی کا سابقہ ہوگا۔ جو کل دوپہر تک کہیں بانسے پہونچائے گی۔ رہی مرحوم کی والدہ (جو ۸۲، ۸۳ سال کی عمر میں ماشاء اللہ ابھی بقید حیات ہیں) اور بیوہ اور لڑکوں سے زبانی تعزیت تو وہ جس طرح دو دن کے بعد ہوتی آٹھ دن کے بعد بھی یہاں سے واپسی پر ہو سکتی ہے اس کے لیے یہاں کے فرائض کو چھوڑ کر چل کھڑے ہونا شرافت و احساس ذمہ داری سے بعید ہے۔ باقی تحریری تعزیت تو فی الفور بھی ممکن ہے ــــــ بہرحال صبر تو اس سے کہیں بڑے حادثے پر بھی انسان کو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس پر بھی اگر کر لیا تو کوئی بڑی بات نہ ہوئی۔ مغفرت کی دعائیں دل سے نکلیں تعزیت کے تار اور خط لکھے۔

میزبانی بجائے خود ایک فن ہے، اور ہر ایک کا کام نہیں۔ اپنی ایک عمر مہمانوں میں گزری۔ بحمد اللہ ناخواندہ نہیں خواندہ مہمانوں میں اور میزبان بڑے اور امیر غریب ہر درجہ کے تھے، مخلص اولوالعزم، سیر چشم سبھی نکلے۔ خاطر داریوں کے تجربے خوب خوب ہوتے رہے۔ لیکن صاحب فہم یعنی اپنی مرضی

نہیں بلکہ مہمان کی مرضی کو بالا رکھنے والے بس گنتی کے چند ہی نکلے، ایک مثالی میزبان حکیم الامت مولانا تھانویؒ تھے، بات بات میں مہمان کے ذوق اور اس کی سہولتوں کی رعایت کرنے والے۔ لیکن خیر وہ تو حکیم الاُمت ہی تھے، دوسری کرامتوں کی طرح اس کرامت کے بھی مخصوص و منفرد مالک۔ باقی عام دنیادار میزبانوں میں جتنوں سے سابقہ پڑا ان میں کہنا چاہیے کہ نمبر اول پر یہ ڈاکٹر عبدالحق ہی رہے اور کمال یہ کہ مجھ سے اتنی کم ذاتی واقفیت اور اتنے قلیل کسی سابقہ کے بل پر! اللہ جانے کیسی خداداد فراست تھی، جس سے انھوں نے میرے رجحان طبیعت مذاق و مزاج عادات کا اندازہ کر لیا تھا!

ٹھہرنے کا کمرہ مختصر اور ضروری فرنیچر سے آراستہ و مع ملحق غسل خانے کے۔ بالائی منزل پر رکھا، تاکہ کوئی بھی بغیر اجازت خصوصی کے وہاں تک نہ پہنچ سکے، یہ شرط تو سب سے مقدم اور ضروری تھی۔ ہجوم سے بچنے کا اہتمام میزبان نے اسٹیشن ہی سے شروع کر دیا تھا، بجز دو ایک صاحبوں کے جن میں سے ایک صاحب قاضیوں کے مشہور خاندان کے تھے (وہی خاندان جس کے ارکان قاضی حبیب اللہ، ڈاکٹر حمید اللہ وغیرہما ہیں) وہ کسی کے اسٹیشن پر لانے کے روادار نہ ہوئے۔ اپنے گھر ٹھہرا کر تو اس کی ہر تدبیر بھی انھوں نے اختیار کر لی تھی۔ حد یہ ہے کہ صبح کے اوقات میں مجھے بالکل تنہا اور آزاد چھوڑ دیا تھا اور جب تک نو بجے کا وقت نہ ہو جاتا، خود بھی میرے کمرے میں

نہ جھانکتے اور اس وقت جب آتے جب بھی اجازت لینے کے بعد اباقی جائے اور ناشتہ نماز فجر کے آدھ گھنٹے کے اندر ہی کمرہ پر پہنچ جاتا، وقت کی پابندی تک تو ٹھیک تھا، لیکن ناشتہ بہت بڑی مقدار میں ہوتا اور بڑا پر تکلف اور یہی ایک شکایت تھی جو مہمان کو میزبان سے پیدا ہوئی۔

دن اور رات کے کھانے کے لکچر میں جانے آنے کے۔ مخصوصین سے ملنے ملانے کے سب اوقات پوری طرح بندھے ہوئے تھے۔ نظام اوقات میں امکان بھر کوئی گڑبڑ نہ ہونے پاتا۔ نماز فجر کے لئے پہلے دن تو مسجد لے گئے لیکن مسجد کا فاصلہ کوٹھی سے اچھا خاصہ تھا۔ اس کا اندازہ کرکے دوسرے دن سے یہ قید بھی اُڑ گئی اور شریعت نے مسافر کو جو سہولتیں اور رخصتیں دی ہیں ان سے استفادہ پوری طرح ہونے لگا، مدراس کے موسم کو یوپی والے اپنے ہاں پر قیاس نہ کریں، فرق تو بھوپال ہی سے شروع ہوجاتا ہے۔ مدراس پہنچتے پہنچتے سردی کا موسم گرمی میں پوری طرح تبدیل ہوچکا تھا، اور مدراس کی ۲۰ جنوری لکھنؤ کے شروع اپریل کی کوئی تاریخ نظر آرہی تھی، پنکھے کی ضرورت غسل کا بار بار تقاضا اور ہلکے کپڑے۔ یہ سب اسی موسم کے کھلے ہوئے نتیجے تھے۔ کراچی بمبئی وغیرہ کی طرح مدراس بھی ایک سمندری مقام ہے اس لیے قدرۃً سابقہ بجائے یوپی کی لو کے۔ تیز و تند سمندری ہوا سے رہا کرتا ہے۔

بچپن سے نام مدراس کا کچھ اس طرح سننے میں آتا رہا کہ جیسے وہ راون کے دیس کا ہمسایہ دور افتادہ ہونے کے ساتھ کچھ ہونق ویرانہ سا ہے، گویا یوپی کے گل وگلزار شہروں کے مقابلہ میں کوردیہہ! اور مسلمان تو جیسے وہاں بالکل ہوش، گنوار بلکہ نیم جنگلی قسم کے بستے ہیں، انگریزی لفظ (BENIGHTED) ظلمت زدہ، اخباروں میں بار بار پڑھا ہوا. گویا اس کے تصور کے ساتھ چپکا ہوا! اور اتفاق سے جب کسی مدراسی مسلمان کی بڑائی علمی، مالی، دینی، ملی کسی حیثیت سے بھی سننے میں آجاتی تھی، تو ایسی مستثنیٰ مثالوں پر خوشگوار حیرت ہی ہو کر رہتی تھی. سیٹھ یعقوب حسن مرحوم کی کتاب الہدیٰ اور دکن ٹائمز کے مطالعہ سے سید مرتضیٰ بہادر مرحوم کی ملاقات سے نیز ڈاکٹر عبدالحق کے حالات وصفات سن کر اسی تخیل میں ترمیم خاصی حد تک اب ہو چکی تھی پھر بھی خیال سرے سے دور نہیں ہوا تھا اور اس میں خاصہ دخل یوپی کے پندار تفوق کو بھی تھا. آج مدراس اسٹیشن ہی سے اس قسم کے اوہام وخرافات کی تردید شروع ہو گئی تھی، لوگ جو دیکھنے میں آئے ابھی خاصی صورت شکل، وضع قطع کے. عمارتیں خوب صورت وعالی شان، سڑک صاف ستھری، دکانیں خوب پررونق وشاندار بازار میں پوری چہل پہل ——— اور دل کو مانوس کرنے اور رجھانے والی بڑی بات یہ کہ اسٹیشن پر اترتے ہی بلند آوازیں اسٹیشن کے میگافون سے کانوں میں آنے لگیں، وہ علاوہ

انگریزی اور مقامی زبان کے اردو میں بھی۔

اور آگے بڑھیئے۔ تو نظر ترکی ٹوپیوں پر پڑنے لگی، خود ہمارے میزبان بڑے سرکاری عہدہ پر ہو کر وہی ٹوپی دیے ہوئے تھے۔ یوپی میں بھلا ان کی معقول تعداد اب کہاں! بس خال ہی خال کسی کے سر پر نظر آجاتی ہے حد یہ ہے کہ علی گڑھ سے مفقود ہو گئی ہے۔ حالانکہ وہیں کی یہ خاص الخاص علامت تھی اور کانوکیشن کے موقع پر وائس چانسلر کے لباس کا جزو اب بھی ہے۔ اور ترکی ٹوپی تو خیر طبیعت دنگ رہ گئی یہ دیکھ کر جناح کیپ کا پہننا بھارت ہی کے اس علاقہ میں کوئی جرم نہیں! اچھے اچھے سرکاری عہدہ دار تک بے تکلف جناح کیپ پہنے چلتے پھرتے نظر آئے! ——— کیا یہ دلیل مدراسی مسلمانوں کی غیر معمولی ہمت و جرأت یا مسلم لیگیت، کی ہے ؟ جی نہیں۔ ان میں سے کوئی بات نہیں۔ بلکہ اس آزادی کی لم صرف یہ ہے کہ یہاں کی اکثریت تعصب و تنگ نظری کی شکار اور مسلم کش و مسلم بیزار نہیں۔ مسلمانوں کو اپنا ہی جیسا بھارتی یا ہندوستانی خیال کرتی ہے۔ انھیں ہندوستان کا غدار یا پانچواں کالم نہیں سمجھتی! یہاں کی وزارت شریف، رواداد، وسیع الخیال، فراخ دل قسم کے ہندوؤں کی ہے سمپورنا نندوں اور ترپاٹھیوں کی نہیں ——— اور آگے چلیے، سائن بورڈ علانیہ اور بے محابا جناح ریسٹوران، جناح روڈ، جناح اسٹور قسم کے نظر آنے لگے! یوپی کا مسلمان قدرۃً دنگ و ششدر کہ ان منظروں کو عالم خواب میں سمجھے! یا بیداری میں!

یوپی کے مسافر مدراس پر یہ حقیقت پہلی بار مشاہدہ سے کھلی، کہ اس بھارت کی کم سے کم ایک اسٹیٹ تو ایسی ہے جس کے طول عرض میں اس ۱۱سالہ آزادی کے دور دورہ میں، نہ کوئی مسجد شہید ہوئی، نہ کسی مسجد میں مورتیاں لاکر رکھ دی گئیں، نہ کسی مسجد کو غیر مسلموں کا مسافر خانہ بنایا گیا۔ نہ کسی تختی سے اردو کے حروف چھیل چھیل کر اور کھرچ کھرچ کر مٹائے گئے۔ نہ کوئی مہم اردو کشی یا اردو بیزاری کی شروع ہوئی۔ نہ مسلم اداروں یا اسلامی درس گاہوں کے نام بدل کر کچھ سے کچھ کر دیے گئے۔ نہ مسلمانوں کے خلاف دل آزار نعرے کبھی لگے، نہ مسلم آزار جلوس نکالے گئے، نہ اس لمبی مدت میں مسلمانوں کے خلاف کوئی بلوہ و ہنگامہ یا فساد ہوا۔ نہ مسلمان عورتوں کی کبھی بے حرمتی ہوئی، نہ مسلمانوں پر ملازمتوں کے دروازے بند ہوئے نہ ان کی وفاداری و وطن دوستی کو کبھی شک کی نظر سے دیکھا گیا! ـــــ اور نہ مسلم لیگ بلکہ خود پاکستان کا نام لینا کبھی جرم سمجھا گیا! ـــــ

اللہ اللہ اس بھارت کے اندر علاقے ایسے بھی موجود ہیں! اور نتیجہ قدرۃً یہ ہے کہ یہاں کی اقلیت، اکثریت سے بدگمان و ہراساں نہیں بلکہ اس پر اعتماد کیے ہوئے اور اس کے تمام وطنی معاملوں میں ہم دوش کام کرتی ہوئی تعلیم، تجارت وغیرہ کے اپنے عام مشغلوں میں حسب معمول لگی ہوئی ہے۔

مسجدیں ماشاء اللہ آباد ہیں۔ نمازیوں کی تعداد کے لحاظ سے، اور پر رونق ہیں اپنے ظاہر کے اعتبار سے اور جامع مسجد کا تو خیر کہنا ہی کیا ــــ ادیار کا نام بارہا سنتا تھا۔ ہندوستان ہی کے نہیں، ساری دنیا کے تھیاسوفسٹ گروہ (° ہندو صوفیہ") کا مرکز ہے خیال تھا کہ مضافات مدراس میں کوئی الگ مقام ہوگا۔ آکر معلوم ہوا کہ نہیں عین شہر ہی کے ایک گوشہ میں لب سمندر واقع ہے۔ جا کر دیکھا کئی میل مربع کا احاطہ ہے عمارتیں سکون خاطر دیکسوئی کی تمامتر مظہر۔ اندر ایک قدیم برگد کا درخت اتنا عظیم الشان، کہ اپنی نظیر آپ اور مشہور یہ ہے کہ بہ یک وقت ۱۰ ہزار آدمی اس کے نیچے بیٹھ کر درس لے سکتے ہیں، گرجا مندر، جین مندر وغیرہ دوسرے مذہبوں کے معبدوں کے علاوہ ایک خوشنما چھوٹی سی مسجد بھی اسی احاطہ کے اندر موجود، مغرب کے وقت میزبان و مہمان اور ایک اور رفیق نے مل کر نماز جماعت یہاں ادا کی، اذان دینے کے بعد ادارے کے بانیوں کی روحوں کو اس سے یقیناً خوشی حاصل ہوئی ہوگی۔

کام یہاں کرنے کے دو تھے۔ ایک چھوٹا کام، ایک بڑا کام، چھوٹا کام یہ تھا کہ یونیورسٹی امتحان کے اردو تین پرچے جو میں نے بنائے تھے انھیں یہاں بورڈ آف ماڈریٹرز کے سامنے پیش کر کے خود بھی اس مجلس میں شرکت کی جائے اس قسم کی مجلسوں کی کارروائیاں ایک دستور سا یہ پڑ گیا ہے کہ پبلک میں نہیں لائی جاتیں، حالانکہ درحقیقت کوئی بات ان میں راز کی یا قابل اخفا

نہیں ہوتی، اسی مختصر سی مجلس کے صدر پونا کے پروفیسر بھگوت دیال ورما تھے اور یہ شخصیت خود اس قابل ہے کہ کچھ سطریں توضرور اس کے تعارف کی نذر کر دی جائیں ــــــ یہ ان چند ہندوؤں میں ہیں جنھوں نے معلوم ہوتا ہے اپنی زندگی مسلمانوں ہی کے علوم وفنون و ادبیات کے لئے وقف کر دی ہے، معمر آدمی ہیں فرگیوسن کالج پونا میں فارسی اور اُردو کے اُستاد تھے اور اب پنشن کے بعد بھی بدستور اسی کوچہ کی سیاحی میں مصروف ہیں۔ خود فارسی کے ایم اے ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی کے اور ایک عمر اسی وادی کی سیر میں بسر کیے ہوئے ہیں۔ دیوان حافظ کے ایک بڑے جزو کو ایڈٹ کر چکے ہیں مع اس کے انگریزی ترجمہ کے اور اسی طرح امام غزالی کے نصیحت نامہ کو بھی۔ حافظ کے کام کو تو ایک محض ادبی بیتھری مشغلہ سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن غزالی والا کام تو ایک محض دینی وروحانی قسم کی خدمت ہے۔ مجھ سے مراسلت کئی مہینے قبل سے شروع کر چکے تھے اور ان کا ہر خط نہ صرف ان کے علم و نظر کا بلکہ ان کی اخلاقی بلندی اور ان کی سیرت درویشانہ کا نقش دل پہ بٹھاتا رہا ــــــ اور مجھ پہ کرم اس درجہ کہ میری ہی خاطر سے مجلس کی تاریخیں اتنی موخر کرتے چلے گئے، اور اب جو یہاں ملاقات ہوئی، تو سادگی وتواضع میں وہ اندازے سے بھی بڑھ کر نکلے! بس ایک مجسمۂ انکسار و نیاز تھے اور بات کہتے جھکے جاتے تھے۔ مجلس کے تو خیر صدر رہی تھے، اور سن میں مجھ سے کچھ بڑے لیکن ہر معاملہ میں اپنے کو چھوٹوں سے بھی چھوٹا کر کے رکھا اور ان کے اس کمال پر

مجھے تو رشک سا آ گیا۔

مجلس کی تاریخیں ۲۱ اور ۲۲ کی صبحیں تھیں اور مجلس منعقدہ یونیورسٹی ہی کے کسی ہال میں ہوئی۔ یہیں ملاقات عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے ڈاکٹر عبدالمعید خاں ایڈیٹر اسلامک کلچر سے ہوئی۔ یہ مصر کے سند یافتہ ہیں اور ادبیات عربی کے ماہر، انگریزی سہ ماہی اسلامک کلچر اپنے رنگ میں منفرد ہے اور حیدر آباد کے موجودہ ہمت شکن ماحول میں اسے نکالے جانا بس انھیں کا دل و جگر ہے ــــــ

دوسرے صاحب جن کا ساتھ رہا۔ وہ پروفیسر عبدالوہاب بخاری ایم اے ہیں جو اس وقت پریسڈنسی کالج میں تاریخ کے استاد تھے اور اب ان سطور کی تحریر کے وقت مسلمانوں کے نیو کالج کے پرنسپل ہیں۔ یہ اپنے علمی کمالات اور اخلاقی فضائل کے لحاظ سے اس کے مستحق ہیں کہ اگر مستقل مقالہ نہیں تو ایک چھوٹا سا مقالچہ تو ضرور ان کی نذر کر دیا جائے ۔

چہرہ پر داڑھی اور سر پر ترکی ٹوپی بھی نہیں، جناح ٹوپی، یہ ان کی ملی غیرت و خودداری کے دو نمایاں سائن بورڈ! لیکن ان کی سخت مذہبیت سے مراد ہرگز تعصب، یا تنگ نظری نہیں بلکہ دین میں صلابت ایمانی میں رسوخ اور اسلامی غیرت و حمیت ہے۔ کام میں عزم، سرگرمی اور حسن تدبیر کا جہاں تک تعلق ہے یہ بزرگوار تمام تر ڈاکٹر صاحب ہی کے نقش قدم پر ہیں اور ان کے بہترین و مخلص ترین، رفیق طریق، افضل العلماء بھی شاید انھیں کی طرح علاوہ اپنے فن

کے انگریزی تحریر میں بھی برق، حمایت اسلام و شارع اسلام میں ایک موثر انگریزی رسالہ A GLANCE OF THE PROPHET انھیں کے قلم سے شائع ہو چکا ہے۔ بولنے میں بھی لکھنے سے کم نہیں۔ ذی مروت اتنے کہ جو چاہے پکڑ لے جائے اور تقریر کرا دے، سادگی بے ساختگی اور افراط مروت کی اداؤں کے لحاظ سے بالکل دوسرے علامہ گیلانی — امتحان گاہ کے علاوہ یوں بھی ان کا ساتھ ایک ہفتہ کے قیام میں بار بار رہا۔ ہر بار ان کی طرف کشش بڑھتی ہی گئی اور دل میں اس کی آرزو کرتا رہا کہ ان کی جگہ تو علی گڑھ تھی۔ اس مرکزی ادارہ میں یہ اگر زیادہ عرصہ تک نہیں دو ہی چار برس بطور پرو وائس چانسلر رہ آئیں تو انشاء اللہ وہاں کی بگڑی ہوئی فضا بن جائے اور علمی، دینی و اخلاقی علی گڑھ ہر پہلو سے ایک اصلاحی انقلاب سے روشناس ہو جائے — ڈاکٹر عبدالحق کو لوگ جنوبی ہند کا سر سید کہتے ہیں لیکن سر سید کا ضمیمہ ایک محسن الملک بھی ہوتے ہیں۔ سر سید وقت کو یہ محسن الملک عصر خوب ہاتھ آگیا ایثار کیشہ ایمانی۔ فہم و فراست سب میں اپنے بلند پایہ رفیق کے قدم بہ قدم۔

دوسرا اور اہم تر کام "سیرۃ النبی قرآن مجید کی روشنی میں" کے عنوان پر لکچر دینے کا تھا۔ فرمائش، لکچروں کی تھی وقت کی تنگی کے باعث لکچر پورے چھ تو نہیں، پانچ ہی تیار ہو پائے تھے اور ڈاکٹر صاحب نے انھیں کو کافی خیال

گیا، پہلا لکچر ۱۲ رجنوری سہ پہر کو بعد عصر رکھا گیا۔ یہ تین بابوں میں تقسیم تھا عنوانات تھے۔

(۱) ظہور کی پیش خبریاں۔
(۲) نام، نسب، وطن، زمانہ۔
(۳) ہجرت۔

وقت سہ پہر کا رکھا گیا تھا۔ بعد عصر شروع ہوا اور مغرب کے وقت ختم ہو گیا لکچروں کا مقام نیو کالج کا بالائی ہال رکھا گیا تھا۔ اور پردہ نشینوں کے لئے انتظام الگ تھا۔ خیال یہ تھا کہ ایسے خشک لکچر کو سننے آئے گا کون شاید دس بیس لوگ اکٹھے ہو جائیں۔ لیکن سامعین کی تعداد توقع و اندازہ کے خلاف اچھی خاصی نکلی دہائیوں کی نہیں ابتدائی سینکڑوں کی اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ سننے والوں نے سنا بڑی توجہ و دلچسپی سے ـــــــ معلوم یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے خود یہاں تقریریں کر کر کے مذہبی جلسوں میں آنے والی پبلک کے مذاق کو بھی بلند اور علمی بنا دیا ہے اور لوگ بجائے جذباتی اور محض لطیفوں اور چٹکلوں والے بیان کے علمی، واقعاتی اور کام کی تقریروں کو زیادہ پسند کرنے لگے ہیں۔

بعد کے لکچر بجائے بعد عصر کے بعد مغرب ہوتے اور کوئی گھنٹے گھنٹے بھر میں ختم ہوتے رہے۔ پہلا لکچر تو میں نے خود پڑھا، باقی چار لکچر میری محنت اور زحمت بچانے کے لئے جناب صدر یعنی خود ڈاکٹر صاحب بڑے شستہ طریقہ

سے پڑھ کر سنادیا کرتے۔ یہ چار لکچر مختلف بابوں میں تقسیم تھے اور عنوانات یہ تھے۔

بشریت و رسالت۔

غزوات و محاربات۔

معاصرین { (۱) مشرکین (۲) اہل کتاب (۳) منافقین (۴) مومنین

معجزات و دلائل۔

فضائل و خصائل۔

ازدواجی و خانگی زندگی۔

اختتامیہ۔

سامعین میں قدیم و جدید دونوں گروہ ہوتے تھے اور اہل سنت کے علاوہ کچھ دوسرے فرقوں کے لوگ بھی پابندی سے آنے والے اور بھی متعدد حضرات تھے۔ نام صرف ایک صاحب کا یاد رہ گیا، حاجی نذیر حسین صاحب صدر نیو کالج کمیٹی و صدر ساؤتھ انڈین ایجوکیشنل ایسوسی ایشن۔

آخری دن اختتامیہ کے بعد کا منظر بڑا موثر تھا، محبت کرنے والے سادہ دل مسلمانوں نے چاروں طرف سے مقرر کو گھیر لیا اور فرط عقیدت سے اس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں اور ہونٹوں سے لگانے لگے، مقرر خود

بھی اس مظاہرہ محبت وحسن ظن سے مغلوب ومتاثر ہو کر بے اختیار آنسو بہانے لگا ـــــ محبت فی اللہ اور الحب اللہ ہوتی ہی ایسی موثر ہے!

بال بال اپنے میزبان کا ممنون کرم ہوں. سو خاطروں کی ایک خاطر ان کی طرف سے یہ تھی کہ میرے جذبات کی رعایت اور میرے حفظ اوقات کا پاس انھوں نے اتنا کیا کہ بایدو شاید کچھ یہ نہ تھا کہ ملنے والے: آئے ہوں محبوں اور قدر افزوں کی کمی کی شکایت مجھے کبھی نہیں ہوئی شکایت ان کی کثرت کی ہے. کم وبیش وہی صورت یہاں بھی رہی. خدا معلوم کتنوں نے ملنا یہاں بھی چاہا۔ ڈاکٹر صاحب سب کو خوش اسلوبی سے ٹال لے گئے صرف گنتی کے چند صاحبوں کو مجھ تک پہنچنے دیا. وہ بھی میرا رخ پا کر اور مدت ملاقات کی پابندیوں کے ساتھ کئی صاحب تاجر تھے. دو ایک مولوی صاحبان تھے. اہل حدیث و اہل بدعت دونوں قسم کے. ایک صاحب دکن ٹائمز کے سابق اڈیٹر اور مالک عبدالحمید حسن صاحب تھے. جن سے ملنے کا میں خود مشتاق تھا. قاضی حبیب اللہ صاحب بیچارے علیل و صاحب فراش تھے کوئی آپریشن ہوا تھا. ان کی عیادت کے لیے لے گئے. ایک اہل حدیث مولوی عبدالباری نامے تھے. ان سے ملاقاتیں برابر ہوتی رہیں اعظم گڑھ کے مولانا ابوالجلال ندوی مدت دراز کے بعد یہاں ملے، مدرسہ جمالیہ میں

مدرس ہیں اور اب بوڑھے ہو گئے ہیں۔ قادیانی (احمدی) جماعت یہاں دیہ خلاف پاکستان کے) مظلوم کسی معنی میں بھی نہیں۔ اس کے سنجیدہ مزاج مبلغ شریف احمد امین اور اس کے تیز زبان ہفتہ وار پرچہ کے پرجوش ایڈیٹر کریم اللہ صاحب سے بھی سرسری ملاقات رہی۔ بلاوے بنگلور اور میسور سے بھی اصرار کے ساتھ پہنچتے رہے، زبانی بھی اور تحریری بھی بلکہ ایک صاحب نے تو آمد و رفت کے لئے ہوائی جہاز بھی پیش کر دیا۔ بنگلور سے اردو کے مشہور کارکن صحافی اور شاعر (امی صاحب نے خوش وقت کیا۔ کلام اور گفتگو دونوں سے اپنے وقت کے مولانا ظفر علی خاں نظر آئے۔

منظر یہاں کے قابل دید ایک سے بڑھ کر ایک ہیں سب کہیں گھومنے پھرنے کی فرصت کسے تھی۔ صرف ساحل سمندر دیکھنے کا اتفاق ہوا بڑا دلکش نظارہ ہے۔ قدرت خداوندی کا لاثانی نمونہ بمبئی اور کراچی کے سمندر اس سے قبل دیکھنے میں آچکے تھے۔ اپنے کو یہاں کا منظر بہت زیادہ پرہیبت معلوم ہوا۔ مسجد والاجاہی بھی دیکھنے کے قابل تھی۔ جس کے متصل ایک مستقل خطۂ صالحین ہے۔ ابرار و مشیوخ کا مدفن۔ اور یہیں ایک قطعۂ خاک میں حضرت بحرالعلوم ملا عبدالعلی فرنگی محلی لکھنوی اور ملا عبدالرب کے جسم آسودہ ہیں۔ عالی مرتبت میزبان ایک سہ پہر کو اس چمن بے خزاں کی سیر کرانے لے گئے دل بحرالعلوم کی دینی عظمت اور علمی خدمات کا خیال کر کے خاص طور پر اثر لیتا رہا

وقت بہت اچھا کٹا ـــــــ کسے خبر تھی کہ پورے دو مہینے بھی نہ گزرنے پائیں گے کہ یہی آج کا تندرست، ہشاش بشاش میزبان اسی خطۂ صالحین میں آکر زیر زمین مقیم ہو جائے گا، اور امت کی صف میں ایسا خلا پیدا کر جائے گا جس کا پُر کرنا آسان ہرگز نہ ہوگا!

جس خانگی حادثہ کی اطلاع، مدراس میں قدم رکھتے ہی ملی تھی، اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ دل تمامتر ادھر لگا ہوا تھا، یہ فکر بھی برابر سوار رہتی کہ اپنے حقیقی اکلوتے بھائی کی بالکل اچانک خبر وفات پا کر خدا معلوم بیوی پر کیا گزری جو شروع ہی سے اختلاج زدہ بھی ہیں، مگر جلد دریافت حال کی شکل کیا تھی سوا اس کے ٹیلیفون سے لکھنؤ ٹرنک کال کیا جائے، دوسرے دن شام کو میزبان سے ذکر کیا اور ہر مشکل کی طرح یہ مشکل بھی اسی وقت حل تھی رات کو دس بجے کے قریب اپنے ساتھ مدراس ریڈیو اسٹیشن لے گئے وہاں سے فوراً ایکسچنج کو ٹرنک کال کے لئے فون کیا۔ مدراس سے لکھنؤ براہ راست کوئی سلسلہ نہیں، دہلی ہو کر رابطہ قائم کیا جاتا ہے۔ غرض یہ مرحلے طے ہوئے اور کوئی آدھ گھنٹے کے انتظار کے بعد لکھنؤ سے رابطہ قائم ہوا۔ خود اگر ساتھ نہ ہوتے تو بجائے آدھے گھنٹے کے دو گھنٹے تو ضرور ہی لگ جاتے۔ ممبر پبلک سروس کمیشن کی آواز کا اثر ہی کچھ اور تھا، لیکن اثر محض عہدہ ہی کا نہ تھا۔ عہدے سے زیادہ شخصیت کا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ریلوے اسٹیشن وغیرہ ہر جگہ یہی اندازہ ہوا کہ میزبان

کے عہدہ سے زیادہ ان کی شخصیت کام کر رہی ہے عجب محبوب و جاذب شخصیت پائی تھی اور یہ محبوبیت یوں ہی اور خواہ مخواہ نہیں حاصل ہو گئی تھی، یہ نتیجہ تھا بے لوث خدمت خلق کا! ایک صرف طالبعلموں ہی کو لے لیجئے کسی کی فیس معاف کرا دی کسی کو اپنے پاس سے پڑھوا دیا، کسی کا سفارش کر کے داخلہ کرا دیا اب وہ طالب علم عمر بھر کے لیے ممنون احسان ہو گئے اور ان میں سے کوئی ریلوے میں ہے کوئی ریڈیو میں، کوئی وکیل کوئی تاجر، غرض ہر محکمہ، ہر شعبہ زندگی، ان کے شاگردوں یا ان کے احسان مندوں سے بھرا ہوا "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" کی زندہ تفسیر ا ——— اور یہی بات اس سے قبل حکیم اجمل خاں مرحوم دہلوی اور مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ میں ملی تھی۔

فون پر لکھنؤ میں لڑکی ملی۔ وہ بے وقت اور بالکل اچانک مدراس کے ٹرنک کال کا نام سن کر خود گھبرائی ہوئی تھی۔ بہرحال دو تین منٹ گفتگو رہی اور حالات سن کر تسلی حاصل ہوئی۔ لکھنؤ اور مدراس کے درمیان آواز دہلی ہو کر بہت صاف نہ تھی۔ مشکل ہی سے اور بہت کان لگانے کے بعد ہی سنائی دیتی تھی۔ تاہم ادائے مطلب کی حد تک کام نکل گیا۔ اور فریقین فی الجملہ مفہوم ایک دوسرے کا سمجھ گئے ——— ٹیلیفون تو بہرحال ایک مادی ایجاد ہے اور ٹرنک کال کے لئے بڑی پیچیدہ مشنری اور چھوٹے بڑے کتنے مادی آلات اور میکانکی وسائل کی محتاجی رہتی ہے جن کا انتظام صرف سلطنتیں ہی کر سکتی

ہیں اور پھر کوہ کندن کے بعد کاہ برآوردن ہی، یعنی دائرہ عمل میں محدود در محدود لیکن خود قلب میں اگر مناسبت علوم انبیاء کے ساتھ پیدا ہو جائے تو اس سے ہزار درجہ عجیب تر، عمیق تر، وسیع تر، معلومات ومکشوفات حجرہ کے اندر بیٹھے ہوئے کسی مادی واسطے کے بغیر حاصل ہونے لگیں ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستا!

یہ مکاشفے اگر علوم الہیہ و شرعیہ سے متعلق ہوں جب تو کیا کہنا مناسبت نفوس قدسیہ انبیاء سے پیدا ہو جائے لیکن اگر رسائی یہاں تک نہ ہو صرف علوم تکوینیہ تک محدود رہے جب بھی ایک نعمت ہی ہے۔

ذاتی صدمہ کا اثر قلب پر بہرحال تھا ہی گو اس کا خاصہ اہتمام تھا کہ اس اظہار و اعلان نہ ہونے پائے۔ میزبان نے اس کو بھی تاڑ لیا تھا، چائے وغیرہ کے لیے جب بھی پاس آکر بیٹھتے تو اس سے ملتے جلتے خانگی حادثے اپنے اور دوسروں کے سناتے رہتے ــــــ تعزیت کا یہ بالواسطہ طریقہ براہ راست سے زیادہ چلنا نہ تھا۔

مدراس والے کھلانے پلانے دعوت اور میزبانی کرنے میں کسی سے پیچھے رہنے والے نہیں، لکچروں کے اشتہار، پوسٹر، شائع ہوتے رہتے تھے شام کو

لکچر د ساکے وقت پڑھے لکھوں کا مجمع بھی اچھا ہوجاتا تھا۔ اگر ادھر سے ذرا ڈھیل مل جاتی تو دعوتوں، ضیافتوں کا سلسلہ صبح و شام شروع ہوجاتا اور یوں چل پڑتا کہ گھر پہ کھانے کی نوبت ہی شاید نہ آتی۔ میزبان نے میرا رخ دیکھ کر کسی کو اس کا منھ ہی نہ دیا۔ جب چوتھا لکچر ہوگیا اور قیام کا پانچواں دن ختم تھا تو شب میں ایک دعوت نیو کالج اور جنوبی ہند تعلیمی انجمن کے دونوں کے صدر حاجی نذیر حسین صاحب کے ہاں منظور کرلی گئی۔ یہ حاجی صاحب صورۃً "صاحب" ہیں ماشاءاللہ دیندار مسلمان ہیں، چمڑے کی تجارت کرتے ہیں اور شہر کے ایک تاجر اعظم ہیں ہر لکچر میں پابندی کے ساتھ شروع سے آخر تک موجود رہتے اور توجہ و دلچسپی کے ساتھ سنتے۔ رہنے والے قصور (علاقہ پنجاب) کے ہیں اور مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم کے عزیز قریب۔ ایسے مخلص کی دعوت قبول کرنے میں تامل ہی کیا ہوسکتا تھا تامل کیا معنی یہ موقع تو بسروچشم قبول کرنے کا ہوتا ہے ——— لکچر کے بعد سیدھے وہیں گئے۔ رہتے ذرا فاصلہ پر ہیں۔ نمبر ۵ پیری ہائی روڈ۔ کوٹھی دیکھی تو ماشاءاللہ دلہن بنی ہوئی۔ خوب آراستہ دلق ودق (جب کسی بڑے اور کامیاب مسلمان تاجر سے ملاقات ہوتی ہے تو طبیعت اندر سے کھل اٹھتی ہے اور مدراس میں بحمداللہ ایسے مسلمانوں کی کمی نہیں) دعوت میں صرف چند لوگ تھے اور یہ میرے مذاق کی رعایت سے بہت بڑی اور اہم چیز تھی۔ میزبان اور مہمان خصوصی ملاکر کل بارہ آدمی تھے۔ ملاقات اور بے تکلف گفتگو کا لطف

صرف ایسی ہی مختصر تعداد میں رہ سکتا ہے ورنہ پھر تو مجمع ہو جاتا ہے اور تکلفات پبلک تقریب کے شروع ہو جاتے ہیں۔

حاضرین میں سے دو چار نام خصوصیت سے یاد رہ گئے۔ ایک آنریبل بشیر احمد سعید صاحب ایم اے ال ال بی جج ہائی کورٹ مدراس، ان سے نیاز پہلے لکچر میں حاصل ہو چکا تھا معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے خاص رفیقوں میں ہیں، اور یہاں کے سارے اسلامی اور ملی کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ دوسرے جناب محی الدین صاحب ام ال اے متولی مدرسہ جمالیہ مدراس وصدر جمال محمد کالج کمیٹی ترچناپلی۔ تیسرے عبدالمجید صاحب بی اے سکرٹری جنوبی ہند تعلیمی انجمن۔ ان کے علاوہ دو ایک اور پنشنر عہدہ دار تھے اور ایک تاجر اور ایک ڈاکٹر اور ان سب کے علاوہ پروفیسر عبدالوہاب بخاری، ہمارے ڈاکٹر صاحب کے رفیق خاص الخاص۔ بے تکلف صحبت تھی سب سے کھل کر باتیں رہیں ـــــــ اور کھانے کے نفیس و اعلیٰ ہونے کا کہنا ہی کیا۔ حاجی صاحب کی مشرقیت ومغربیت کے امتزاج کا رنگ کھانے میں بھی نمایاں تھا۔ واپسی قدرۃً ذرا دیر کر کے ہوئی۔ اور جسٹس سعید صاحب اپنی گاڑی پر ہم لوگوں کو اتار گئے۔ دوسرے موقعوں کی طرح یہاں بھی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ ہندو مسلم کشمکش جو شمالی ہند میں برپا ہے اور جس جارحانہ ومتعصب ہندویت کا شکار ہم لوگوں کو یوپی میں بنا رہنا پڑتا ہے اس کا

یہاں جنوبی ہند میں کہیں پتا بھی نہیں۔ یہیں ملاقات جماعت تبلیغی کے ایک گشتی دستے سے ہوگئی جو اتفاق سے وارد ہوگیا تھا۔ ۸۔۱۰ آدمی تھے۔ سب اپنے اسی رنگ میں مست، دور دور سے آئے ہوئے بعض تو بڑے صاحب فہم و تدبیر نظر آئے۔

پانچواں اور آخری لکچر ۲ر جنوری کو اول شب میں ختم ہوا۔ اور آج ہی یہاں سے روانہ ہوجانا تھا۔ سرکاری رقمیں وصول بڑی دیر میں ہوتی ہیں، اور درمیانی مرحلے بل بناکر بھیجنے ان کے پاس کرانے وغیرہ کے دشواریوں سے طے پاتے ہیں برسوں کے تجربے کے خلاف یہاں کوئی دقت نہیں ہوئی، اور جو رقم بھی واجب تھی بلا کھٹکے دن ہی میں وصول ہوگئی۔ یہ سب انھیں ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفیق خصوصی پروفیسر بخاری کے حسن کارکردگی ہے۔ آخری لکچر کے بعد کالج ہال سے رخصتی کو سماں بڑا موثر تھا۔ خوش عقیدہ مسلمان لکچرار پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ جیسے کسی بزرگ کو اس کے معتقدین دست بوسی کے لیے گھیر لیتے ہیں! اخلاص و اخوت کے اس بے پناہ مظاہرہ پر دل بھر آنا قدرتی تھا۔ خیر خوب رُو رلا کر یہاں سے نکلنا ہوا۔

اس ۶۔۵ دن کے قیام میں ڈاکٹر صاحب کے علاوہ ان کے گھر والوں نے لڑکوں اور بچیوں نے سب نے اپنی محبت و افراط خدمت سے

دل موہ لیا تھا۔ انھیں خدا حافظ کہتے وقت کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دا پسی پردیس سے نہیں بلکہ جدائی وطن سے ہو رہی ہے! ایک دن کے لئے ٹھہرنے کا وعدہ ڈاکٹر صاحب کے وطن کرنول (آندھرا) کے لئے ہو چکا تھا رخ اس وقت اپنے وطن نہیں ڈاکٹر صاحب کے وطن کی طرف تھا۔

صورت حال کا تقاضا طبعی طور پر اس وقت یہ تھا کہ وطن جلد سے جلد پہنچا جائے اور اپنی بیوی ان کی والدہ اور مرحوم کی بیوی بچوں سے تعزیت کی جائے۔ ایک دن کیا معنی ایک ایک گھنٹہ بھاری ہو رہا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کے وطن کی کشش بھی کچھ کم نہ نکلی۔ ڈاکٹر صاحب مع اپنے بڑے صاحبزادہ میاں انوار الحق ایم اے کے (جو کسی کالج میں لکچرر ہیں) خود بھی ساتھ چل رہے تھے۔ بلکہ وہی تو مجھے لیے چل رہے تھے۔ اس لیے ٹکٹ کا سارا انتظام انھیں کے سر رہا۔ (اور دا) ایک [illegible] ڈاکٹر صاحب نے [illegible] سے ممنون اور محجوب ہوا [illegible] اسٹیشن [illegible] آئے۔

نو بجے کے [illegible] اسٹیشن سے [illegible] ۹ بجے بس میں واڑی کی جانب روانہ ہو گیا۔ چلتے وقت دل نے [illegible] اسٹیشن کے [illegible] (اعلانچی) کی آواز علاوہ انگریزی کے [illegible] میں بھی آتی! [illegible] مدراس تک کبھی [illegible] تک کبھی نہیں آیا تھا۔

آخر کیا صورت اس کی ہوگی کہ کرنول جیسے دور افتادہ اور غیر مرکزی مقام کا سفر وہ بھی اس سن میں پہنچ کر کرنا ہوگا؟ لیکن وہ حکیم مطلق جس نیت کو چاہے آن کی آن میں ہست کر دکھلائے اور جس متبعد کو چاہے ناگزیر بنادے! یہاں اسباب وحالات ہی ایسے اکٹھے ہوگئے ——— نماز فجر ریل ہی پر ہوئی۔ اور ۲۶ رجنوری کا سورج طلوع ہو رہا تھا کہ ایک بڑے اسٹیشن پر گاڑی رکی، اور ہم لوگ کرنول کے لیے اُترے، ناشتے کا انتظام بھلا ڈاکٹر صاحب جیسے خوش انتظام کیسے نہ رکھتے۔ کچھ دیر بعد ناشتہ کر کرا یہاں سے روانہ ہوئے۔ کرنول شاید ۷۰، ۸۰ میل کے فاصلہ پر تھا۔ لاری آتی جاتی ہے، ملازم کو سامان سمیت اس پر جگہ ملی۔ ہم لوگوں کے لیے خصوصی انتظام کار کا تھا۔ ڈاکٹر صاحب میرے پہلو میں اور صاحبزادے کار چلانے والے، طبیہ کالج کرنول کے ایک طالب علم بطور رہنا ہمراہ چلتے چلتے کچھ پہاڑی اور کچھ میدانی علاقے کے پر پیچ وخم سے گزرتے اور قدم قدم پر اس طرح کے زندگی کے نشیب وفراز کو یاد کرتے کراتے۔ کوئی ۱۰، ½ ۱۰ بجے کرنول پہنچ گئے۔ کرنول کچھ دن کے لیے آندھرا صوبہ کا دار الحکومت بھی رہا تھا۔ اس لئے علاوہ پرانی آبادی کے۔ نئی سرکاری عمارتوں کا ایک پورا شہر کا شہر آباد! حد نظر تک یہی سلسلہ اور اس کے بعد پھر ایک خاصہ شہر خود ڈاکٹر عبد الحق کا آباد کیا ہوا! ——— عثمانیہ ڈگری کالج، دار العلوم عربی، یونانی طبی کالج۔ یہ بورڈنگ وہ بورڈنگ، ادھر لائبریری، اُدھر دواخانہ، اِدھر میوزیم اُدھر مسجد، درسگاہوں اور ان کے متعلقات

کا ایک پورا جال بچھا ہوا۔ اجنبی نو وارد تو انھیں دیکھ کر ہی چکرا جائے۔ سرسری نظر میں تفصیل و تعداد یاد رکھنا کس کے بس کی بات ہے! ظاہری آب و تاب میں اگر اس سرکاری شہر کے ٹکر کا نہیں، تو اللہ کے ایک مخلص و خاکسار بندے کا بسایا ہوا شہر گرمیٔ اخلاص و رونق حیات میں کچھ اس سے کم بھی نہیں! بہ قول حضرت جوہرؔ ؎

میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد!

حق تو یہ تھا کہ اس کا نام "عبدالحق نگر" رکھ دیا جاتا۔

کالج کا نام "عثمانیہ کالج"! ۱۹۴۸ء کی تسخیر حیدر آباد کے بعد یہ نام رکھنے کی جرأت ڈاکٹر عبدالحق ہی کا حصہ تھا! پرنسپل صاحب بڑھ کر ملے۔ ۴۵ سال قبل کا تعارف یاد دلایا۔ معلوم ہوا کہ ۱۹۱۲ء ۱۹۱۳ء میں علی گڑھ میں اسی ہوسٹل میں یہ بھی تھے! آدمی بات چیت سے اچھے معلوم ہوئے، ڈاکٹر صاحب دیانت، کام کی اہلیت اور فرض شناسی کی تعریف پہلے کر چکے تھے۔ کسی نے سرگوشی کی، کہ قادیانی (احمدی) مسلک کے ہیں! یہ چیز بھی جنوبی ہند ہی میں سن پڑی، شمالی ہند میں آسان نہیں (اور پاکستان میں تو خیر ممکن ہی نہیں) کہ کسی اسلامی درسگاہ کا افسر اعلا کوئی" قادیانی ہو"! ــــــ گشت کر کے دیکھا جن مقامات کو دیکھا جا سکا:" لائبریری، دواخانہ وغیرہ ...... اور ہر چیز خوب اُجلی ستھری، باقاعدہ

پائی - ڈسپنسری کے انچارج ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سادگی میں افضل العلماء ہی کے رنگ میں رنگے ہوئے۔ مسجد کو جاکر دیکھا، جہاں محترم میزبان کے والد ماجد اور وقت کے مشہور فاضل و مجاہد، مولانا محمد عمرؒ آسودۂ خاک ہیں (وفات کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا دس ہی بارہ برس ہوئے ہوں گے) اس معمولی سے غریبانہ مکان کو جاکر دیکھا، جہاں ڈاکٹر عبدالحق کی پیدائش ہوئی تھی اور پھر اس سادہ کمرہ کو بھی آکر دیکھا جہاں یہ ذی جاہ سرکاری افسر مدراس کی پرتکلف کوٹھی میں رہنے سہنے کا عادی، اب بھی کبھی کبھی آکر ٹھہرتا ہے۔ اس کمرہ کا سادہ نصابی قسم کا فرنیچر۔ اچھا خاصا دعوت فکر و بصیرت دیتا معلوم ہوا ــــ دوپہر کا کھانا، سہ پہر کی چائے، لڑکوں کی آمد و رفت، استادوں کی ملاقات ہر شے سادگی، بے تکلفی کے معیار کے مطابق رہی۔ بار خاطر کہیں سے بھی نہ ہونے پائی اور نہ کوئی ہجوم و مجمع ہونے پایا۔ لوگ آتے لڑکے اور بڑے دونوں اکٹھے ہونے لگتے۔ ڈاکٹر صاحب ہر مرتبہ کسی حکمت عملی سے سب کو ٹال دیتے۔

مطالبہ اور اصرار شروع ہوا کہ یہاں بھی کوئی لکچر دیا جائے (ایڈرس کے پیش ہونے کی تو قطعی ممانعت پہلے سے کی جا چکی تھی) اس کا حل فہیم و فریس میزبان نے یہ نکالا کہ انھیں تازہ مدراسی لکچروں کا مجموعہ جو ہمراہ ہے۔ ان میں سے ایک لکچر یہاں بھی پڑھ کر سنا دیا جائے۔ بلکہ خود ہی میری طرف سے عثمانیہ کالج ہال میں پڑھ کر سنا بھی دیا۔ مجھے کرنا جو کچھ پڑا وہ صرف یہ کہ اس ہال تک جانا

اور وہاں ڈائس پر خاموش بیٹھا رہنا پڑا! ــــ میزبان کی انھیں اداؤں نے تو شروع سے آخر تک ان کا گرویدہ مجھے بنائے رکھا، مخلصین تو پھر بھی اچھی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ لیکن ایسے صاحب فہم، مزاج شناس مخلص جو مہمان کے مذاق کی رعایت قدم قدم پر رکھیں اور اپنی مرضی پر اس کی خوشی کو غالب رہنے دیں، بس شاذونادر ہی کہیں نصیب ہوتے ہیں، ورنہ عموماً تو اس کی حسرت ہی رہ جاتی ہے!

مردم اندر حسرت فہم درست

اتفاق سے آج شب میں کالج کے طلبہ کا سالانہ ڈنر تھا۔ رات کو کھانا وہیں کھایا اور ہر طرح خوش واپس ہوا۔ گیا تھا ڈرتے ڈرتے لیکن ایک چیز بھی خلاف مذاق پیش نہ آئی، نہ شور و شغب، نہ کسی قسم کی کش مکش اور چپقلش، سینکڑوں مہمانوں اور پھر طالبعلموں کے ہجوم میں اتنا نظم و سلیقہ قائم رکھنا آسان نہ تھا۔ اور کھانوں کی لذت کو تو بس پوچھیے ہی نہیں خیال ہی نہ تھا کہ ایسا لذیذ و نفیس کھانا بجز لکھنؤ کے اور بھی کہیں کھایا جا سکتا ہے! خصوصاً جنوبی ہند کی طرف سے خاصی بدظنی جمی ہوئی تھی وہ سب ایک ڈنر نے کافور کر دی۔ ڈنر ہی پر ملاقات شہر کے حاکموں افسروں سے رہی۔ غیر مسلم بھی تھے مگر سب مہذب و شائستہ۔

رات کے دس بجے تھے کہ اسٹیشن آ گئے۔ کرنول اسٹیشن چھوٹی لائن پر واقع ہے اور یہ گاڑی حیدر آباد پر ختم ہوتی ہے۔ کرنول سے لکھنؤ آنے کے لئے اس کے سوا کوئی اور راستہ ہی نہ تھا اور اسی لئے حیدر آباد ہو کر گزرنا پڑا، ورنہ حیدر آباد تو ایک منزل مقصود کا درجہ رکھتا تھا اسے خواہ مخواہ محض رہگزر کی حیثیت دینے پر طبیعت آمادہ کیونکر ہو سکتی تھی! ـــــ آج کے بھی ریل کے سارے انتظامات ڈاکٹر صاحب ہی کے سر تھے اور سب بہ حسن و خوبی انجام پا گئے۔ گاڑی جب چھوٹنے پر ہوئی اور دس بیس انسانوں کے مختصر سے مجمع کے ساتھ ڈاکٹر صاحب خود بھی رخصت ہونے لگے تو ان کی مسلسل عنایتوں اور پیہم نوازشوں سے متشکر و متاثر قلب نے رخصتی مصافحہ کے ساتھ اجازت صرف اس دعا کی زبان کو دی کہ

"اللہ آپ کے اخلاص کو قائم و برقرار رکھے!"

ـــــ دعا سرسری اور بے معنی نہ تھی۔ چند روز کی یکجائی سے پورا اندازہ ہو گیا تھا، کہ ڈاکٹر صاحب کی مرجعیت کی کوئی حد نہیں اور ان کی محبوبیت قابل رشک حد تک ہے۔ حاضر و غائب ہر شخص ان کا شکر گزار اور ان کا مدح گو یہ مدح خلق کا فتنہ دنیا کے سخت ترین فتنوں میں سے ہے۔ اچھا ہے کہ ہر نیک نفس انسان کے پیچھے کچھ لوگ پڑے رہیں اور کچھ معاند اس پر مسلط رہیں۔ نفس اسی سے اصلاح پاتا رہتا ہے ورنہ یکسر مدح و تحسین تو نفس کو غفلت

میں غرق کردینے اور غارت کرڈالنے کے لئے بالکل کافی ہے۔ انسان کی اپنی طرف سے غفلت بھی شیطان کی سب سے بڑی شکارگاہ ہے!

وہ رخصتی ملاقات اور الوداعی مصافحہ کون جان سکتا تھا کہ اس فرشتہ صفت انسان سے اس عالم ناسوت میں آخری مصافحہ ہے! یہ قلم مبالغہ کا عادی نہیں اور فرشتہ صفت کا لفظ یونہی بے خیالی میں نہیں نکل گیا۔ اتنے صفات اور اتنے کمالات کا جامع میں نے اپنے تجربہ میں بہت کم کسی کو پایا ہے۔ بعض میں خوبیاں بیشک بہت پائی گئیں۔ لیکن ساتھ ہی بشریت کی شدید نمایاں کمزوریاں بھی شامل رہیں۔ ان مرحوم میں چند روز کے سابقہ کے اندر کوئی چیز ایسی نہ ملی۔ جسے ان کے اخلاقی بہی کھاتے میں بجائے نفع کے خانے کے خسارہ کے خانے میں ڈالوں! عجیب وغریب شخصیت تھی۔ ہر طرح متوازن، اس وقت ملت مرحوم کے اندھیرے گھر کا چراغ! افسوس ہے کہ ملت اپنے اس محسن کی پوری قدر نہ پہچان سکی اور قبل اس کے کہ وہ عمر طبعی کو پہنچ کر زیادہ سے زیادہ خدمات کا خزانہ اگل سکیں خود انھیں کو واپس بلالیا!

تو نظیری زفلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی وکس قدر تو نشناخت دریغ

دینی معاملات میں لوگ یا تو اتنے کٹر ملتے ہیں کہ ہر قدامت کو حقیقت کا مرادف سمجھتے ہیں۔ اور حالی کی اعلا سے اعلا تحقیقات کی طرف توجہ کرنا معصیت

سمجھ بیٹھتے ہیں، اور یا پھر ایسے کہ روشن خیالی پر آئے تو رطب و یابس ہر جدید شئے کو نگلتے ہی چلے گئے۔ یہ بات صرف نادر شاہ افغانی شہید (ظاہر شاہ موجودہ فرمانروائے افغانستان کے والد مرحوم) کے بارے میں سننے میں آئی تھی کہ ایک طرف وہ بڑے راسخ دیندار تھے اور دوسری طرف ہر جدید اصلاح کے لیے ان کا دل کشادہ تھا اپنے جاننے والوں میں یہ وصف صرف انھیں مرحوم میں پایا تھا۔ بہرحال کوئی مانے یا نہ مانے اپنی شہادت تو اس عالم سے لے کر اُس عالم تک بس وہی رہے گی جو کچھ اپنی آنکھوں کو نظر آچکی ہے ؎

مدح توحیف ست با زندانیاں
گویم اندر مجمع روحانیاں!

چھوٹے ڈبے (کوپے) میں کوئی اور مسافر نہ تھا، صبح کے قریب ایک ہندو صاحب انگریزی سوٹ میں ملبوس آئے۔ بعد نماز فجر ان سے گفتگو شروع ہوئی۔ قدرتہً انگریزی میں معلوم ہوا کہ ریلوے ہی کے کوئی عہدہ دار ہیں تلنگانہ کے رہنے والے اور کرکٹ کے مشہور کھلاڑی نائیڈو کے ہم خاندان۔ اس کے بعد ان سے جو سوال و جواب ہوئے وہ مختصراً حسب ذیل ہیں:۔

آپ کی مادری زبان تو تلنگی ہوگی؟

جی ہاں تلنگی اور اُردو

اچھا؟ اردو بھی؟ نہ کہ ہندی؟

جی نہیں، ہندی تو میں لکھ پڑھ بھی نہیں سکتا، سارا کام اُردو میں بے تکلف
کرتا ہوں۔ اس کے بعد گفتگو اُردو میں ہونے لگی اور واقع وہ خوب شستہ اُردو
بول رہے تھے، ہندی سے سخت بیزار تھے۔ بولے کہ ہم سب لوگ اردو پر جان
دیتے ہیں اور ہندی کو اپنے حق میں ایک مصیبت سمجھتے ہیں ـــــ جی بے اختیار
چاہا کیا کہ کاش ہمارے یوپی کے وزیر اعلیٰ بہادر ہم سفر ہوتے اور اپنے کانوں
سے ایک غیر مسلم دکھنی کے یہ بیانات سن لیتے! کرنل نائیڈو کے نام سے ذہن قدرۃً
اس قبیلہ کی ایک دوسری شاخ کی مشہور و معروف مسز سروجنی نائیڈو کی طرف
منتقل ہوا۔ بچاری کا وقت موعود اگر نہ آگیا ہوتا اور لکھنؤ کی خاک میں ۱۹۴۹ء
میں نہ مل چکی ہوتیں تو اردو کی جان برخاص لکھنؤ ہی کی سرزمین پر یہ ستم ٹوٹتے
دیکھ عجب نہیں کہ خود ان کا جگر بھی شق ہو گیا ہوتا! "تسخیر حیدر آباد" سے ان کے
شریف قلب نے جو اثر لیا تھا وہی کیا کم تھا۔

---

۲۰ کی بعد نماز فجر صبح قریب تھی کہ بلدہ حیدر آباد کا سواد شروع ہو گیا
اور تصور کے سامنے ۴۱ سال قبل کی یادداشتیں ہجوم کرنے لگیں۔ یکم ستمبر ۱۹۱۱ء
کی صبح تھی کہ اسی طرح چھوٹی لائن سے براہ راست اورنگ آباد آتے پہلے پہل
حیدر آباد کا سواد شروع ہوا تھا۔ مگر جب کیا تھا اور اب کیا ہے! اس وقت
اپنی صبح زندگی کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا آج اپنی شام زندگی کی شفق پھول رہی

ہے ہر سانس میں ایک تازگی تھی، ہر جنبش میں ایک امنگ تھی، کن کن آرزوؤں کیسی کیسی تمناؤں کے ساتھ حیدر آباد کا نام زبان پر آتا تھا۔

زباں پہ یہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا

وہ دن سارے کے سارے خواب و خیال ہو گئے اور اپنے پیچھے حسرتوں کا ایک انبار دل کے داغوں کا ایک طومار چھوڑ گئے! کتنی آرزوؤں کا مرجع تو ایک اپنا ہی جیسا انسان تھا: "اعلیٰ حضرت" "قدر بندگان عالی، مظفر الملک الممالک" "ہز اگزالٹڈ ہائینس" جی، سی، ایس، آئی، وفادار سلطنت برطانیہ اور خدا معلوم اور کیا کیا! کتنے القاب، کتنے خطابات انسان ہی نے ایک انسان کے لیے گڑھ لیے تھے! ہزار ہا میل مربع علاقہ کا مالک و مختار لاکھوں نہیں کروڑوں "رعایا" کا "خدائے مجازی" زندہ وہ آج ہے لیکن ہر خلعت شاہی و سرداری سے معرا۔ حاکم بڑا کیا معنی، اب چھوٹا بھی نہیں! گورنر اور راج پرمکھ بھی نہیں محض ہماری اور آپ کی طرح کا ایک عام شہری! عبرت کی تصویر۔ تؤتی الملک من تشاء تنزع الملک ممن تشاء کی چلتی جاگتی تفسیر! ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۸ء تک اور بھی بار بار حیدر آباد جانا لگا رہا، یکلخت ناغہ حاضری کا ۱۹۳۸ء سے ہے۔ اللہ اکبر اس ۲۰ برس میں دنیا کیا سے کیا ہو گئی! "انقلاب" تو ساری دنیا ہی میں آ کر رہا، لیکن حیدر آباد کی قیامت خیزیوں کے لئے خود یہ لفظ بھی ہلکا اور ناکافی نظر آتا ہے۔ کاش کوئی لفظ لغت میں اس سے زیادہ واضح

جاندار و زوردار موجود ہوتا!

صبح ہوئی سورج کی شعاعیں پھوٹیں اور حیدرآباد کا چھوٹا اسٹیشن کاچی گوڑہ آگیا! کیسے کیسے دوست عزیز و محب، دن کا وقت ہو کہ رات کا اسی پلیٹ فارم پر لینے اور پیشوائی کرنے آچکے تھے! آج سناٹا تھا محبوں مخلصوں کی بحمداللہ آج بھی کمی نہیں۔ ذرا اخبر ہو گئی ہوتی تو آج ہجوم شاید پہلے سے زیادہ لگ گیا ہوتا! لیکن اسی ہجوم ہی سے تو بچنا مقصود تھا جس نے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور خصوصی عزیزوں، مخلصوں کو بھی مسرت دید سے محروم رکھا! اور یوں اترنا ہوا کہ جیسے یہ شہر بالکل اجنبیوں کا ہو۔ طبیعت نادان دوستوں پر کیسی کیسی جھنجھلائی جنھوں نے بالکل خلاف مصلحت اعلان عام کر کے مخصوصین کی بھی حق تلفی کرادی اور خود اپنی بھی! ـــــ ویٹنگ روم بالکل سامنے تھا، خاموشی سے اتر کر کچھ وقت گزاری وہیں کی۔ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کا ساتھ کیا ہوا ناشتہ کام آیا۔ کرنول کی مٹھائیاں یوں بھی مشہور رہے اور پھر اس ساتھ والی مٹھائی میں تو خدا معلوم اخلاص کی کتنی شیرینیاں اور حلاوتیں شامل تھیں ـــــ آزاد ہو کر بھی کتنی قید میں تھا۔ جی بے اختیار تڑپ رہا تھا کہ کھا کر چلیے پھر یے اور زندہ و مرحوم جن جن مخلصین کے آستانوں پر چاہیے حاضری دیجیے! بہادر یار جنگ مرحوم، امین الحسن بسمل مرحوم، اختر یار جنگ مرحوم ہوش یار جنگ مرحوم فصاحت جنگ جلیل مرحوم، احمد محی الدین مرحوم خدا معلوم کتنے مرحوموں کے مزارات

یہ حاضری کی تمنا دل کی دل ہی میں گھٹ کر رہی!

ناظر یار جنگ بہادر خود اسی خانگی صدمہ کے سلسلہ میں اس وقت حیدر آباد چھوڑ چکے تھے، تاہم ان کی کوٹھی (منزل عدل حیدر گوڑہ) تک جانا ضروری تھا۔ وہیں ایک اور عزیز مل گئے۔ اصرار بلیغ کر کے کئی گھنٹے روک کے رکھا ناظر یار جنگ کا کتب خانہ اچھا خاصہ ہے وہ کھلا ہوا تھا اور مشغول رکھنے کے لیے بالکل کافی تھا۔ یہیں کسی طرح سراغ رسی کر کے ایک مخلص قدیم نظام کالج کے لکچرر غلام دستگیر رشید ایم اے پہنچ گئے اور ان کے ہمراہ عربی کے استاد احمد حسین خاں صاحب تھے۔ لکھنو کی گاڑی شب کو ملنا تھی اتنے گھنٹے گزارنے ناگزیر تھے۔ سہ پہر کو بڑے اسٹیشن آگیا، باغ عامہ اور عماد الملک مرحوم کی کوٹھی، (راک لینڈز) وغیرہ کی دور سے زیارت کرتا ہوا، راستہ واستے سبھی کتنے بدل چکے تھے پھر بھی پرانے نقوش کچھ دھندلے سے باقی تھے۔ نلگنڈہ کے ایک مخلص کو مدراس سے اطلاع دے دی تھی اور اسی ڈیننگ روم کا پتا دے دیا تھا، وہ اطلاع انھیں بعد از وقت پہنچی ورنہ وہ جس طرح بھی ممکن ہوتا اپنے کو پہنچا کر رہتے۔

گاڑی میں اب بھی دو ڈھائی گھنٹے کی دیر تھی۔ جی میں آئی کہ اسٹیشن سے ڈاکخانہ (پرانے امپیریل پوسٹ آفس) تک کی سیر پاپیادہ کر لی جائے۔ یہ اسٹیشن روڈ

وہ تھی کہ مدتوں اسی پر رہتا ہوا تھا اور اس کا چپہ چپہ آنکھوں میں بسا ہوا تھا عصر کا وقت، آخر ہو رہا تھا۔ سڑک پر وہ ہجوم، سواریوں کی وہ ریل پیل کہ ۱۵، ۲۰ منٹ والی مسافت، ۴۰ منٹ میں طے ہوئی! اپنے کو دوسروں کی نگاہوں سے بچائے رکھنا بھی مقصود تھا کہ شاید کہیں کوئی پہچان نہ لے۔ رائے مرلی دھر کا مکان مالگذاری کی کچہری، کئی پرانی عمارتیں، ۴۰ برس قبل کی، شناخت میں آگئیں اپنے مکان کے دروازہ پر جاکر کھڑا رہا جو سڑک سے اندر چند قدم گلی میں جسٹس خلیل الزماں کی کوٹھی کے بغل میں واقع ہے۔ اس وقت کی حسرتوں کا کیا بیان ہو! کل جو اس کا مکین تھا آج اجنبی محض کی حیثیت سے اتنی بھی ہمت نہیں رکھتا کہ پھاٹک ہی میں داخل ہو جائے! کچھ چھوٹے بچے بچیاں اس کی چھت پر کھیلتے دکھائی دیے! ــــ دنیا اور اس کے سارے مالوفات بے وفائی اور بے ثباتی میں اس کی ٹکر کے ہیں! ــــ ہاں مسز نائیڈو کی کوٹھی "گولڈن تھرشولڈ" جس کا ترجمہ مولوی ظفر علی خاں مرحوم نے "زرفشاں" کیا تھا۔ نظر نہ آئی۔ ضرور ہے کہ کسی اور کوٹھی میں مدغم ہو گئی ہو!

مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے!

ایسے ہی موقع کے لیے ہے۔

حیدرآباد کا یہ سرسری درسرسری (یا بادصرصر کی سرعت کی مناسبت سے "صرصری") مشاہدہ الحمد للہ کہ اتنا مایوس کن وغم انگیز نہ نکلا جتنا ڈر رہا تھا۔

• ترکی ٹوپیاں اچھی خاصی دکھائی دیں اور سڑکوں پر اردو کی پرانی تختیوں پر بار بار نظر پڑی، یوپی کی طرح اردو دشمنی کا جنون بہرحال اس حد تک نہیں پہنچا کہ اردو حروف کھرچ کھرچ کر مٹائے جائیں، مغرب کی نماز کا سلام اپنی گاڑی میں پھرا ہی تھا کہ رشید صاحب مع مولانا احمد حسین خاں کے اسٹیشن ہی آ گئے اور گاڑی گھنٹہ بھر بعد روانہ ہو گئی، ناگپور پر کوئی صاحب اسٹیشن پر نہ ملے۔ خط دیر میں پہنچا، بھوپال جنکشن پر ابکی پھر وہاں کے مخلصوں، محبوں نے مسافر نوازی کا حق ادا کر دیا، جھانسی میں گاڑی رات کو بہت ناوقت تبدیل کرنا پڑی، جی، ٹی، ایکسپریس سیدھی دہلی چلی گئی، جھانسی سے کانپور کے لئے ایک پسنجر ملتی ہے۔ ۲۹ کو دوپہر کا وقت تھا کہ لکھنؤ کا پلیٹ فارم آ گیا، ۱۱ر۱۲ دن قبل کا نکلا ہوا مسافر لکھنؤ زندہ سلامت واپس پہنچ گیا اور اب صرف ایک منزل دریاباد تک پہنچنے کی باقی رہ گئی۔

یہ معاملہ تو گنتی کے چند دنوں کے سفر کا تھا۔ زندگی بھر کا سفر ۶۰ اور ۷۰ اور ۸۰ اور اس سے بھی بڑی بڑی عمروں کا سفر اسی طرح آناً فاناً ختم ہو جاتا ہے اور غافل دعاجز بندہ بس دیکھتے کا دیکھتے ہی رہ جاتا ہے!

بنائے حیات دو روزے بنود بیش
آں ہم کلیم با تو چہ گویم چساں گزشت
یک روز صرف بستن دل شد بہ ایں و آں
روزے دگر بہ کندن دل زیں و آں گزشت

(صدق جدید ۱۹۵۸ء)

سفر مدراس — ۱۲ سال بعد" (۲۸ اگست ۱۹۷۰ء)

جنوری ۱۹۵۸ء کا زمانہ تھا کہ ایک مخلص بے بدل اور فاضل گرامی افضل العلما ڈاکٹر عبدالحق کرنولی کی قدر افزائی صدق کے گوشہ نشین محرّر کو گھسیٹ کر مدراس لے گئی تھی اور اس سے چھ خطبے ایک ایک دن کے وقفہ سے "سیرت نبوی قرآن سے" کے موضوع پر دلوائے۔ وہی توفیق ربانی ابکی بیر شامل حال رہی اور مہینوں پیشتر سے سرزمین مدراس سے دعوت کے پیام بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں آنے شروع ہوگئے۔ سال کے ابتدائی مہینے تھے۔ مدراس یونیورسٹی کے صدر شعبۂ عربی و فارسی افضل العلما ڈاکٹر محمد یوسف کوکن (شاگرد خاص مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم) دارالمصنفین اعظم گڑھ آئے تو یہ پیام زبانی ساتھ لائے۔ سفر کا چور تو پہلے ہی سے تھا اب ۱۲ سال کی مدت گزرجانے کے بعد کہیں زیادہ سفر چور ہوگیا خصوصاً آنکھوں کی معذوری بہت زیادہ ہوجانے کے باعث۔ پہلے ارادہ تو انکار و معذرت ہی کا ہوا پھر رفتہ رفتہ نرمی پیدا ہوتی گئی۔ لیکچروں کی تعداد اب کی بجائے چھ کے کل پانچ رہی بشرط ایک ایک دن کے وقفہ کی بات نہ رہی اس لئے مدت قیام دو ہفتہ سے گھٹ کر کل ایک ہفتہ کے رہ گئی اور سب سے بڑی بات یہ کہ موضوع خطبات قرآنی بھی میری ہی رائے پر چھوڑ دیا گیا۔ اور میں نے انتخاب کیا "مشکلات القرآن یا قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں" یہ سوچ کر کیا کہ اس کے لئے کوئی مخصوص مشقت نہ کرنا

پڑے گی۔ اپنی تفسیر میں تو ایسی تمام آیتوں پر گزر رہی چکا ہوں انھیں میں سے سو پچاس آیتیں انتخاب کرکے ان کی ترتیب میں ادل بدل کرکے انھیں کو خطبہ کی صورت میں پیش کردوں گا ــــــ مہمان کی بات تسلیم کرلیے جانے کا فن کوئی مدراس والوں سے سیکھ لے۔ مدراس والوں کے بارہ میں پہلے سمجھ رہا تھا کہ عبدالحق مرحوم ہی ذاتی طور پر اس فن کے اُستاد فن تھے۔ اب معلوم ہوا کہ وہ مرحوم منفرد نہ تھے، مدراس ہی میں ان کے ثانی اور بھی متعدد موجود ہیں۔

مسودہ کو گھسیٹ ڈالنے اور پھر اسے خوشخط صاف کرانے میں وقت خاصا لگا۔ ادھر سے تقاضے یہ شروع ہوئے کہ مسودہ جلد سے جلد پہونچ جائے اور اگر ممکن ہو تو انگریزی ترجمہ بھی ساتھ ہی ساتھ جلسہ میں پیش کردیا جائے۔ بہرحال جوں توں وسط جولائی تک خطبے دو قسطوں میں ڈاک سے روانہ کردیے گئے اور خود ۲۵ر جولائی سہ پہر کو مع عزیزی حکیم عبدالقوی منیجر صدق کے لکھنؤ سے مدراس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اب دو چار سال سے لکھنؤ سے مدراس کے لئے ہفتہ میں تین دن ایک سیدھی بوگی لگ جاتی ہے جو کوئی ۴۸ گھنٹوں میں لکھنؤ کے مسافر کو مدراس اسٹیشن پر اتار دیتی ہے۔ یہ بڑی سہولت ہوگئی ہے۔ ورنہ بیشتر کم سے کم ایک بار گاڑی ضرور بدلنا ہوتی تھی۔ اتنا طویل سفر کھل جانے والا اور طبیعت کو اکتا ڈالنے والا بہرحال ہوتا ہی ہے۔ راستہ میں بھوپال،

ناگپور اور بجواڑہ پر صدق نوازوں کا ہجوم ہوتا رہا اور ان کے تحفہ تحائف، ناشتہ اور پھلوں کی ٹوکریاں بھی ـــــ اور قاضی پیٹ جنکشن پر تو حیدرآباد مرحوم کے دو مخلصوں نے کمال ہی کر دیا۔ رات کے ڈھائی بجے جگا کر ملے۔ بجواڑہ اسٹیشن پر اخلاص مجسم حاجی بہار الدین حیدرآبادی کا ساتھ ہو گیا، سفر بھر وہ خدمت کرتے رہے جو کسی مزاج شناس، ٹرینڈ خدمت گار سے بھی شاید نہ بن پڑتی ـــــ گاڑی لیٹ تو کیا، وقت سے کچھ پہلے ہی پہونچ گئی، یہ اپنے تجربہ میں ایک نئی سی بات تھی۔ ہم لوگ شمالی ریلوے کے عادی۔ بھلا گاڑی کا قبل از وقت پہنچنا تو کیا جانیں اب سالہاسال ٹھیک وقت پر بھی کسی گاڑی کا پہونچنا بھول چکے ہیں۔ یہ پہلے بھی سننے میں آیا تھا کہ کلکتہ سے مغلسرائے تک گاڑیاں ٹھیک وقت سے آتی ہیں اور یہیں سے لیٹ ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اور لیٹ بھی منٹوں کی حد تک نہیں گھنٹوں کی؟ چار چار پانچ پانچ گھنٹوں کی! بحمد اللہ وسطی اور جنوبی ہند کی گاڑیاں بھی بڑی ہی تکلیف دہ لعنت سے بڑی پائیں!

میزبان، مہمان نوازی میں عبدالحق ثانی نکلے یعنی بجائے تکلفات کے سارا زور میری حسب استدعا میری راحت پر، راحت و آسایش اور چیز ہے اور تکلفات اور رسمی خاطر داریاں بالکل دوسری۔

گاڑی کا کچھ منٹ قبل از وقت پہونچ جانا اس لحاظ سے اچھا ہی ہوا کہ پیشوائی کے لئے سب لوگ اس وقت تک پہونچ نہ سکے ـــــ ابتدائی خطوں میں یہ بصراحت درخواست کردی گئی تھی کہ استقبال کے وقت ہجوم نہ ہونے پائے اور ایک گوشہ نشین محرر کو ہرگز نہ کسی قومی لیڈر پر قیاس کیا جائے نہ کسی واعظ شیوا بیان پر! دوران قیام میں نہ کسی وعظ کی فرمایش کی جائے نہ امامت نماز کی نہ کسی جلوس کا شایبہ آنے پائے نہ کوئی نعرہ لگے نہ ہار پھول پہنانے کی رسم ادا ہو۔ اور نہ ملاقاتیوں اور زائروں کا بے اندازہ ہجوم ہونے پائے نہ کھانے میں بہت زیادہ تکلفات ہونے دعوتوں اور چائے نوشیوں کا سامان ہونے پائے ـــــ میزبان کا دلی شکریہ کس زبان سے ادا کیا جائے کہ خلوص کے ساتھ خوش فہمی کا ثبوت بھی انھوں نے پورا دیا اور درخواستیں یہ سب منظور کرلیں۔ راحت کا انتظام تو انھوں نے عیش تک پہونچا دیا۔ رہنے کو ایرکنڈیشنڈ کمرہ دیا اور سواری کو ایرکنڈیشنڈ موٹر مجمع کو زیادہ سے زیادہ قابو میں رکھا اور اپنی کسی فرمایش پر مطلق اصرار نہ فرمایا۔

خوش حال میرے اندازہ سے زیادہ نکلے اور خوش اطوار اس سے بھی زیادہ۔ چمڑے کا کاروبار ہے اور ہندوستان کی چرمی اشیاء کے بڑے سے بڑے کاروباریوں میں ان کا شمار ہے۔ روس اور امریکا دونوں

جگہ مال برآمد کرتے رہتے ہیں۔ نام۔ ٹی عبدالواحد کارخانہ کا نام ٹی عبدالواحد اینڈ کمپنی دباّغ اور اکسپورٹر ۱۹ دیری ہائی روڈ پیریامٹ مدراس ۲ اصل سکونت مقام امبور (نواح مدراس) سال ولادت ۱۹۱۰ء بی اے بی ایل کیا پارلمنٹ کے ممبر بھی کانگریس کے ٹکٹ پر کچھ عرصہ ہے۔

مدراس میں یہ دیکھ کر دلی خوشی ہوتی رہی کہ مسلمانوں کی حالت ہماری اپنی ریاست یوپی کی طرح ردی اور گئی گزری ہوئی نہیں، تعداد جو کچھ بھی ہو۔ عزت مرتبہ میں وہ کسی قوم سے بھی کم نہیں۔ یہ احساس کمتری کا شکار نہیں۔ ان میں خودداری ہے خوداعتمادی ہے اور دوسروں سے آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرتے ہیں۔ ترکی ٹوپی اور تہمد باندھنے سے شرماتے نہیں اور بعض بعض تو جناح کیپ بھی علانیہ دیے رہتے ہیں، شاید ایک سڑک بھی جناح روڈ ہے۔ اور ہوٹلوں وغیرہ میں سنا ہے کہ بڑے گوشت کا ذبیحہ بھی کھلم کھلا ملتا ہے۔ مسجدوں کی تعداد بھی خاصی اور نمازیوں کی کثرت ہے اور اپنی خودداری قائم رکھنے کے لئے دوسروں سے لڑنا جھگڑنا ہرگز ضروری نہیں، تہذیب و شائستگی اور صلح و آشتی کے ساتھ اپنی ثقافت کو قائم رکھا جاسکتا ہے، اور ملازمت کے علاوہ تجارت بھی یکساں و مساوی سطح پر قائم رکھی جاسکتی ہے ـــــــ نمونہ کی شخصیت انھیں سیٹھ عبدالواحد

کی ملی۔ ایک پرانے کرم فرما پروفیسر عبدالوہاب بخاری سے ملاقات دیرینہ کی تجدید ہوئی ۔ انھیں تمام خصوصیات کے ساتھ پیش آتے رہے ۔ شہر کی ایک اور قابل ذکر ہستی سابق جج ہائی کورٹ بشیر احمد صاحب سعید کی ہے ۔ بارہ سال قبل ان سے ملاقات ہوئی تھی جب بھی ایک پرجوش قومی کارکن تھے ۔ البتہ اس وقت محسوس ہوا کہ زمانہ کے تجدد کے اثر سے تھوڑے سے "رفارمر" ہو گئے ہیں ۔ ضرورت ان کی رفاقت میں افضل العلما عبدالحق کی سی شخصیت تھی جو ان کو توازن و اعتدال پر قائم رکھتی ۔ اب بھی ایک بڑے زنانہ کالج کو چلا رہے ہیں، جس میں سینکڑوں غیرمسلم لڑکیوں کے ساتھ ایک خاصی بڑی تعداد مسلم طالبات کی بھی ہے ۔ کالج، ہوسٹل سے ملحق ایک جمعہ مسجد بھی ہے جس میں برقع پوش لڑکیاں نماز پڑھتی ہوئی دیکھی گئیں ـــــ مخلوط تعلیم کے ساتھ ایک نیا مسئلہ مخلوط عبادت کا ! ـــــ باہر سے آنے والے مہمانوں اور کرم فرماؤں میں ایک قابل تعارف شخصیت ویلور کے مدرسہ باقیات صالحات کے نگراں سید صبغت اللہ شاہ بختیاری کی ہے ۔ ایک زمانہ میں جماعت اسلامی کے امیر کیا معنی، کہنا چاہیئے کہ امیرالامرا کے درجہ پر تھے اور اب مدت سے طائفہ درویشی کے نقیب ہیں ۔ آدمی زندہ دل، گرم نفس، صاحب ذوق اور چنچل مزاج ہیں ۔ بعین وہی جو امارت کی وردی میں تھی وہی خرقۂ درویشی میں بھی موجود ہے ۔

سفر اگر لمبا ہے تو آرام و آسایش کا اور حیثیتوں سے ہزار انتظام ہو اپنی طوالت کے لحاظ سے بہرحال تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اور پھر ضعف بصارت کا اثر زندگی کی طرح سفر پر بھی پڑنا لازمی ہے اور اب جو چیز سفر میں سب سے بڑھ کر تکلیف دینے لگی ہے وہ خلقت کا ہجوم اور "عقیدت مندوں" کا مجمع ہے! ہر شخص زیارت کرنے اور مصافحہ کرنے پر بلا پڑتا ہے۔ مجھ میں اتنا ظرف تحمل کہاں کہ اس تعب کو برداشت کر سکوں، خلق میں قبول اور مرجعیت تو ایک طرف اللہ کی نعمت ہے اور دوسری طرف نفس کو بھی بڑی لبھانے والی چیز ہے کیا کیجئے کہ بعض طبیعتوں میں اتنا ظرف ہی نہیں ہوتا کہ اس نعمت کو برداشت کر سکیں۔ اللہ سے دعا یہی رہتی ہے کہ ہم ایسے کم ہمتوں، کم ظرفوں، کم حوصلہ والوں کو اس نعمت کے بجائے کسی اور نعمت سے سرفراز کیا جائے ـــــ اور بعض دفعہ تو اس گھیر گھار کے موقع پر بدگمانی پیدا ہوئی، اور بزرگوں سے یہ بے اعتقادی ہو چلی کہ کہیں یہ بیراتے بزرگ بھی کچھ ایسے ہی کورے اور سادے تو نہ تھے۔ محض لوگوں نے انھیں تماشا بنا کر کہاں سے کہاں پہونچا دیا! ہر بہروپیئے کے گرد کیسا میلہ لگ جاتا ہے اور کیسے کیسے عجائب و خوارق اس کے حق میں گڑھ لیے جاتے ہیں۔ اس سفر میں یہ تجربہ تازہ ہوا اور حیدرآباد کے بعض مخلصوں اور کرم فرماؤں کو تو یہ شکایت پیدا ہوئی کہ تم مدراس تک آگئے اور حیدرآباد نسبتاً قریب تھے اس سے کتراتے چلے گئے۔

میزبان کو مجھ سے وعدہ لے چکنے کے بعد پھر خیال آیا کہ ہر روز مجلس کی صدارت کے لیے عالم باعمل اور فاضل یگانہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کو بھی رائے بریلی (مضافات لکھنؤ) سے مدعو کر لیا جائے. ظاہر ہے کہ یہ خیال گو دیر میں آیا لیکن میں تو اسے سنتے ہی پھڑک گیا. تار سے اتفاق کیا کہ واقعی صدر سے مجلس کی عزت افزائی ہو جائے گی. وقت کم تھا، انھوں نے دہلی ہوتے ہوئے ہوائی راستہ اختیار کیا (خاص لکھنؤ سے ہوائی سروس مدراس کے لیے ہے ہی نہیں صرف دہلی اور کلکتہ کے لیے ہے) مولانا کے مستقل رفیق سفر جعفر ایک ندوی میرے ساتھ ہی لکھنؤ سے ٹرین پر ہم سفر رہے ـــــــ ہم لوگ ۴۵ گھنٹے گزار کر ۲۷ جولائی کو عشاء کے وقت مدراس پہنچے اور مولانا دہلی سے ۲۸ کو صبح سوار ہو کر ڈھائی تین گھنٹے میں لکھنؤ سے زائد فاصلہ طے کر کے پہونچ گئے. ان کی اس سرعت سیر پرواز پر حیرت نہ کیجیے. علی میاں کے آجاتے ہی مدراس لکھنؤ ہو گیا اور پردیس وطن بن گیا ـــــ اور میں اس کو میزبان کی خاطر داریوں اور مہمان نوازیوں میں کیوں نہ شمار کروں، انھوں نے میری حیثیت اور بساط سے بڑھ کر جہاں اور سب خاطر داریاں کیں وہیں سب سے بڑی خاطر و مدارت انھیں یہ سوجھی کہ علی میاں کو بھی بلا دیا ـــــ اور علی میاں جو آئے تو اپنے ساتھ ایک دلکش ضمیمہ بھی

لیتے آئے۔یعنی عبداللہ عباس ندوی پھلواروی اوران کی درس گاہ ندوہ کے رشید ترین شاگرد،علم وفضل ہی میں نہیں بلکہ دماغ کے ساتھ دل کے اعتبار سے بھی ان کے پیرو معتقد تو ہے ہی ہیں اس نیازمند کے ساتھ بھی اخلاص ومحبت کی نسبت خصوصی رکھتے ہیں ایک نعمت غیر مترقبہ کہاں مکہ معظمہ کا مرکز رابطہ اسلامی اورکہاں دہلی ومدراس، زمین کی طنابیں کھنچ جانے کا جو محاورہ پرانی کتابوں میں پڑھا ہے وہ ایسے ہی موقعوں کے لیے وضع ہوا ہوگا۔

جلسہ پروگرام کے مطابق ۲۸ر جولائی کو بعد نماز مغرب شروع ہوا اور سوا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے پانچوں دن پابندی سے ہوتا رہا، پہلے دن شہر کے شیخ معمر قاضی حبیب اللہ صاحب جو اپنے ضعف ونقاہت کے باوجود شریک رہے۔ نیو کالج کے وسیع ہال میں مجمع اچھا خاصا رہا۔ موضوع جذباتی اور واعظانہ رنگ کا نہیں، خشک علمی قسم کا تھا پھر بیان زبانی بھی نہ تھا لکھے ہوئے خطبے کو سنانا تھا، اگر ذرا بھی طویل ہوا تو سامعین پر بار ہونے لگتا ہے اس کے باوجود حاضرین اپنے لطف وکرم سے صبر وسکون کے ساتھ سنتے رہے۔ میری آواز یوں ہی خفیف وپست ہے کسی بڑے جلسہ کے لئے بالکل ناموزوں اور پھر یہ وقت رات کا تھا جب میری آنکھیں پڑھنے سے

ہی قاصر ہو جاتی ہیں، اس مشکل کو میرے ایک ہم قافیہ اہل علم مولانا عبدالواحد نے حل کر دیا۔ یہ مضافات مدراس کے ایک بڑے عربی مدرسہ میں صدر معلم ہیں اور مدرسہ رحمانیہ (دہلی) کے فارغ ہیں۔ انھوں نے ماشاء اللہ بڑی بلند آواز اور واضح لب ولہجہ میں اپنا فرض ادا کر دیا۔ درمیان میں جابجا جو آیات قرآنی آجاتی تھیں انھیں وہ باقاعدہ تجوید اسی خوش لحنی سے ادا کر دیتے تھے کہ میرے لیے تو ممکن ہی نہ تھا فجزاہ اللہ خیرا لجزاء پہلے دن ایک مختصر استقبالی مقالہ سیٹھ عبدالواحد صاحب نے سنایا۔ پھر ایک دن مولوی عبداللہ عباس ندوی نے اور کسی دن صدر صاحب نے خطاب فرمایا۔ اور آخری دن تو علی میاں صاحب کی اختتامی تقریر تو ظاہر ہی تھی۔ خطبہ نگار کے لئے یہ سارا سامان بڑا حوصلہ افزا تھا مگر دل اپنی کوتاہیوں اور نارسائیوں کے باعث کٹ کٹ کر رہتا تھا ـــــ اللہ جس چھوٹے کو چاہے مخلوق کی نظر میں بڑا بنا دے اور جس بے کمال و بے ہنر کو چاہے کمال اور ہنرمندی کے لباس میں ملبوس کرکے دکھا دے!

انتخاب میں آیتیں کل ۶۵ آئیں۔ اور وقت اندر جگہ کی گنجائش صرف سورۂ توبہ کے آخر تک ساتھ دے سکی، سورۃ النساء ہی جہاں مصلوبیت مسیح کا ذکر ہے صورت حال کا ایک نیا نظریہ تاریخ وجغرافیہ کی روشنی میں پیش کرنے کی جرأت ہوئی۔

اسے بعض اور آیتوں میں مثلاً وقالت الیہود عزیر ابن اللہ اور لیس البران تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب حاضرین نے خصوصی توجہ والتفات سے سنا تفسیر میں یہ سب بحثیں تو آہی رہی ہیں اور آچکی ہیں خود صدق کے صفحات میں خطبات کی اشاعت کے وقت انشاء اللہ آجائیں گی۔

اندیشہ لگا ہوا تھا کہ اس مرتبہ ضیافتوں اور استقبالیوں کی تعداد بہت بڑھ جائے گی۔ لیکن میزبان کی حکمت و دانائی نے اسے دو چار سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ اور گویا صرف اپنوں ہی کے حلقہ تک محدود رکھا۔ شفیق قدیم عبدالحق مرحوم کی باقیات صالحات جو اب تک مدراس میں موجود ہیں ان کے ہاں حاضری ہوئی اور ان کے صاحبزادے میاں محفوظ الحق سلمہٗ سے گلے مل کر تو آنسو کسی طرح ضبط نہ ہو سکے۔

مسلمانوں کے ادارے ہر بڑے شہر میں ہوتے ہیں۔ تعلیمی بھی ملی بھی، یتیم خانے اور اقامت خانے وغیرہ بھی —— وہ اپنی جگہ اچھے اچھے کام بھی کر رہے ہیں لیکن کیا ضرور ہے کہ میں بھی ہر ادارہ کا جا کر معائنہ کروں اور پھر اس کی کارگزاری یا کارکردگی کی تصدیق کتاب معائنہ میں ضرور لکھ آؤں۔ لیکن یہ مصیبت ہر جگہ پیش آتی رہتی ہے۔ جس شہر میں بھی جائیے وہاں کے قومی اداروں کے کارکن ہجوم ہجوم سے خیر مقدم کریں گے

اس کے بعد اصرار کر کے اور پورا اخلاقی دباؤ ڈال کر اپنے ادارے میں مدعو کریں گے، لیجائیں گے اس کی ایک ایک چیز تفصیل کے ساتھ تھکا دینے کی حد تک دکھائیں گے۔ تقریر کرائیں گے چائے اور ناشتہ بھی پیش کریں گے اس کے بعد ٹیکس سرٹیفکیٹ کی صورت میں وصول کریں گے۔ یہ بہ جبر اپنی تائید میں رائے لکھوا لینے کا فیشن عجیب چل نکلا ہے، بڑے بڑے مہذب و شائستہ لوگ، اس میں کوئی عیب نہیں محسوس کرتے! —— مدراس اس کلیہ سے 'مستثنیٰ' کیوں ہوتا۔ اپنی طبیعت پر ان سب فرمائشوں سے بڑا ہی بار پڑتا ہے۔ لیکن الحمد اللہ کہ یہاں مولانا علی میاں ندوی کی موجودگی نے بڑی سپر کا کام دیا۔ وہ ماشاء اللہ اس میدان کے مرد ہیں، جتنے اداروں کا گشت ان سے چاہے کرا لیجئے اور جتنی تقریریں ان سے چاہے کرا لیجے اور بعض مرتبہ تقریر بڑے کام کی کر جاتے ہیں۔ یہاں کے زنانہ کالج کے سلسلہ میں ایسی ہی صورت پیش آگئی۔ ہم دونوں کو جانا پڑا میں تو بیشتر حصہ سواری ہی میں بیٹھا رہا وہ بیچارے پیدل خوب گھومے پھرے اور آخر میں تقریر کے لیے میں نے انھیں کو آگے کر دیا۔ بے حجاب لڑکیوں اور عورتوں کے مجمع میں بیٹھنا بھی مجھ دقیانوسی کو بار ہو رہا تھا چہ جائیکہ اس مجمع میں کچھ بولنا بہر حال مولانا نے پہلے تو چند فقروں میں عمارت وغیرہ کی داد دی، اور کالج کے خصوصی کارکن کو جنوبی ہند کا سرسید بتایا (یہ لقب پچھلی بار دورۂ مدراس کے وقت

مرحوم کے لئے سن چکا تھا) اور اس کے بعد تقریر اس مفہوم کی کی۔
.... لیکن ان ساری علمی ترقیوں اور اعلیٰ ڈگریوں کے ساتھ یہ سن لیجئے کہ مسلمان عورت کا کام زندگی میں محض اچھی انجنیر، اچھی ڈاکٹر اور اچھی ایڈوکیٹ بن جانا نہیں۔ اس کا کام اچھی بیٹی، اچھی بہن اچھی ماں اور اچھی بیوی بننا ہے۔ اس کی نگاہیں نیچی رہیں اور اس کا لباس شرم وحیا کا ہو۔ وہ اپنے بچوں کی بہترین تربیت دینے والی ہو اور اپنے گھر کی بہترین منتظمہ، ہر جگہ باوقار اور ہر حال میں خوددار رہے، مغربی تہذیب سے مرعوب نہ ہو اور اسلام کی روایات، کی محافظ قدم قدم پر رہے۔
اسی کو انھیں نے بسط وتفصیل سے بیان کیا اور بڑی قیمتی نصیحتیں ان کے کان میں ڈال دیں۔

مدرسہ جمالیہ (عربی) بھی مولانا عبدالوہاب بخاری صاحب اپنے ہمراہ لے گئے۔ وہاں کا سارا پروگرام عربی میں انجام پایا اور عربی میں تقریر بھی علی میاں صاحب کی رہی۔

ملنے والوں میں متعدد صاحبوں کی یاد خاص طور سے محفوظ رہ گئی ایک تو مدرسہ جمالیہ والے مولوی عبدالباری صاحب، ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے رفیق قدیم اسی قدیم لطف وعنایت سے برابر ملتے رہے، دوسرے مدراس

یونیورسٹی کے استاد عربی ڈاکٹر محمد یوسف کو کچی کا تو کہنا ہی کیا وہ تو گویا اپنے ہی تھے۔ انور صاحب، سابق ایم پی کی پارلیمنٹ تقریریں دوچار بار پڑھنے میں آئی تھیں اور ان کی دلیری اور اس لامیت کا قائل ہوچکا تھا بکی ان سے نیاز حاصل رہا اور اچھا رہا۔ موجودہ ایم پی عبدالصمد صاحب سے بھی ملاقات گو مختصر رہی لیکن جتنی رہی اچھی رہی ان کے اخلاص کی روایتیں برابر سننے میں آتیں اور گفتگو سے کچھ ان کی تصدیق بھی ہوتی رہی۔ انگریزی ہفتہ وار اخبار کریسنٹ THE CRESCENT انھیں کی نگرانی میں یہاں سے نکلتا ہے اور اس کے اڈیٹر عبدالرؤف صاحب سے ملاقات۔ ابھی کئی سال بعد ہوئی۔ پہلی ملاقات دہلی میں ہوئی تھی جب یہ ریڈینس RADIANCE کے اڈیٹر تھے۔ کریسنٹ کو اللہ ترقی دے اور نظر بد سے بچائے خاصا ہونہار پرچہ ہے۔ انگریزی صحافت کے ایک اور رکن محمد رضا خاں صاحب سے بھی ملاقات رہی۔ بڑی گرم جوشی سے ملے۔ اب تو شاید بند ہوگیا۔ پہلے یہ انگریزی میں ترجمان نکالتے تھے۔ جنوبی ہند میں مسلمانوں سے وہ بیزاری اور بدگمانی نہیں جو یوپی بہار وغیرہ میں ہے اس لئے یہاں فضا مسلم لیگ کے مخالف نہیں بلکہ ایک حد تک موافق ہی ہے۔ جی میں تھا کہ مشہور معمر ہندو لیڈر راج گوپال اچاریہ سے بھی ملئے۔ لیکن کچھ تو وقت نہ ملا اور کچھ کاہلی نے موقع نہ دیا۔ بہرحال اس کی حسرت ہی رہی ـــــ

—— میزبان کے لڑکے اور داماد، شریک کاردبار کا تجربہ جتنا بھی ہوا خوشگوار ہی رہا۔ باقی ان کے رشتہ کے ایک بھائی حبیب اللہ سے سابقہ زیادہ اور گہرا رہا، بہت خوب شخص نکلے۔ بڑے مسلمان نظر آئے اور میری تحریروں کا تو شاید ایک ایک لفظ پڑھ چکے ہیں۔ کھانا کھلانے اور مہمانوں کی ہر قسم کی خدمت گزاری اور آرام رسانی تو شاید ان کا شیوہ ہی ہے۔ چھوٹی بڑی ہر چیز کی فکر رکھتے اور چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے خدمت خلق کا اجر کماتے تھے۔ واپسی کے بعد جتنی یاد میزبان کی آتی ہے اتنی ہی ان کی بھی آتی ہے —— شیخ شہر قاضی حبیب اللہ صاحب کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ان کا کتب خانہ علی میاں اور عبداللہ عباس ندوی کے ہمراہ جا کر دیکھا کتب خانہ اپنے نوادر اور تعداد کتب دونوں کے لحاظ سے واقعی قابل قدر ہے۔ لیکن بڑی ضرورت ابھی اس کی ترتیب اور سلیقہ مندی کے ساتھ تہذیب کی ہے۔ خود قاضی صاحب اب تبرک رہ گئے ہیں۔ حاضر ہو کر اپنی ذاتی نیازمندیوں کی کچھ تجدید نہ کر سکا۔

شہر میں میرے لیے سب سے زیادہ پُرکشش اپنے ملک العلماء بحرالعلوم لکھنوی کا مزار تھا اور ان کی مسجد۔ تربت پر کھڑے ہو کر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ پردیس میں نہیں اپنے وطن میں ہوں وہی خاندانی موافقت و شفقت جس کی جھلک فرنگی محلی بزرگ میزبان میں ہوتی۔ اور مسجد کی نورانیت

و تقدس کا کیا کہنا! جب اس کے صحن میں مرحوم عبدالحق افضل العلماء کے مرقد کا شفاف کتبہ بھی نظر آرہا ہو! ۱۲ سال قبل وہ مجھے یہاں لائے تھے آج خود ان کی کشش مجھے گھسیٹ کر لائی!

خطبات کا پروگرام (یکم اگست سنیچر) کی شام کو ختم ہوچکا اور واپسی کے ٹکٹ ۲ر (اتوار) کو ۱۰ بجے دن کی گاڑی سے خریدے جا چکے تھے۔ مولانا علی میاں صبح سویرے رخصت ہوکر مضافات مدراس (آمبور، ویلور وغیرہ) اسلامی مرکزوں کے دورہ پر نکل گئے۔ ماشاء اللہ ان مجاہدات کے پورے مرد میدان ہیں۔ اب کل صبح وہ مدراس آئیں گے اور مدراس سے دہلی ہوائی جہاز سے روانہ ہوجائیں گے۔

الحمدللہ کہ رخصت کے وقت اسٹیشن پر مجمع زیادہ نہیں ہونے پایا بس پندرہ بیس مخصوصین ہی رہے۔ گاڑی (لنک ایکسپریس) کوئی ساڑھے دس پر چلی اور پورے احساس کے ساتھ کہ اب زندگی میں بظاہر یہ آخری لمبا سفر ہے آمد کی طرح واپسی کا بھی وہی لمبا سفر اور اکتا دینے والے فاصلے وہی جانے ہوئے اسٹیشن اور انھیں میں سے بعض بجواڑہ، ناگپور پر مثل سابق ملنے والے مخلصین کا ہجوم ملتا رہا اور عالی حوصلہ میزبان نے جو بڑا سا ناشتہ دان اور پھلوں کی ٹوکری ساتھ کردی تھی اس سامان میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا ـــــ ان ملنے والوں اور مخلصوں

کے سب نام اب حافظہ میں کہاں لیکن کرنل بسم اللہ بیگ کو کیسے بھلا دوں
تذکرہ قاریان ہند کے مصنف اور فن تجوید و قرأۃ کے خود بھی یقیناً امام ہوں گے
حسرت اب اس کی ہو رہی ہے کہ ملاقات دو دو بار ہوئی اور خاصی دیر دیر
تک رہی۔ نعمت سے محرومی محض اپنی غفلت و بے خیالی سے ہوگئی۔
دوشنبہ کی دوپہر کو بھوپال سے کئی اسٹیشن قبل مولانا حافظ عمران خاں
ندوی بھی مل گئے اور قبل اس کے باضابطہ ان کا مہمان بنوں اپنے حسب
مذاق و معمول انھوں نے پیشگی ہی میزبانی شروع کر دی، گاڑی بعد عصر
بھوپال پہونچ گئی یہیں قطع سفر کا پروگرام ہونے کے لئے تھا، سامنے استقبالیوں
کا دستہ نظر آیا ان میں سب سے نمایاں یہ دو ہستیاں تھیں ایک تو مولانا کے
صاحبزادے مولانا حبیب ریحان خاں ندوی، ازہری استاد دار العلوم
لیبیا (آجکل چھٹیوں میں وطن آئے ہوئے ہیں) دوسرے صابر علی خاں صاحب
سابق والی ریاست محمد گڑھ صدق کے خصوصی کرم فرما۔ ان سے تعارف
تو سالہا سال سے تھا شخصاً تعارف ابھی پچھلے ہفتہ اسی اسٹیشن بھوپال
پر ہوا تھا۔

گاڑی جب بھوپال پہنچی تو عصر کا دوسوا وقت گزر چکا تھا طے یہ
پایا کہ پہلے سیدھے مزار حضرت شاہ محمد یعقوب پر چلا جائے کہ یہاں حاضری ایک

اہم فرض بھی تھی۔ چنانچہ یہی کیا گیا اور مغرب سے قبل اس سے فراغت ہوگئی۔
——— تربت کی دلکشی کا کیا کہنا! جو سکون و یکسوئی حضرت کی خانقاہ میں
میسر ہوتی تھی اس کا نمونہ یہاں بھی موجود۔ یہ جسم کل بھی حق کی طرف سے زندہ
تھا اور خلق کی طرف سے مردہ وہ آج بھی جسم کے اعتبار سے مردہ اور روح
کے اعتبار سے الحی القیوم سے مربوط و وابستہ ——— وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا
بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ أُولٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ
أَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ۔

قیام حسب دستور "غریب خانہ" پر رہا! جی ہاں "غریب خانہ" پر! کرم
فرماؤں کی ایک تعداد سے رات ہی کے ابتدائی گھنٹوں میں نپٹ لیا گیا
سفر کے تکان کے خیال سے لوگوں نے جلد ہی فارغ کر دیا۔ کھانے اور عشاء کی
جماعت سے پڑوس کی مسجد شکور خاں سے جلدی فراغت حاصل ہوگئی ———
میزبانی کا فرض ادا کرنے میں اصل میزبان سے کہیں آگے بڑھے ہوئے ان
کے صاحبزادے رہے۔ وہی "نشان منزل" والے حبیب ریحان خاں برسوں
عرب ملکوں میں رہ کر اور کچھ سیکھا ہو یا نہ ہو عرب میزبانی کا حوصلہ اور سلیقہ
تو ضرور سیکھ آئے ہیں۔ اور میرے حق میں تو ان کا رابطۂ قلب و اخلاص
شاعروں کو مات دیے ہوئے ہے ——— سعدی کے مشہور مصرعہ۔

اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند

ہیں تو پھر قید "اگر پدر نہ تواند" کی لگی ہوئی ہے۔ یہاں پسر اس قید شرط سے بے نیاز ہر طرح پدر سے بازی لے جانے کی دھن میں لگا ہوا۔ میزبان کے بھتیجے منصور نعمانی ہر خدمت میں پیش پیش۔

دن میں بھی...... صبح سے لے کر رات گئے تک لوگ آتے جاتے رہے لیکن بحمداللہ سکون میں کوئی خلل نہ پڑا، اور خود بھی دو تین جگہ جانا ہوا سب سے پہلے بڑھ کر حضرت کی خانقاہ میں صاحبزادے محمد سعید صاحب اور دوسرے بھائی مہمان کی پذیرائی، دلجوئی اور عزت افزائی اپنے والد محترم کے قدم بہ قدم پھر سیفیہ کالج کے استاد اور عبدالقوی دسنوی کے جو مولانا سید سلیمان ندوی کے عزیز ہونے سے خود اپنے عزیز معلوم ہوتے ہیں۔ اور اردو کے معروف خدمت گزار حمیدیہ کالج کے استاد اردو ابو محمد سحر اور تخلص بھوپالی اور روزنامہ الحمرا کے ایڈیٹر سید محمود الحسینی ان سب سے خوشگوار ملاقاتیں رہیں۔ نواب صاحب محمد گڑھ کا لطف خاص رہا، اور سب سے بڑھ کر قاضی وجدی جو علم و دین شعر و ادب سب کے جامع نکلے[1] ایک بڑی قدیم مخلصہ صدق بلکہ سچ مرحوم کی قدرداں اہتمام بیگم شاہجہاں پوری

---

[1] اردو کے استاد ڈاکٹر گیان چند سے ملنے کی حسرت پچھلی بار کی طرح اس بار بھی دل میں رہ گئی۔